

ہیرے کا جگر

غنڈہ گردی، پولیس اور سُراغ رسانی کی سچی روئیداد
(میں مرجاؤں گا تو ایک اور جید امیری جگہ لے لیگا)

عنایت اللہ

پیش لفظ

۶ اپریل ۱۹۸۱ء کی صبح لاہور میں بینک ڈکیتی اور قتل کے ایک مشہور مجرم غیاث کو پھانسی دی گئی اور اسی روز لاہور کی اعظم کلاکتھ مارکیٹ میں یوناٹیل بینک کی برانچ میں ڈکیتی کی واردات ہوئی جس میں بینک کا چوکیدار قتل ہو گیا۔ ان دونوں میں مجرم و سنز کا فلسفہ پوشیدہ ہے جس میں نے اس ناول میں اسی فلسفے کو واقعات اور میں دور دنیا کے کرداروں کی صورت میں اس اسید پر پیش کیا ہے۔ شاید کہ اتر جاتے ترے دل میں سہری بات! غیاث کی زندگی کے آخری روز بہت سے اخباری نمائندے اُسے ملنے گئے تھے۔ اُس نے سب کو بتایا کہ وہ کون سے عناصر تھے جنہوں نے اُسے سول ٹیپری سے پشاکر اتنا خطرناک مجرم بنایا تھا کہ پولیس اور قانون کا نظام بل گیا تھا۔ وہ تو سکول میں استاد تھا۔ اُس کے ساتھی بتاتے ہیں کہ اُس میں مجرمانہ رجحان کا نشاۃ تک نہ تھا مگر مدہ سے کا استاد مجرموں کا استاد بن گیا۔

مجرم و سنز کا دوسرا پہلا حلقہ فرمایا ہے۔ جس روز بینک ڈکیتی اور قتل کا ایک مجرم پھانسی چڑھا، اُسی روز بینک ڈکیتی اور قتل کی ایک اور واردات ہو گئی۔

میں سے اس ناول کا مرکزی کردار، جیلا آخر میں کہتا ہے۔ ”میں جا رہا ہوں کل ایک اور جیلا میری جگہ لے لے گا“

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا سزا جہان میں کمی کر سکتی ہے؟
ہن الاوامی شہرت یافتہ ماہرین نفسیات اس سوال کا جواب بھی نہیں دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے تجزیوں، تجزیوں و مشاہدوں کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ سزا یعنی سزا سے قید مجرم پیدا کرتی ہے اور جیل خارجہ جرائم پیشہ دنیا کا صدر دروازہ ہے۔

۱۹۵۶ء میں ایک غیر ملکی اخبار نے لکھا تھا کہ پاکستان کا دار الحکومت کراچی میں الاوامی سیکڑوں اور جرائم پیشہ کراہوں کا مرکز بن گیا ہے۔ اس اخبار کے حوالے سے یہ خبر پاکستان کے اخباروں میں بھی شائع ہوئی تھی۔ یہ خبر غلط نہیں تھی۔

سیاسی لیڈر عرصی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ اس جنگ میں پیشہ و کار کے غنڈوں کا استعمال کھلم کھلا ہو رہا تھا۔ برسرِ اقتدار پارٹی غنڈوں کے علاوہ پولیس کو بھی مخالفین کی سرکوبی کے لیے استعمال کرتی تھی۔ اس صورت حال میں غنڈہ گردی اور بد معاشری با عزت پیشہ بن گیا کسی کے متعلق پتہ چلنا کہ سرکاری غنڈہ ہے تو لوگ اُس سے ڈرتے اور اُس کی عزت کرتے تھے۔

اب غنڈہ گردی ہماری سیاست کا باقاعدہ حصہ بن گئی ہے۔

ہیں علی مطالعہ تو خاصا تھا، عملی مطالعہ کے لیے میں نے کراچی کی جرائم پیشہ دنیا کو بہت قریب دیکھا۔ اتنی قریب کہ میں

SOCIOLOGY اور PSYCHOLOGY ۶ CRIMINOLOGY میرے محبوب موضوعات

اس خوفناک اور پراسرار مخلوق کے دلوں کی دھڑکنیں سن سکتا تھا اور ان کی سانسوں کی تپش کو محسوس کر سکتا تھا میں نے جس کبھی نہیں دیکھا تھا میں جرم پیشہ گوئیوں میں جن کے ہر گز حریف میں جس بھری ہوئی تھی اس قدر کھل بل گیا تھا کہ ان کی سانسوں سے مجھ پر جس کا نشہ طاری ہو جاتا تھا۔

میں خاموش و تماشا کی نہیں محقق تھا میں جرم و جاسوسی کی سنسنی خیز کہانیوں کی تلاش میں نہیں تھا میں ان قانون شکنوں کے سینوں میں جھانک رہا تھا۔ ان سینوں میں مجھے وہ نظر آ گیا جس کی مجھے تلاش تھی میں ان سوالوں کے جواب ڈھونڈ رہا تھا:

انسان جرائم پیشہ کیوں بنتا ہے؟

کیا صرف سزا کسی عادی مجرم کو شرمناک شہری بنا سکتی ہے؟

پلیس اور جرائم پیشہ گوئیوں دوستانہ مراکز کیوں؟

کتابیں مجھے ان سوالوں کے جواب دے چکی تھیں لیکن زمین دوز دنیا کی علمی اور حقیقی زندگی کو دیکھنا ضروری تھا کہ کتابیں کہاں تک سچ بولتی ہیں۔

میں ان سوالوں کے جواب اپنی دو کتابوں "اٹل تپتی ہیں" اور "دھنکارے ہوئے انسان" میں اور بے شمار مضامین میں جو مختلف جرائد میں چھپتے رہے ہیں، مشابہات، دلائل اور طویل نصیحت کی روشنی میں پیش کر چکا ہوں۔ اس مضمون پر تیسری کتاب "میرے کا جگر" ناول ہے جو تین برسوں کی کاوش سے مکمل ہوا تھا۔

اس ناول کا مرکزی کردار "چندیا" مجھے اسی عرصے میں زمین دوز دنیا میں ملا تھا۔ وہ عربی اور انگریزی بول سکتا تھا اور ڈائری بھی لکھتا تھا لیکن وہ جب کبھی اس قسم کا جیب کمر نہیں، وہ جرائم پیشہ مخلوق کا پیر و مرشد تھا بلکہ یوں سمجھیں کہ وہ زمین دوز دنیا کے شاہی خاندان کا فرد تھا۔

نظارہ زمانہ قابل التفین لگتا ہے کہ ایک جرائم پیشہ آدمی اپنی ڈائری لکھتا تھا لیکن میں نے مجرموں کی دنیا میں دو حافظ

قرآن بھی دیکھے ہیں۔

چند میسرے لیے کا بیڈ ٹاٹ اور اُستادوں نے مجھے اپنی پراسرار زندگی کے مختلف شعبے دکھائے میں نے عصمت فروش بھی دیکھے، ایمان فروش بھی جنہیں کاٹنے والوں سے بھی لمبی ملاقاتیں ہوئیں اور گروہوں کاٹنے والے رہزموں سے بھی۔ رشوت خوری کے جرم میں سزا بھگتے والے تھانیداروں سے بھی گپ شپ رہی اور عدلیہ سیاسی پارٹیوں کے جلسوں میں ہنگامے بپا کرنے والے پیشہ ور غنڈوں اور بد معاشرلوں سے بھی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ ان سب سے مل کر میرے لیے ایک ناول کا پلاٹ مکمل کر دیا۔ اس کے واقعات اور کردار میری نگاہ میں تیز کی گئی کہ دار کو کہانی میں بچھی پیدا کرنے کے لیے گھسیٹ کر لایا ہوں۔ یہ ہمارے معاشرے کی کہانی ہے تمام کردار معاشرے کی پیداوار ہیں۔

اس ناول میں آپ کو وہ عوامل اور حرکات دکھائے جارہے ہیں جو اچھے بھلے بچوں میں مجرمانہ رجحانات پیدا کر دیتے ہیں بچہ پیدا ہوتا ہے تو جنسیت کے پانی کی مانند پاک ہوتا ہے۔ اس کے ذہن کو پراگندگی گھر، مدرسے معاشرے اور ماحول سے ملتی ہے گھر کی گھٹن، پیارا دشمنیت سے محرومی اور جذباتی تشنگی گڑبگڑ، اٹھائی تیر و کجیت، قاتل، رہزن اور برہہ فروش پیدا کرتی ہے۔

ناول کا عنوان "میرے کا جگر" اس لیے رکھا ہے کہ میرا بڑی سخت چیز ہوتی ہے جگر، علامہ اقبال کے الفاظ

میں۔ پھول کی تپتی سے کھٹ کھٹا ہے میرے کا جگر!
کبھی کا دل میرے کی طرح سخت ہو جائے تو اُسے محبت اور پیار کے پھول کی صرف ایک پتی سے کاٹا جاسکتا ہے۔

میں نے بات ۱۹۵۶ء کی کی ہے لیکن ۱۹۸۱ء تک زمیں دوز دنیا کی آبادی بڑھی ہے کم نہیں ہوئی۔ کیوں؟
— جواب اس ناول میں موجود ہے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ حکایت لاہور

کی بیگم پر رات دامن میں ہزاروں اسرار چھپاتے سیلٹی باولوں کے ساتھ اڑی جا رہی تھی۔
کراچی رُت بہا رہی تھی۔ رومان انجیز، قیامت خیز، سہمی، علیل سی رُت۔

سینپل کارپوریشن کی عالیشان عمارت کے کھڑا ل نے رات کی تنوں میں منہ نہ اڑا لاش پیدا کر دیا۔
 اڑھائی بج رہے تھے۔ رات کی آغوش میں سحر بھلنے لگی تھی۔ جید حبیب بڑا جاگ رہا تھا۔ وہ ابھی پاؤں کے
 چکر اور ہاتھوں کی صفائی سے فارغ ہو کر اپنی زمیں دوڑ رہی تھا۔ واپس آیا تھا۔ اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر چرس بھرے
 سگریٹ کے دو تین لمبے لمبے کش لگا کر اپنے کمرے میں گیا، دیا سلائی چلائی اور میز پر رکھی ہوئی لائٹن کو روشن
 کیا۔ زرد پٹی روشنی میں چھت کے ساتھ لٹکتے جالوں سے کمرے کی وحشت نکھر آئی۔ اس نے کرسی گھسیٹ کر میز
 کے قریب کی، دراز میں سے ایک کاپی نکالی اور اسے غور سے دیکھا۔

اُس نے فراسی دیروقت گردائی کی پھر سینپل ہاتھ میں لے کر چند سینکڑے غلاؤں میں گھوڑا اور لکھنا شروع کیا۔
 ۳۰ مارچ ۱۹۵۶ء۔ میری پیٹرنری پولیس، قانون اور سوسائٹی کے لیے کھلا چیلنج ہے۔ سوسائٹی
 مجھے تھکایاں لگا لے، یہ داری قبضے میں لے لے اور میرے خلاف دلچسپی، سرفراہ، جیب تراشی
 قتل، اغوا اور بدہ فروشی کے مقدمات چلائے۔ یہ تمام مقدمات خارج ہو جائیں گے۔ کیوں؟
 اس کیوں کا جواب داری میں موجود ہے۔ قانون اس کلمی شہادت کو دیکھ کر سر جھکا لے گا اور مجھے
 جیل میں بند کر سکے گا۔

کل رات ایک سیٹھ کو قتل کیا ہے۔ موت کے خوف سے لوگ کیا کچھ نہیں بنا دیتے
 میں نے خبر اُس کے پیٹ پر رکھ کر پوچھا۔ "اپنی دولت کہاں سے لائے ہو؟" اُس نے
 کہا تمہا جین کے لیے کوڑا تعمیر کرنے کا ٹھیکہ ملا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کوڑا کہاں ہیں؟"
 کہنے لگا۔ "سکیم ابھی میرے دماغ میں ہے۔ پیسے وصول کر لیے ہیں۔" دولت تجوری میں
 کوڑا ڈر دماغ میں۔ مہاجرین ٹٹی کی جھونپڑیوں میں اور جھونپڑیاں بارش کے ٹھٹھے گھٹنے پانی میں کس
 قدر بھلا نہ نظر تھا۔ خون کے قطرے سبز قالین میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ اُس کی گول
 میں سے خون نکلتا جا رہا تھا اور یہ خون جیسے میری گول میں داخل ہو رہا تھا۔

مجھے انسانوں کے ساتھ ہمدردی نہیں در نہ یہ دولت مہاجرین میں تقسیم کر دینا میں خود اپنی
 دنیا سے نکالا ہوا اور اپنے آپ سے بھاگا ہوا پناہ گزین ہوں۔ مجھے کہیں بھی پناہ نہیں ملی۔ میں
 کسی کو پناہ نہیں دوں گا۔

چیلے سحر پر نظر ثانی کیے بغیر کاپی دراز میں بند کر دی۔ انگڑائی کے ساتھ جمائی لیتے ہوئے نیچے والے
 دراز سے بول نکال کر ایک نظر دیکھا۔ ادھی و سبکی باقی تھی۔ اُس نے بول منہ سے لگالی چندھونٹ پٹے اور
 اٹھ کر فرش پر پیچھے لیٹ رہی سو گیا۔ گہری، اطمینان کی نیند!

اُس کی آنکھ کھلی تو دوسری رات کا اندھیلہ لہر ہوا تھا۔

دیا تھا شمالی پاکستان سے انوکھی ہوتی لڑکیاں کراچی میں اس کے ہاتھوں پہنچتی تھیں اور وہ انہیں آگے جلا دیتا تھا۔ اُس کے پاس دو بلیک میل بھی تھے جن کی زد سے کوئی محفوظ نہیں تھا۔ اسی پینے کو ذرا سا فروغ دے کر اس نے چار نوٹ لڑکیاں اپنے پاس رکھ کر دھندے پر لگا دی تھیں۔

لبستہ رستے گھر سے پندرہ سولہ برس کی لڑکی کو انوکھ کرنا اور اسے بازار جن کی تربیت بنانا دینا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن جیڈا کے پاس کچھ ایسے بے ضرر طریقے تھے کہ وہ شریعت گھڑالوں کی دو شیرازوں کو زیادہ سے زیادہ تین ماہ کے عرصے میں نیپے روٹ کے کسی کو کھٹے پہ بٹھا دیتا تھا۔ اگر کوئی لڑکی جیڈا کی راہ پر نہ آئے تو اُس کے پاس دو اور بے ضرر طریقے تھے۔ خنجر اور پستول!

ان چاروں لڑکیوں کے لیے ان دونوں چیزوں کو استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کے دونوں بلیک میل ایسی لڑکیوں کو راہ پر لانے کے بہت سے گھر جانتے تھے اور انہیں ہمارا کر لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جیڈا کی شخصیت میں کچھ ایسا سحر اور جلال تھا جس کے سامنے چاروں لڑکیوں کی تندہی اور تیزی پینے ہی روز ختم ہو جاتی تھی۔ وہ چاروں اس کے ہاتھ کیے بعد گریسے چھچھ سات سات ماہ کے وقفے سے آتی تھیں پہلے روز تو ان میں سے ہر ایک مرنے مارنے پر تلی ہوئی تھی۔ ”ذبح کر دو... گولی سے مار دو... جھک جھک نہیں چلی گی۔“ چند دنوں کے بعد ہی ان کا یہ حال تھا جیسے انہیں اس شخص کے ساتھ محبت ہو گئی ہو۔ اس لیے نہیں کہ جیڈا بخور و نوجوان تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی راہ گم کر دینے کی شخصیت میں کچھ ایسا اثر تھا، ایسا سحر لڑکیاں بے بس ہوجاتی تھیں۔ بالی ان سب سے زیادہ اکلڑی تھی۔ اسے جیڈا کا ایک بلیک میل راہ لپٹا دینے سے لیا تھا جو ایک کچھتی کو بلیک میل کرنے والے کیا تھا۔ بالی دسویں جماعت میں پڑھتی تھی اور چوری چھپے سینا جاتی تھی۔ اس بلیک میل کی نظر بالی پر پڑی تو اس نے اُسے ”دامِ محبت“ میں اُگایا تھا اور وہ اسے کراچی لے آیا۔

بالی کراچی میں پہنچی تو اس کا محبوب کراچی کی اندھی گلیوں میں گم ہو گیا۔ اس کی جگہ ماہرینِ فنی نے لے لی جنہوں نے بالی کو میسوا کی راہ پر گزرنے کے سبب عین کیے لیکن وہ اس راہ پر نہ جاتی جیڈا کو طم جھوٹا تو اس نے اس کے جسم کو ہاتھ لگاتے بغیر بالوں ہی باتوں میں اسے یوں رام کر لیا کہ لڑکی محسوس ہی نہ کر سکی کہ اس نے اپنے جسم کو مہرارت چھپا شروع کر دیا ہے۔

بالی نے کئی بار جیڈا سے رو رو کر کہا۔ ”میں نے تو اپنے آپ کو تمہارے لیے بیچ دیا ہے کبھی تو کہہ دو، بالی! میں تجھے چاہتا ہوں۔ آج، میرے قریب آ جاؤ۔“

جیڈا نے اس کا دل کھ لیا لیکن ذرا دور رہ کر۔ وہ محبت کرنا نہیں جانتا تھا۔ اُس کی دنیا میں محبت ایک بے معنی لفظ تھا۔ اس کا کردار نفرت، رشتہ اور اذیت سے عبارت تھا۔ وہ ڈاکو تھا، دولت لوٹتا تھا لیکن اسے دولت سے بھی محبت نہ تھی جیب کاٹی یا چوری کی اور مال اپنی نظروں سے بھی اوجھل کر دیا جیسے کسی نے کسی سے کوئی چیز چھین کر پھینک دی ہو۔

اس کی عمر تیس برس تھی چھ برس کے بچہ قارت اور بربریت کا نام تھا انھوں میں ایک تلاش اور تجسس۔ بچوں تلے ایک چمک تھی جی میں ایک عذوب جاذبیت تھی اور اس جاذبیت میں تشنگی کے آثار بھی ملتے تھے خدوخال کا عجیب و غریب تاثر اور اس اداس تھا۔ ذرا قریب سے دیکھو تو ادا سبوں کے اس گھٹنے سے انہیں عضویت کا بھی شک ہو جاتا تھا اور چہرے کی ان کیفیتوں نے اسے ایسا روپ دیا تھا کہ دیکھنے والے اسے عام سادہ سی بچہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ عمر نوزوں کے لیے اس میں کوئی اور کبھی شش تھی۔

جیڈا کے پاؤں کا چکر زمین و آسمان کی گردش سے کہیں زیادہ تیز تھا۔ دوپٹے اُچھرتے چاند تاروں نے بے شمار راتیں گزار دیں جن کے اندھیرے اجالوں کی ہولناکیاں اور اسرار، جیڈا کی فیشل، جیڈا کی دائری میں محفوظ کرتی گئی۔

ایک اور رات گزر رہی تھی کئی ستارے ٹوٹ چکے تھے، کئی ٹوٹ رہے تھے چاند فلک بوس علاقوں کے عقب میں اونگھ رہا تھا۔ کراچی شہر دم بھر کے لیے سو گیا تھا۔

خجیداجاگ رہا تھا دائری اور وہ کسی کی نوبل اس کے سامنے کھلی پڑی تھی جس کا دھواں عمر کے کی ویرانی میں پھینک رہا تھا اور جیڈا لائیں اور اپنے درمیان پھیلے ہوئے خلا میں گم تھا۔ اس نے فیشل اٹھائی کچھ سوچا پیشانی کے شکن گھرے ہو گئے اور اس نے فیشل پر پرکھ دی۔ دائری کھول کر غیر ارادی طور پر ورق اٹھنے لگا۔

وہ کسی صفحے پر ٹوک جاتا، ذرا سا پڑھتا اور ورق الٹ کر کسی اور صفحے پر ٹوک جاتا۔ اس کی نگاہوں میں ایسا ناثر تھا جیسے کوئی انسان کسی آسیب زدہ ویران گھر میں جھانک رہا ہو۔

آلتا ہوتی سی جمانی لے کر جیڈا کھٹکھٹا ہوا بچہ جیسے اُسے کچھ یاد آگیا ہو۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ دائری بند کر کے دراز میں رکھ دی اور کچھ سوچنے لگا۔ اس نے آنکھوں کو یوں سیٹھڑا جیسے گزرنے ہوئے ماہ و سال میں بہت دور جھانک رہا ہو اور گزری ہوئی عمر کے رنگزار میں بھرے ہوئے لمحات چن رہا ہو۔

وہ پانچ دفعہ جیل ہوا تھا۔ تین دفعہ پاکستان سے پہلے ہندوستان میں اور دو بار پاکستان میں بھی کبھی چھ ماہ کے لیے کبھی ایک سال کے لیے اور آخری بار اسے نو سال قید کی سزا ملی تھی مگر اپیل میں بری ہو گیا تھا۔ دیکھنے کا یہ گین ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ اس سے پہلے اُسے سزائے موت بھی مل چکی تھی لیکن وہ اپنی ٹوٹا میں ختم ہو گئی تھی۔ اُسے شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا گیا تھا اور دو سالوں کا خون کراچی کی زم آلود فضا میں گم ہو گیا تھا۔

جیڈا کراچی کی جرائم پیشہ مخلوق کا نامی گرامی استاد تھا۔ گذشتہ تیس برس سے وہ قانون، جھکڑیوں اور انسانوں کے خون سے کھیل رہا تھا۔ پاکستان بنتے ہی وہ مہربی سے کراچی آگیا تھا اور اس نے یہاں اُدھ قائم کر لیا تھا۔ وہ تین ہی سال میں اُس نے یہاں کے چار پانچ جیب تراش اور قتل شکن خرید لیے اور س بارہ نوعمر لڑکے مختلف جرائم کے لیے تیار کر لیے تھے۔

کراچی کی آبادی نہایت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چوراکھوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا، مگر ان کی سرگرمیاں غیر منظم تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو بھی اکثر دھوکا دینے دیتے رہتے تھے۔ یہ جیڈا تھا جس نے چار پانچ ماسٹر غلطیوں کو جمع کر کے کراچی کو حصوں میں تقسیم کیا اور جرائم پیشہ لوگوں کے لیے قواعد و ضوابط بنا دیے اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ وہ ایک دوسرے کا پورا پورا احترام کرنے لگے، پھر ان کے گرد بھپکتی ہوئی کراچی میں خوف و ہراس بن کے پھیلنے لگے اور کراچی مہربی بن گیا۔

جیڈا حرم میں ماہر تھا لیکن جیب تراشی میں اس کا جواب نہیں تھا۔ بڑے بڑے استاد اُس سے ہاتھ کی صفائی سیکھتے آتے تھے کراچی آنے کے تین سال بعد اس کے گرد وہیں گم ویش چالیں اُڑاتے اور جیڈا ان کا پیر استاد تھا۔ اس کے گرد وہیں گیارہ سال کے بچے سے لے کر پچاس برس کے بوڑھے تک شامل تھے۔ وہ ہر فن مولا تھا لیکن ”جیب کمر“ اُس کا تخصص بن گیا تھا۔

سارے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کے جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ اس کا کاروبار چلتا تھا۔ ان کے ساتھ اُس نے معاہدے طے کر رکھے تھے کچھ عرصے سے اس نے لڑکیوں کی خرید و فروخت کا پیشہ بھی شروع کر

تھوڑی دیر بعد آٹھ سال کی بچی رو رو کر اپنے سامنے پڑے ہوئے ٹافیل کے ڈھیر کو غصے سے سارے کمرے میں بکھری جتنی نہیں لوں گی ٹافیاں۔ مجھے اتنی جان کے پاس لے چلو۔ اس نے سارے کھلونے پاؤں کی ٹھوکروں سے توڑ دیئے اور بچکیاں لے لے کر روتی رہی۔

”بادل! جیدانے غیر معمولی نرم مزاجی سے کہا۔ ”تم اپنے کمرے میں چلے جاؤ میں سنبھال لوں گا۔“
”اچھا سنو سنی!“ جیدانے اسے گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”پہلے چپ ہو جاؤ پھر اُڑی کے پاس لے چلوں گا۔“

بچی چپ ہو گئی۔

”دیکھو سنی! اب رات بہت گزر گئی ہے۔“ جیدانے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پدارت سے کہا۔
”ابھی سے میں گاڑی نہیں جلتی میرے پاس سوجاؤ صبح سویرے تمہیں اتنی کے پاس لے چلوں گا۔“
بچی کو اغوا کر کے والوں نے نہ جانے کتنی بار یہ وعدے دے کر اسے بہلایا تھا۔ جیدانے کوئی نئی بات تو نہیں کر رہا تھا۔

”نہیں! بچی نے بچکی لے کر کہا۔ ”تم جھوٹ بولتے ہو۔ وہ پہلے والے آدمی بھی ایسے ہی کہتے تھے۔“
جیدانے بیسنگی سے اپنا گال بچی کے گال کے ساتھ لگا دیا اور آہ کے گال کا بوسہ لے کر کہا۔ ”میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا سنی! میں نے...“

وہ چپ ہو گیا جانے وہ کیا کہنے لگا تھا کہ دل اچھل کر اس کے حلق میں آن آسکا۔ جیدانے زندگیاں میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے پیار کیا تھا۔ ایک روتی جیسے ماتم گال کے گلاز کو محسوس کیا تھا۔ اس کی روح نے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
نہ جانے کس نے اس کے اپنے ہی سینے میں اُٹھ کر اس کی جراثیم زندہ آنکھوں میں دو آنسو بھر دیئے۔
بچی کو اغوا کرنے والوں نے کتنی بار کہا تھا اور پدارت سے کہا تھا کہ وہ اسے اتنی کے پاس لے چلیں گے لیکن بچی کے گالوں کو دو ہونٹوں نے کبھی نہیں چھوا تھا اور نہ ہی اس کے رونے پر کسی کی آنکھ میں کبھی آنسو آیا تھا۔ جیدانے بھی محسوس ہی نہیں کر سکا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں لیکن بچی نے یہ آنسو دیکھ لیے تھے۔

اس کے گال جیدانے پدارت کو بھی نہک محسوس کر رہے تھے۔ ایک منہ بھرا اُسے اغوا کیا گیا تھا اور اس طویل مدت میں یہ پہلا بوسہ تھا جس سے اُسے تسکین ہوتی تھی۔ وہ چپ ہو گئی۔
”تم میرے اچھے ماموں ہو۔“ بچی نے دونوں بائیں جیدانے کے گلے میں ڈال دیں اور خدارا اس کے گلے والوں سے رگڑنے لگی تھی۔

جیدانے سینے میں ہاتھیں بیاہتی۔ بند ٹوکے آنے والے سیلاب کی طرح اندر سے ہوتے جذبات نے اس کی پسلیاں بھی ہلا ڈالیں۔ اس پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ وہ ہضم ہو سکی بچی کے سامنے بس ہو گیا تھا۔ وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔
نہی کچھ سوچ سکا۔ اسے یوں معلوم ہوا تھا جیسے کسی نے اسے دو ٹوکے کر دیا ہو اور اس کی ساری قوتیں قفل اور مار دھار کے تمام حربے۔ رہنمائی اور جب تراشی کے سارے داؤ بچ کا بیج کی چوڑیوں کی طرح چلن چور ہو کر پھرتے ہوں۔
بچکی کی لپک کی طرح اس کے دل میں یہ خیال بھی گونگن کر رہی کہ بچکی کو بچھڑا کر دے لیکن یہ خیال آیا اور گزر گیا۔

”ماموں! نیند آ رہی ہے۔“ بچی نے جیدانے کو جھنجھوڑ دیا۔

چند لمبے بعد بچی فرش پر پچھے ہوئے بستر پر جیدانے کے ساتھ لگ کر سو رہی تھی لیکن جیدانے جاگ رہا تھا۔ اس کا نام

انگ جاگ رہا تھا۔ اس کے وجود میں ایک بچہ۔ ”اتی! اتی!“ پکار رہا تھا۔
وہ چپ لیٹا ہوا تھا اور اس کی نظریں اندھیرے چھت پر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ اسے کچھ یاد آیا چاہتا تھا بہت ہی پرانا، صدیوں پرانا زمانہ۔

یادوں کی لڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اُس نے خیالوں کی تاریکی سے اُٹھ جاکے کو ہاتھ پاؤں مارے مگر دھنلی سی کچھ باتیں اس کے گرد تکیوں کی طرح اُڑتی پھری تھیں کسی ایک کو بھی پکڑ نہ سکا۔ اسے کچھ یاد آیا چاہتا تھا جسے وہ یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ یاد کرنا چاہتا تھا جو اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

بچی کے سوتے ہوئے جسم کے گلاز میں وہ بھولے لباس سے خیالوں سے آنکھ بھولی کھینچ رہا۔ وہ رات بھر اذیت ناک بے چینی اور تنگی سے دوچار رہا لیکن اس تنگی میں اس نے ایک گونہ لذت بھی محسوس کی اور ایسے ہی تیغ و شیریں خیالوں کے زیرِ پریم میں رات گزر گئی۔

دوسری صبح پاکستان ایئرپورٹ میں جیدانے کو ایسے سندھ کے ریگستانوں کا سینہ چرچتی، گوجر والوں کی طرف بھاگتا جا رہی تھی۔ جیدانے اپنے ساتھیوں کو کچھ بتائے بغیر جا رہا تھا۔
رات کے دس بج رہے تھے جب جیدانے بچی کو انگلی پکڑواتے ہوئے گوجر والوں کی طرح سے نکل رہا تھا بچی نے اسے بتایا تھا کہ بسوں کے اڈے سے وہ گھر کا راستہ جانتی ہے۔ جیدانے پاکستان کے کون سے اڈے کو نہیں جانتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اُن بچی کے قریب تانگے سے اترے تو بچی نے کہا۔ ”ماموں! اس طرف!“
دس منٹ کا راستہ طے کر کے جب وہ ایک گلی کا موڑ طر رہے تھے تو بچی نے بیچ کر کہا۔ ”وہ رہا ہمارا گھر!“
جیدانے کہا۔ ”اس بچی سے کہا۔“ ”تمہاری اتم جاؤ۔ میں یہیں سے لوٹ جاتا ہوں۔“
بچی چلنے لگی۔ ”ماموں! تم بھی چلو۔“ مگر جیدانے اسے اکیلے ہی بھیج دیا۔
بچی کے گھر کے سامنے علی کالبر روشن تھا۔ وہ تیز قدم چلتی اور فرم کر دیکھتی اپنے دروازے پر جانے بچنے تک دسے کر چلائی۔ ”اتی جان! اتو جان!“

جیدانے گلی کی نوک میں چھپ چکا تھا اور آنکھ پکڑ کر دیکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلا۔ مال نے خوشی اور جرات سے چہینے ہوئے بچی کو سینے سے لگا لیا اور وہ دیوانوں کی طرح چلائی۔ ”پوہن! اگتی، پوہن! اگتی۔“
جیدانے ایک جواں مرد کو بھاگ کر باہر آتے دیکھا۔ پھر اس نے محلے کے کسی اور دروازے کھلنے کی آوازیں سنیں۔ پھر ایک بچہ اور ایک شور۔ ”مبارک ہو... اری! انوکھاں تھی؟“
اس شور و غل میں سننے بھی نہ سکی تو اتنی آواز ابھری۔ ”ایک ماموں مجھے بڑی دوسے لائے ہیں بچی نے اشارہ کیا۔“ وہ دھڑ سے واپس چلے گئے ہیں۔

جیدانے کئی چہرے اپنی طرف گھومتے ہوئے دیکھے اور وہ سکون کا گہرا سانس لے کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

جب وہ کراچی پہنچا تو ساتھیوں نے بچی کے متعلق پوچھا۔

”بیچ آیا ہوں مصیبت کو۔“ جیدانے صاف جھوٹ بولا اور اُسی روز اپنے تمام گمشدہ اور چھوڑ دی گئی سہیلیوں کو بتاتے ہوئے کہہ دیا کہ آئندہ کوئی بچہ اغوا نہ کرنا، اور کوئی نئی عورت بھی نہ لانا۔ اپنے دل چاہ رہی ہیں، وہی بہت ہیں۔

اس کے برعکس اُس نے جب کبھی اپنے گھر کو دیکھا تو بھینپ گیا۔ اس کی سہن اور مال برقعے میں باہر نکلتی تھیں۔ پردے میں رہتی تھیں۔ باپ کو شلواری پہنے دیکھ کر اسے گلے محسوس ہوتی اور اپنا خاندان گھٹیا نظر آیا۔ اُس نے باپ سے پوچھ لے کر ناز کا برقعہ اتار دیا اور ابا بپا جو راسی پنشن اور بیٹے کے آسرے پرچی رہا تھا بیٹے کی راویں حاصل نہ ہو سکا۔ وہ اس عجیب روی کو ناپسند کرتے ہوئے بھی مزاح نہ ہوا۔

اب دونوں بھائی مشرقیت کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے جسے وہ اپنی پسندانی کا باعث سمجھتے تھے پھر سے شیعہ انداز میں پرقرار زندگی بسر کرنے والے کہنے کی ہاگ دور انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بڑے بھائی نے بازار کا موصوفہ سیدٹ، آرڈیو سیدٹ، ڈیز اور ٹی سیدٹ کی قیمتیں پوچھیں تو اُسے یوں لگا جیسے ایک دھماکا ہوا ہے اور اس دھماکے نے اسے مغرب کی چمک دکھ سے اٹھا کر وہیں چمک دیا ہے جہاں اس نے جنم لیا تھا۔ وہ بھیجا بھیجا سا گھر لوٹا۔ کاغذ پھیل لے کر غواہ اور ان اشیاء میں توازن قائم کرنے لگا لیکن دہائی تو زمین آسمان کا فرق تھا۔

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ٹھیک ہارٹر ٹکسٹ ٹیلی گرام کرنے لگا تو اسے اونچی سوسائٹی کا خیال آگیا۔ بیخیال آتے ہی وہ فحشی بھیل سے کی طرح جھنجھلایا اور ایک بار پھر اسی گورکھ دھندے میں کھو گیا۔ اُسی شام اس کے ایک دوست نے انہی سہن کی سالگرہ کی تقریب میں گارڈن پارٹی دی تھی جس میں اس کے چھکے کا درجہ بھی مدعو تھا۔ یہ پارٹی اُس کے سینے میں آگ لگاتے ہوئے تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس دوست کی خواہ آتی نہیں کہ وہ ایسی پارٹی دے سکتا۔ چہرہ پر یہ کہاں سے آیا؟

اُس کے دماغ میں پہلی کوئدی جہاں مالوسیدل کا اندھیل چھارہ تھا وہیں ایک راستہ دکھائی دیا۔ ”صاحب ہمارے لیے کوئی خدمت ہو تو حاضر ہیں۔“ اس کے دفتر کے چراسی کی کچھ ماہ پہلے کی آواز اس کے دماغ میں گونجی۔

ملازمت کی یہ کرسی بندھانے کے دور در بعد اُس کے چراسی نے اسے لازار لند بھیج کر کہا تھا۔ ”ہم بھی بال بچے دار میں صاحب آپ کا دیا کھاتے ہیں۔ پہلے صاحب ہمارا بہت خیال رکھتے تھے۔ صرف آپ کے حکم کی دی رہے۔“

چراسی کی یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ چھ ماہ کی ملازمت میں اسے کچھ کچھ پتے پڑتا جاتا تھا لیکن ملازمت کی یہ کرسی بندھانے کے دور در بعد اُس کے چراسی نے اسے لازار لند بھیج کر کہا تھا۔ ”ہم بھی بال بچے دار میں صاحب آپ کا دیا کھاتے ہیں۔ پہلے صاحب ہمارا بہت خیال رکھتے تھے۔ صرف آپ کے حکم کی دی رہے۔“

دوسری صبح جب وہ دفتر میں پہنچا تو چراسی کی کرسی کی بجائے نور دین کدو آواز دی۔ دروازہ بند کر کے باہر سے اپنے قریب بلایا، کچھ سرگوشی کی۔ اب چراسی جو اب ہر گھلا تو اس کے چہرے پر پہلے صاحب کے زمانے والی مسکراہٹ بھیل رہی تھی۔

اُس مسکراہٹ میں سے ایک صوفی سیدٹ نکلا، ایک ریڈیو اور پھر آتے دن اس میں سے ہر وہ شے نکلنے لگی جو خفیہ تہذیب کا لازمی حصہ تھی اور جس کے بغیر سوسائٹی میں آبرو رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

جیل نے اس کی کو بھول جانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اس کے ذہن میں انڈیا نقش بنی چکی تھی۔ جس رات وہ جو کراؤ لہر سے واپس آیا تمام رات بے چین رہا تھا جیسا کہ بھرپور چسپاں جانے کے باوجود اُسے شبیں آبا نہ نیند نصیب ہوئی تھی۔

مرغ اذانیں دے رہے تھے تو وہ ڈائری کھولے بیٹھا تھا کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے لکھا:

۱۵ جنوری ۱۹۵۰ء

میرے پیٹھ میں ایک گمشدہ پتھر رو رہا ہے پچیس برس پہلے میں نے اسے مار دیا تھا اور خود کراہ سے جی رہا تھا۔ ایک صوفی کی نے اُسے پھر زندہ کر دیا ہے۔ اُسی کو اُس کے مال باپ کے حوالے کر دیا ہوں۔ اسے کس کے حوالے کروں؟ میری قوت اپنی ہی مگر وہی میں دم توڑ رہی ہے۔ کسی کے خون کی ضرورت ہے۔

کراچی کا ہنگامہ اور شور ابھرتے سورج کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ جیلا پر کلیف وہی غنڈہ گئی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر سونے کی کوشش کی لیکن کچھ نہ لگ سکی۔ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چھانکا۔ مٹا، بیٹو اور بادل گہری نیند سو رہے تھے۔ برآمدے میں تین نو عمر لڑکے کھلونوں میں لیٹے پڑے تھے۔ وہ جیلا کے نئے شکر دتے۔ اُس نے پاجامہ نمائندوں کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ایک لڑکے کو پاؤں کی ٹھوک سے جگایا اور درو پلے اُس کی طرف پھینک کر کہا۔ ”یو، روٹی کھا لینا اور آج چھٹی کرو۔“ اور باہر نکل گیا۔

وہ اس طرح فٹ ہاتھ پر سر جھکاتے چلا جا رہا تھا جیسے کسی پوچھتے دبا ہوا سوہلے دھیان جا رہا تھا اسی کیفیت میں ہالی کے کورٹھے پر بیٹھ گیا جو اپنے کمرے میں بے حس لاش کی طرح پڑی تھی۔ اُس کا لالہ جاگ رہا تھا اُس نے جیلا سے کہا۔ ”اسے نہ جگاتے، رات بھر دھندلا رہا ہے۔“

جیلا کچھ کے بغیر آگے بڑھا اور فرش پر کھجی ہوئی درمی پڑ گیا۔ فوراً ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ اُس کی آنکھ کھلی تو شام کا دھندلا کراؤ اور ہاتھ تھا۔ اس کے اعصاب ٹھکانے لگے تھے۔ اُسی رات بیٹوں نے اُسے بتایا تھا کہ ایک مال ہے، بہت سستا، جیلا کہہ چکا تھا کہ آئندہ یہ کاروبار نہ کر دیا جائے لیکن بیٹوں نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ ایک جھلک دیکھ لو اور وہ رضامند ہو گیا چنانچہ اگلی شام کو ایک اٹھارہ سالہ حسین و جمیل لڑکی اُس کے ہاتھ آگئی تھی۔ اس کا نام ناز تھا اور وہ تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔

ناز جیلا کو آئندہ کے ایک متوسط گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے ایک بھائی نے بی۔ اے کیا تھا، دوسرا سائنس میں تھا۔ ناز اٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ مگر کوئٹہ بھائی کو اچھی ملازمت مل گئی اور بڑے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ عادی نہ ہو کر اُس نے انگریزی تعلیم، اچھی ملازمت اور اوپنرے درجے کی سوسائٹی سے مغرب پرستی کے اثرات قبول کیے جنہوں نے اس کی مشرقیت کو ختم کر دیا۔ اسے زندگی میں پہلی بار محسوس ہونے لگا کہ اُس کا خاندان، قیادتیت کے اندھیر میں پڑا ہے۔

کراچ کے دوران اُس کے شب و روز کا چکر گھر سے کراچ اور کراچ سے گھر تک محدود تھا لیکن اس کے سامنے اب حدود نہیں۔ وہ دوستوں کے گھر میں جانے لگا۔ اس نے وہاں ریڈیو اور صوفے دیکھ کر بے چارے دیکھے اور دوستوں کی نیم چراں بیویاں، سالیان اور نہیں دیکھیں۔ نائیلون کی اوڑھنے سے جھانکے ہوئے پُرشاب نسوانی اعضا دیکھے اور فیشن زدہ سکرٹس دیکھیں۔ وہ ان کے قریب پہنچا اور ان سے متعارف ہوا۔

ایک ہی سال کے مختصر عرصے میں آباد اجداد کا صدیوں پرانا گھر گرا دیا گیا۔ پرانی تہذیب اس کے بلے تلے دب کر گر گئی اور اس طے میں سے ایک عمارت نے سر نہ نکالا جس کا تصور ناز کا میں سو روپہ تیر خواہ پائے والا بھائی خواب میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بھائی نے ناز کو برقعے میں سے نکال لیا اور باپ کو چھپا دیا۔ باپ بھی تو پرانے مکان کا کلبڑا تھا۔ طبعیہ آباد کے مضامین میں اور باپ نئے مکان کے ایک کونے میں چھپ چکا تھا۔

ایک وہ ہونے میں ہیں پہاڑی ٹرائن سوتا ہے۔ ایک وہ چوہا پی ڈانٹ اور تہمت کے بل بوتے پر پڑے بن جاتے ہیں لیکن ناز کا بھائی ان دونوں زمروں میں نہیں تھا۔ وہ تیسرے گروہ کا آدمی تھا جو اپنے اوپر ٹرائن ٹھوس لیا ہے۔ اُس کی تربیت کسی اور ڈھب پر ہوئی تھی اور وہ کسی اور راہ پر چل پڑا تھا۔ کونے سے سنسن کے پرائز لے لے لے۔ اُس کا مہربان اور سحر خیز ہنر بدیہاتی سے نکلتا تھا۔ وہ دولت کے پڑوں میں چھپنے لگا۔ سوسائٹی کے پرانے کھلاڑیوں نے اسے اپنے ڈھب پر چلایا جسے وہ اپنے لیے باعث افتخار سمجھتا تھا۔

ناز کا رشتہ اُس وقت کا طے ہو چکا تھا جب وہ تیرہ برس کی تھی لیکن اب اس کے بھائیوں کو یہ رشتہ گوارا نہ تھا۔ وہ تمام قدیم بدھن توڑ چکے تھے۔ بڑا بھائی اب چھوٹا آدمی نہیں تھا۔ اس کی آمدنی کا کوئی حساب نہ تھا۔ وہ گود پیش کو دیکھتا تھا تو اونچی سطح سے دیکھتا تھا۔ اس سفر نگاہی نے اُسے اندھا کر دیا۔ وہ اب نیچے نہیں آتا چاہتا تھا اس لیے سب سے پہلے نیچے والوں سے ناز کی منگنی توڑ دی۔

وہ ناز کی وساطت سے بڑے آدمیوں کے ساتھ ٹاٹے چوڑے تھا جس کے لیے ناز ہی موثر ذریعہ تھی چنانچہ اُس نے ناز کو سوشل بنانا شروع کیا۔ اسے دوستوں کی بہنوں، بیویوں اور سالیوں سے متعارف کرایا اور جب دیکھا کہ کھل گئی ہے تو اس کی ملاقاتیں دوستوں کے ساتھ کرانے لگا۔

ناز اس وقت میرنگ کا امتحان دے چکی تھی اور وہ دل بھائی اسے کالج میں داخل کرانے کے منصوبے بنا چکے تھے۔ ان کے توارے نہارے تھے۔ رشوت اور بددیہاتی نے دولت کی دیوی کو ان کا غلام بنا دیا تھا۔ ناز کو دو بیڑے چھوڑا اور حصہ پہلے گھونگٹ کی صورت میں تھا، ڈھلک کر کندھوں پر اٹھایا اور جب اسے کراچی کی ہوائ کی توجہ سے پراسنپا، پھر خاتون ہی ہو گیا۔ فیض لیتے لکھتے ٹخنوں تک پہنچ گئی اور کندھے شنگے ہو گئے۔

”میرے بھائی جان کتنے میں ناز کی گردن اور کندھے بہت خوبصورت ہیں۔“ اس کی ایک سہیلی نے ایک رو کر کہا۔

اُسی شام ناز سہیلی کے ”بھائی جان“ سے ماتھ ملا رہی تھی۔

ناز کے باپ کی عمر بہت کم تھی۔ نظراتی کمزور تو نہ ہوئی تھی مگر اب وہ اپنی اولاد کو انھیں سیکڑ کر دیکھنے لگا تھا۔ اُسے کبھی دفعہ خیال آیا کہ اس کے بیٹے اور بیٹی کسی کے چھین لیے نہیں۔ بڑھا بڑھی کوٹے میں بیٹھے ماضی کے جن بچوں میں کھوئے رہتے تھے۔

ناز کا کالج جانے لگی تھی۔

پھر کالج کے بہانے نہتے پردہ گرام بننے لگے۔

ناز کے بھائی کا خیال تھا کہ اُس نے گھر سے دقتا نویت کو نکال دیا ہے لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ وہی پرانی تہذیب اور دی تربیت اس کی رگ رگ میں رچی ہوئی ہے۔ اس کے لاشعور پر اسی دقتا نویت کا ہی غلبہ تھا۔ اُس نے صرف کینپلی بلی تھی۔ اس کی مغرب پرستی تو اپنے احساس کمتری کو دوسروں کی نظروں سے چھپانے کا ذریعہ

تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ سیداری اور خود فریبی میں ایک نہ خفیف سافری ہوتا ہے جو کسی بھی وقت ختم ہو سکتا ہے۔ وہ ناز کو سرکس کے ناز پر چلا رہا تھا۔

ناز ابھی فسط ایڑیں ہی تھی کہ اُس نے بیک وقت دو چاہنے والے منتخب کر لیے تھے جو حقیقت اُس کے بھائی نے اسے دیتے تھے لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ بھائی نے اسے نیلا می پڑھا رکھا ہے۔ اسے یہی کچھ معلوم تھا کہ اس کے سونے کے کمرے میں جو نیلا فوٹو آگیا ہے وہ خریدائیں گئے تھے۔ کیا ہے اور بڑا بھی تھے کمال ہے۔ اُس کا بھائی اُس کا رشتہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو دینا چاہتا تھا اور یہ دونوں امیدوار نئے سے نئے تحفوں کی صورت میں بڑھ بڑھ کر بولی دے رہے تھے۔

ناز کا بھائی اچھی طرح جانتا تھا کہ ہر دولت مند اور ہر بڑا آدمی صرف دو چیزوں کا غریب ہے۔ وزارت اور عورت۔ وزارتیں آتے دن ٹوٹتی ہیں جہاں عورت سے جو کام لیا جاسکتا ہے اسی وقت لیا جاسکتا ہے۔ ادھر ناز کے کاکول میں اضافہ ہو رہا تھا اور اس کے دماغ میں فلم اور فیشن کے سوا کچھ نہ تھا۔

حیدر آباد میں ایک نائب وزیر دورے پر آیا جس کے اعزاز میں ایک پارٹی دی گئی۔ ناز کا بھائی ناز کو بھی ساتھ لے گیا۔ وہاں مغربی پاکستان کے ایک سرکاری خالصا صاحب کی نظر ناز پر پڑی تو انہوں نے حاشیہ برداروں سے ناز کی تفصیلات معلوم کیں۔ انہیں بتایا گیا کہ بکاؤ مال ہے، اچھے کاکب کی تلاش ہے۔

خالصا صاحب پچاس کے پیٹ میں تھے گھر میں پرانے وقتوں کی ایک بیوی تھی لیکن ناز کے انداز دیکھ کر مری سوچ میں کھو گئے پھر اس سوچ کی نگارنیوں سے کاروباری سکراٹشیں پھرتے لگیں جو پارٹی کے دوران ناز اور اس کے بھائی پر ہی مرکوز رہیں۔

ناز اب انگریزی بھی بولنے لگی تھی۔ گزیر کے بچوں کے ساتھ اس کی گردن کا خم جذبات میں سچاں پیدا کر دیتا تھا اور اس کے امیدواروں کی قطار لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ اس قطار میں شادی کے امیدوار کرم اور شنب بھر کے ساتھی زیادہ تھے۔

خالصا صاحب لاہور پہنچے تو ایک ہی ہفتہ بعد ناز کے بھائی کی تبدیلی لاہور ہو گئی۔ خالصا صاحب نے طیش پر جا کر اس کا استقبال کیا۔ پھر ایک کوٹھی الاٹ کرادی۔ چند روز بعد ناز کو بھی لاہور بلا لیا گیا۔ حیدر آباد والی کوٹھی کراسے پڑھ گئی اور بڑھے مال باپ بھی لاہور پہنچ گئے۔

لاہور میں ان لوگوں کی ملاقات اہم سے ہوئی، وہ بھی حیدر آباد کا رہنے والا تھا اور کسی دفتر میں معمولی ملازم تھا۔ ناز کو وہ بچپن سے جانتا تھا۔ وہ اس وقت انھوں نے جماعت میں تھی جب اہم بی۔ اے پاس کر کے لاہور چلا گیا تھا۔ وہ ایک لیر زینل کا واباش بیٹھا تھا۔ کلی کلی کارس چڑھنے والا بھورا تھا جو خوش شکل اور خوش پوش تھا اور زبان کا بہت میٹھا چٹکنی چڑی باتوں سے اس نے کتنے ہی دل وہ کرسٹل ڈالے تھے۔

وہ الیٹ۔ اے پاس کر چکا تھا جب اُس کا باپ مر گیا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ ایک تو باپ کی گھر گھریوں سے نجات ملی دوسرے اُس کی جائیداد بٹھ آگئی۔ تین سو ایکڑ زمین کے علاوہ چار قلعہ نما حویلیاں کراسے پڑھیں لیکن باپ کے مرنے کے چند روز بعد اسے علم ہوا کہ ساری جائیداد سوا کے ایک چھوٹے سے مکان کے قرض خواہوں کے پاس رہی ہے۔

باپکے وقت کی عیاشیاں بلیوں میں رچی ہوئی تھیں۔ اہم نے اپنے آپ کو اونچی سوسائٹی کا فرد بنا رکھا تھا۔ اصل علی حقیقت جو سائے آتی تو پریشان ہونے کی بجائے اس نے مکر و فریب سے اپنے اس ٹھاٹھ کو قائم رکھا۔ وہ

ساتھ چپک گئی تھی۔ اسلم مقروض بھی ہو چکا تھا۔ اس کا بھرم اٹھ رہا تھا۔ اس کے لیے ناز بہت منگنا سو دا تھا۔ اسے سوسائٹی میں پوزیشن قائم رکھے کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔ قرض خواہ جان کو آنے لگے تھے۔ اور ایک شام ناز کو اچا جانے والی ایئرپیس پر اسلم کے ساتھ سینڈ گلاس میں میٹھی گاڑی کے لیے سگم ٹھکڑا، ٹھکڑا ٹھک میں ہرگز تن بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اسلم نے دفتر سے ایک مینے کی چھٹی لے لی تھی اور ناز گھر سے دو ہزار روپے چرا کر نکل آئی تھی۔

کراچی پہنچ کر وہ ایک دو ماہ اندر بے کے ہوٹل میں داخل ہوئے۔ جیڈ کی منڈی ایسے ہی اسلموں اور نازوں کے دم قدم اور ایسی ہی محبتوں کی بدولت چل رہی تھی کراچی کے پرنسنگ مشب دور میں یہاں کی پریچنگ کلیوں اور ٹم آؤد فضا میں۔ یہاں کے جوہم کی افالفری اور بھگم بھگم میں اور یہاں کی زمیں دوز دنیا میں چرائی ہوئی لمیس۔ کاریں اور بھینسیں گم ہو جاتی تھیں۔ ناز تو بلی پستلی نازک سی لڑکی تھی۔

جس ہوٹل میں وہ داخل ہوئے اس کے بوڑھے مینجر کے چہرے کی ٹھہریوں میں جانے ایسے کہتے ہی اسلموں اور نازوں کی داستانیں پوشیدہ تھیں۔ اس کے ہاں مدت سے ایسے جوڑے آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔ اس کی چند ہی آنکھیں ایک سی نظم میں بھانپ لیتی تھیں کہ یہ لوگ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جاتے ہیں۔ اس نے کئی "اسلم" اپنی نازوں کو سہیں چھوڑ کر کراچی میں گم ہوئے دیکھے تھے۔ یوں تو وہ ہر گاہک کے سامنے سر کو ذرا سا جھکا کر سلام کیا کرتا تھا لیکن اسلم اور ناز قسم کے جوڑوں کو دیکھ کر وہ اس قدر جھک جاتا تھا کہ اس کی ٹھوڑی کا منظر پر جا لگتی تھی۔ پھر ایک خاص سکراہٹ اور آنکھوں کی ذرا سی جنبش سے ہوٹل کے بیرے سمجھ جاتے تھے کہ اس جوڑے کا خاص خیال رکھنا ہے۔

اسلم اور ناز کو کمرہ دکھانے کے لیے وہ خود ساتھ گیا اور کھکیوں سے ناز کو دیکھتا رہا۔ اسلم کی باتیں اس نے کم سنیں اور ان کی بوڑھا سوچھی۔

بیس روز بعد ہی ناز ان باتوں کی ٹوہیں بٹھکنے لگی۔ گھر سے چرایا ہوا روپیہ اور پہننے ہوئے زلیفات جوڑیا وہ نہیں تھے۔ ختم ہو چکے تھے۔ اس وقت بھی وہ محسوس نہ کر سکی کہ اسلم کو اس کی نہیں اس کے روپے کی ضرورت ہے اور اس کا روپیہ اتنا خرچ نہیں ہوا جتنا اسلم نے اٹا لیا ہے۔

ناز اب اس سے جھنجھلا کر صبح و شام پوچھنے لگی تھی کہ اس کا سٹوڈیو کہاں ہے؟ فلم کہاں ہے؟ فلمی کمائی کہاں ہے؟ لیکن اسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ایک فلمی ڈرامے کی ہیروز بن چکی ہے اور ڈرامہ عروج کو پہنچ رہا ہے۔

اسلم چاہتا تو ناز کو اکیلا چھوڑ کر چیچے سے بھاگ سکتا تھا لیکن وہ اس کے بھی دام وصول کرنا چاہتا تھا۔ اور ہوٹل کا بل بھی۔

آخر وہ رات آئی کہ ناز ہوٹل کے کمرے میں آئینے کے سامنے میٹھی بیک اپ برنظر ثانی کر رہی تھی اور اپنے دل نشیں اور دعوت گناہ دیتے جسم کے خورد خالوں کے تانے بانے بن رہی تھی۔ اسلم نے اس کی ڈوٹی ناؤ کو سنبھال لیا تھا۔ اس شام اس نے اسے کہا تھا۔ "ناز! آج شام بن چکے تیار رہنا۔ میں ڈائریکٹر کو ساتھ لارہا ہوں تم جانتی ہو میں تو سہ ماہی لگانے والا پروڈیوسر ہوں ہیروز کا انتخاب تو ڈائریکٹر ہی کو کرنا ہے میری پسند کو وہ ناپسند تو نہیں کرے گا۔ لاکھوں روپے اس فلم پر لگا رہا ہوں۔ پھر کبھی وہ تمہیں دیکھ ہی لے تو اچھا ہے۔"

وہ آئینے کے سامنے میٹھی مرمیں پیشانی پر پڑی تراشیدہ لٹول کو سنوارے اسلم کے سبز باغوں میں

بھٹک رہی تھی کہ اسلم کمرے میں داخل ہوا۔

”نازا! ان سے ملو۔ یہ میں ہمارے ڈائریکٹر صاحب، مسٹر ٹی، مسٹر جی۔ زبیدی۔“

وہ چمک کر اٹھی، جسم کو زبردستی مل دیا اور بھائی کے دوستوں کی بہنوں، بیویوں اور سالیوں سے کبھی بہو کی مسکراہٹ، بہوٹوں پر رازستہ کی چھوٹے پر ماتھے کر سکا۔
ڈائریکٹر نے ”ہیلو سنا“ کہہ کر ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ناز نے کچھ خوشی سے ماتھے ملا کر ڈائریکٹر نے ناز کے گداز ہاتھ کو دھسا دیا اور اس کے چہرے پر گہری نگاہ ڈال کر ماہ و سال کا حساب لگایا۔ ماتھے پر پھر سے بالوں کی چمک اور جاذبیت کا جائزہ لیا اور مال کی قیمت کا اندازہ لگایا۔

”اور زبیدی صاحب! — اسلم کر رہا تھا۔“ جس طرح بھی ہو سکے خواہ آپ کو دن رات محنت کوئی پڑے، انہیں ہیروئن کے رول کے لیے تیار کر لیجئے گا میں انہیں بہت دور سے لایا ہوں۔“
”مس ناز سے طرہ فرقوں ہوگی جو اس قدر شکل رول نبھا سکے گی۔“ مس زبیدی نے ہلٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں انہیں بہت جلدی تیار کر لوں گا۔ آپ آج ہی رات یا کل صبح لاہور جا کے میوزک ڈائریکٹر کو ساتھ لے آئیے۔ وہ بلائے نہیں آئے گا سیدٹ تو تیار ہو چکے ہیں۔۔۔۔۔ مس ناز! اب آپ اپنی کوٹھی میں ہیں گی سٹوڈیو کے قریب۔“

”تمہارے لیے انہوں نے بڑی خوبصورت کوٹھی خالی کروائی ہے۔“ اسلم نے کہا۔ ”تم ابھی ان کے ساتھ چلی جاؤ اور میں ہٹوں کا بل ادا کر کے لاہور چلا جاتا ہوں۔“ اسلم نے کہا۔ ”تم ابھی ان گیا اور آیا سمجھو۔“

کوڑھی کی بھول میں ایک اور حسین اور نوجوان کی بھٹک گئی۔

اس سے دو روز پہلے اسلم ناز کو آگے چلا دینے کی کوشش میں مصروف ہو گیا تھا۔ وہ پرائیویٹ تھا۔ تجربہ روک کے خیر و کن برقی قہقروں سے اندھیری گلیوں سے خوب واقف تھا۔ اسے جہاں کس بھی ٹیپول گیا تھا۔

ٹیپول نے ناز کو دیکھ کر جیسا سے بات کی تھی جیسا اور اسلم کی ملاقات کرادی تھی جیسا استاد تھا۔ زمین و زنیہ کے شاہی خاندان کا فرد تھا۔ وہ بھانپ گیا کہ اسلم اس کی دنیا کا آدمی نہیں، بلکہ یہ اس مندر سوسائٹی کا آدمی ہے جس میں جرم اور گناہ تو ہوتے ہیں مگر کوئی مجرم نہیں کہلاتا۔ اس میں ناجائز تعلقات میں لوث ہونے والے زن و مرد پر کڑی سوشل کمنٹریں آتی ہیں اور وہ جیسا کو ٹیپو کو، بادل کو اور جیلوں کے قیدیوں کو مجرم کہتے ہیں۔ جیسا نے اسلم کو باتوں کے پکر دینے شروع کر دیے۔ وہ ناز کو بلا قیمت، اڑا لینے کی سوچ چکا تھا۔ اس نے ایسی باتیں کہیں جن سے اسلم ڈر گیا اور جیسا اسے پولیس کے حوالے کر دے گا۔

اسلم جیسا کا ہاتھ تھام کر رو پڑا۔ وہ اور جیسا رات گئے تک گفتگو کے ساحل پر بیٹھے رہے تھے اور اسلم اسے ناز کی ساری داستان سناتا رہا تھا۔

اسلم ناز کے لیے نہیں رو رہا تھا اور نہ ہی اسے اپنے آپ پر دانا آ رہا تھا۔ رو پڑنا تو اس کے کاروبار کا ایک گڑبگ تھا جس میں وہ رہتا تھا۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا کر لینے، آنکھوں میں آنسو بھر لینے اور چہرے پر حسب ضرورت تاثر پیدا کر لینے میں وہ مہارت رکھتا تھا۔

جیسا تو ہاتھ کی صفائی سے جریب کاٹ رہا تھا، لیکن اسلم مسکراہٹ یا آنسوؤں سے اپنے شکار کی جیب

کا صفایا کرتا تھا۔ جیسا کو وہ چار بالوں میں بھانپ گیا تھا کہ یہ بیٹی کا لکھا ہے چنانچہ اس نے روسے کی ایک خاص قسم کا انتخاب کر کے آنکھوں کو پُر کر لیا، آواز رو د نہ بھائی اور جیسا جیسے تھر کو موم کر لیا۔

”دیکھو میاں! میں چاہوں تو تمہاری لاش اس سمندر میں بہا دوں اور لڑکی کو ہٹوں میں سے اٹھا لے جاؤں۔“ جیسا نے کہا تھا۔ ”لیکن تم نے مجھے تمام باتیں سچ سچ بتادی ہیں اس لیے میں تمہیں پانچ سوئے دول کا رقم نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا ہے۔ میں خود بہت بڑا پانی ہوں لیکن ہر اس پانی کا دشمن ہوں جو نیکی اور شرافت کا طمع چرچاٹے رکھتا ہے۔۔۔ چلو اب پانچ سو سو سو اٹھ سو۔“

”منظور ہے۔“ اسلم نے آنسوؤں کو مسکراہٹ میں تبدیل کر کے کہا۔ ”پانچ سو لیکن ہٹوں کا بل بھی تم دے دو۔“
”کتنا ہوگا؟“
”سات سو کے لگ بھگ۔“

جیسا نے ماتھے پر ٹیکسٹ ڈال لے کچھ سوچا اور کہا۔ ”منظور ہے۔“
اور اگلے رات جیسا کو پانچ سو روپے دے کر اس کے ساتھ ہٹوں کے منہج سے ملا تھا اور بل اپنے نام کو آگے ڈائریکٹر ”مسٹر اسلم“، ٹی، زبیدی کے ہر پے میں ناز سے ملا۔ اسلم کو میوزک ڈائریکٹر کو ساتھ لانے کے لیے لاہور بھیج دیا اور ناز کو اپنے ساتھ لے گیا۔ ناز اس کوٹھی کی طرف جاری تھی جو ٹیپو کے قریب بتائی گئی تھی وہ بہت خوش تھی۔

اسلم لاہور پہنچا تو یہ دیکھنے کے لیے ناز کے گھر گیا کہ ناز کی گمشدگی پر اس کے گھر والے کیا کر رہے ہیں ناز کا بھائی اپنے کمرے میں سر جھکا کر بیٹھا تھا۔ دوسرا بھائی پنگ پر لٹا چھت کو کھو رہا تھا۔ اسلم نے کچھ خوشی سے السلام علیکم کی جس کا جواب بریل سی ویکم السلام سے ملا۔

”ناز کہاں ہے؟“ — اسلم نے پوچھا۔
”ناز کہاں ہے؟“ — دونوں بھائی بیک وقت بولے۔ ”ہم تو سمجھتے تھے، وہ آپ کے ساتھ گئی ہے۔“
”میرے ساتھ؟“ — اسلم جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”میں تو ایک ماہ سے کراچی میں تھا۔“
”جیسی سے تو وہ لاہور ہے۔“

”لاہور ہے؟“ — اسلم نے کسی سے چھل کر کہا۔ ”ایک مہینے سے؟“
بڑے بھائی کے آنسو ٹپکے۔ اس لیے نہیں کہ اس کی بے راہ روی نے ناز کو غلط آزادی اور فحش میں گم کر دیا تھا بلکہ اس لیے کہ غاصب صاحب نے اس پر الزام دھروا تھا کہ اس نے اپنی بہن کا رشتہ نہ دینے کی خاطر اسے روپوش کر دیا ہے۔ غاصب صاحب اسے ملازمت سے برطرف کر دینے کی دھمکی بھی دے چکے تھے۔
”پھر کیا کیا آپ نے؟“ — اسلم نے بظاہر گھبراہٹ سے پوچھا۔ ”پولیس کو اطلاع دی، ملاحش کیا؟“
اس کی سہیلوں سے پوچھا؟

”مگر کیا کیا تھا۔ میں یقین تھا کہ وہ آپ ہی کیساتھ گئی ہے۔“ بھائی بولا۔
”اس میں کوئی شک نہیں۔“ اسلم نے کہا۔ ”ہمارے خاندانی تعلقات کی بنا پر آپ کا یہ قیاس غلط نہ تھا لیکن آپ کی اجازت کے بغیر اسے میں لے جانا مناسب نہیں۔ خاندانی شرافت کا بھی تو پاس ہوتا ہے۔“

کیا آپ مجھے ایسا بدکردار آدمی سمجھتے ہیں؟
 ”تو اب کیا کیا جائے؟“ بڑا بھائی پریشان ہو کر بولا۔ ”اخباروں میں اشتہار دینا تو مناسب نہیں۔
 وہ بھی تو نہیں کہہ سکتی جو جوان لڑکی ہے۔“
 ”اشتہار دے دیں۔“ اسلم نے کہا۔ ”ناز کا ٹیکہ لکھیں۔ اس نے جو کچھ بڑے بہن رکھے تھے وہ لکھیں۔
 قدرت اور میری بھی لکھیں۔“
 ”مگر لوگ کہیں گے جو جوان لڑکی ہے۔“ بڑے بھائی نے کہا۔ ”اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی
 گئی ہوگی۔“

”نہیں۔“ اسلم نے کہا۔ ”اشتہار میں لکھ دینا لڑکی کا دامنی توازن ٹھیک نہیں۔“
 ”مجھے خدشہ ہے۔“ چھوٹے بھائی نے کہا۔ ”کہیں فلمی لائن کے چکر میں نہ کھو گئی ہو۔“

”وہ فلمی دنیا میں ہوئی۔“ اسلم نے تباہی پگھول کر کہا۔ ”تو میں اسے زمین کی تہوں میں سے بھی نکال
 لاؤں گا۔“ وہ ایک کڑا ٹکھا اور لٹا ہر پھر سے ہوتے بلھے میں بولا۔ ”آپ یوں پریشان نہ ہوں۔ ساری
 پولیس میری ٹھہری ہے جسے میں ابھی جا کر چھوڑتا ہوں۔“
 اسلم ہانپ کر گیا۔ پھر ناز کے گھر والوں کو کبھی نظر نہ آیا، جیسے زمین کی تہوں میں روپوش ہو گیا ہو۔

جیانا کو ہوٹل سے ٹیکسی میں بٹھا کر لے گیا تھا۔ وہ ٹیکسی کے چوکوں میں سینا سکین پر اپنے آپ کو مڑتی
 کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ اپنے پہلوں میں بیٹھے جیانا کو کبھی لکھنویوں سے دیکھ لیتی اور پھر خیالوں کی رنگینیاں میں
 گم ہو جاتی۔

”پارٹ مشکل تو نہیں؟“ ناز نے سسکا کر جیانا سے پوچھا۔
 ”ہے تو مشکل میں ناز۔“ جیانا نے اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر کہا تھا۔ ”لیکن یہ تم پر منحصر ہے
 کہ اسے سمجھ لو۔ ہم دونوں کی پریشانی اسی طرح کم ہو سکتی ہے۔“
 ناز نے اپنا ہاتھ جیانا کے ہاتھ سے چھڑایا نہیں تھا۔

جب وہ دونوں ٹیکسی میں سے اترے اور ایک چارنز لڈیٹوں والی عمارت کے نیچے والی منزل کے
 اندھیرے صحن میں داخل ہوئے تو وہ نہ ٹھٹھکی تھی اور نہ اس وقت چونکی جب وہ ایک ایسے کمرے میں داخل
 ہو گئے جاسی ہوئے پھر اجڑا تھا جنانے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھی کتاب گارہوئے ہوئے تھی وہ گناہوں
 کی بو سے نا آشنا تھی۔ جیانا نے اسے چارپائی پر بٹھا دیا تھا اور خود کچھ کے لیے جا گیا تھا۔ وہ بھی بھول گئی تھی کہ
 اسلم نے اسے کہا تھا اس کے لیے ایک کوٹھی خالی کرالی ہے۔ وہ اس کوٹھڑی اور کوٹھی میں موازنہ ہی نہ
 کر سکتی تھی۔

اسے بھی معلوم نہ تھا کہ بستر پر وہ بیٹھی ہوئی تھی اس کی ایک ایک سلوٹ میں جن عشق کے جانے
 کتنے حادثات، کتنے ہی اسٹیم، کتنے ہی آغاز اور کتنے ہی گناہ پوشیدہ تھے۔ نہ جانے محبت کے کتنے ہی ڈراموں
 کا درپاسہ اس بستر پر اسی کوٹھڑی میں جڑا تھا۔ وہاں عشق کا دیوتا رو رہا تھا، شیطان ہنس رہا تھا لیکن ناز کے
 کان بند تھے۔ انھیں بند تھیں، دماغ بھی بند تھا۔ اس کی سوچ پھر نہ ہر دن سوار تھی۔ ایک پردہ جس
 کا پٹا سیاہ تھا، اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

وہ اس وقت ذرا چونکی تھی جب دس بندرہ منڈ کی تنہائی کے بعد ایک بڑھیا جس کا منہ پاں
 سے بھرا ہوا تھا بکھرے میں داخل ہوئی تھی اور اس نے چٹختی چڑھادی تھی۔
 پھر دیوار بند کمرے میں سے ناز کا احتجاج اور پھر پھڑکانے کی بے بس صدائیں بجلی منزل کے
 تنگ صحن کے اندھیرے میں گونجنے اور تسخیل ہونے لگی تھیں۔ وہاں اب اندھیلوں کے سوا کچھ نہیں تھا
 کراچی کا شور و غل بن گیا تھا اور ناز کی آوازیں دھیمی۔ پاکبلاں، مقہی۔ اس عمارت کے نیچے سے اوپر کی منزل
 تک شراب کی بو سے لٹھڑے ہوئے قہقہے، طبلے، سازنگیوں اور گھڑیوں کی بے شکم دھڑکن چھینا چھین
 ناز کی کٹھن لکھی آوازوں کو بے رحمی سے ٹکاتی جا رہی تھی۔
 ناز کی رگ رگ بیدار ہو چکی تھی لیکن اس کی قسمت سو گئی تھی۔

چند روز پہلے کی واردات تھی کہ ناز جیانا کی دنیا میں داخل ہوئی تھی۔ آج کی رات جیانا نے دائری کھولی
 اور یوں ہی کہیں کہیں سے پڑھ کر اکاٹ سے دراز میں رکھ دی اور سوچنے لگا جس رات وہ ناز کو بڑھیا کے
 حوالے کر آیا تھا اس نے دائری میں لکھا تھا....
 ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء۔

آج ایک اور لڑکی میری دنیا میں آگئی ہے۔ پانچ سو روپے کوئی مرنکا سودا نہیں
 ہوٹل کا سات سو کابل ہوٹل کا بیچاری جیبت ادا کر دے گا۔ وہ عقل مند ہے اور مجھے اچھی طرح
 جانتا ہے، سات سو روپوں کی خاطر اپنی جان ضائع نہیں کرے گا۔
 اسلم لاہور چلا گیا ہے۔ بدصیب انسان دل میں بہت خوش ہو گا کہ اچھا ہاتھ مارا
 اور ناز سے گلو خلاصی ہوئی لیکن وہ مجھے ساری باتیں بتا گیا ہے۔ اپنا اپنا بھی دے گیا
 ہے۔ اب وہ زندگی بھر میری ملکہ سیلنگ کا شکار رہے گا۔ ناز کا اعوا ساسے کی طرح اس
 کے ساتھ لگا رہے گا۔ میرے دو لیک میلا اس کے خون کا آخری قطرہ بھی چوس لیں گے۔ دلاؤ
 دور ہے نہ جیانا آباد۔ دور و بعد اس نے لکھا تھا۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۵۶ء۔

آج شام ناز کو دیکھنے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی برس پڑی۔ جی بھر کے مجھے کوسا۔ اسلم کو
 گالیاں دیں اور پولیس کی دھمکیاں بھی دیں میں نے اسے کہا ناز! مجھے اور اسلم کو گالیاں دینا
 بیکار ہے۔ اپنے بھائی جان کو کو سودا اور اپنے ماں باپ کی بے بسی پر دو۔ میرا اس میں
 کوئی قصور نہیں۔

وہ بہت بھڑکی میں اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ایسے میں وہ بہت خوبصورت
 لگ رہی تھی۔ اس کا حسن قدرتی ہے۔ قدرتی روپ میں زیادہ اچھی لگتی ہے۔ میک اپ اس کے
 جال سال چرسے کی رونق مار دیتا ہے۔ اچھے پیسے کا ہے گی۔ ابھی وہ نظروں کا سامنا نہیں
 کر سکتی میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو اس کی زبان تختلا گئی اور انھیں جھجکائیں۔
 بڑھیا ہے تو فرائنٹ کستی ہے چلاؤں گی۔

آج رات جیلانے کچھ بھی نہ لکھا۔ اُسے ایک بار پھر ناز کا خیال آیا۔ اس کے ساتھیوں نے کہا تھا وہ نہیں باقی۔ ان چند دنوں میں بڑھیا نے ناز کو ڈھنگ پر لانے کے ہر جن کر دیکھے تھے لیکن وہ کسی ڈھب پر نہ آتی۔

بادل اوٹپونے اسے مسلسل تین روز جھوکا رکھا۔ ایک رات الٹا لٹکا دیا۔ پھر ہر وہ حرکت کی اور ہر وہ اذیت دی کہ وہ دل پل میں سوسو بار مرنے لگی مگر وہ اپنی ہٹ پر قائم رہی۔

اس پر کئی بار غشی کے دورے پڑے تین روز کے فاقہ کے بعد جب اسے کھانا دیا گیا تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئی اور بڑھیا اس کے منہ میں دودھ پٹکا پتی رہی۔

آج شام جب جیل کو ساری رویندا و سنائی گئی تو وہ ڈائری بند کر کے بہت دیر سوچتا رہا اور اسی رات وہ ناز کو ٹیکسی میں بٹھا کر اندھیرے اندھیرے میں نیپہر روڈ سے اپنے کمرے میں لے آیا۔

جیل کا یہ کمرہ ایک ایسے مکان میں تھا جس میں کئی اور کمرے تھے اور ایک صحن بھی تھا۔ یہ مکان اونچی اونچی عمارتوں میں گہرا تھا۔ لیل تو یہ زمین پر تھا لیکن کراچی والوں کے لیے یہ زمین دھڑاکیسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ مال کون دیتا ہے یا کیا ہوتا ہے اور جسے معلوم تھا وہ ڈر کے مار کے کسی سے بات نہیں کرنا تھا۔ شروع شروع میں دو آدمیوں نے مٹری کی تھی لیکن یہ مکان وہیں رہا۔ جیل وہیں رہا۔ مکان کی چار دیواری میں مختلف جرائم کا سکول وہیں رہا۔ جیل کے کمرہ کا بیٹا کوارٹر میں رہا اور دونوں بچہ ایک ایک مہینہ اس مکان کے ایک اندھیرے کمرے میں جھوکے پیاسے بند رہے پھر اس مکان کے اس مہینہ تک کمرے کی چھت پر پھیلے ہوئے کمرے جالوں کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ دونوں کماں غائب کر دیئے گئے۔

اس مکان کے علاوہ جیل کے پاس تین مکان اور بھی تھے جن میں کرا بازی کے اڈے تھے۔ وہاں چرس افیون اور شراب بھی ملتی تھی اور بعض اوقات کسی منگرا کا مال بھی ملتا یا معاوضے پر رکھ لیا جاتا تھا۔ وہ جو دنگل نہیں تھا۔ ان تینوں مکانوں کو وہ نمبر ایک، نمبر دو اور نمبر تین کہا کرتا تھا۔ اس کے اپنے مکان کا کوئی نمبر نہیں تھا۔ رات جب ناز اس مکان کے صحن میں داخل ہوئی تو اسے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کراچی کے کون سے علاقے میں ہے۔

کراچی کے علاقے تو بتاتے جانتے ہیں مثلاً گھار اور چاکو باڑہ۔ سو بھار بازار، جوڑا بازار وغیرہ۔ یہ پرانے کراچی کے علاقے ہیں۔ مکانوں پر مکان کھڑے ہیں۔ گلیاں تنگ و تاریک ہیں اور دیکھو تو آسمان کم اور مکان زیادہ نظر آتے ہیں۔ گلیاں آٹھ دس قدموں بعد مل جاتی اور ایک دوسری میں گم ہو جاتی ہیں۔

ان علاقوں میں رہنے والے ایک دوسرے کو جانتے نہیں، پہچانتے نہیں۔ کوئی چراتے تو وہاں باتیں اور اپنا رنجے رہنے والوں کو پتہ نہیں چلتا۔ ایک گھر میں ماہم اور دوسرے میں شادی ہو رہی ہوئی ہے کوئی بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا نہ ضرورت سمجھتا ہے کہ اس کے روبرو کیا ہو رہا ہے۔

ناز ایسے کسی علاقے میں پنچا دی گئی تھی جہاں چرا و روکیت مال سمیت غائب ہو جاتے ہیں ناز جیسی لڑکیوں کو یہ علاقے یوں منظم لیتے ہیں جیسے مگر کچھ نے وہ چار گلیاں بنگل لی ہوں۔ گھنے جنگلوں، پہاڑی علاقوں اور دشوار گزار وادیوں میں نا کو اور ریلز پر چڑھے جاسکتے ہیں۔ پرانے کراچی کے کسی علاقے میں جو غائب ہو جاتے تو اسے ڈھونڈنا مکان نامکن ہوتا ہے۔ ان علاقوں سے پولیس واقف ہے یا ایکشن لڑنے والے

لیڈروں کے ورکر۔

ناز جیل کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا، سامنے والی کھڑکی کے ساتھ ایک میز رکھی ہے جس کے دائیں طرف چار دیواریں۔ فرش پر ایک ٹفت بستر بچھا ہے اور باقی ہر طرف ریت کی اور گرد کی تین جہی ہیں۔ سکرٹوں اور بیلیوں کے بچھے ہوئے ٹکڑے بچھے پڑے ہیں اور چھت جالوں سے اٹی ہوئی ہے۔

دیواریں پر کبھی سفیدی کی گئی ہوگی مگر لالٹین کی روشنی میں یہ کسی غار کی دیواریں معلوم ہوتی تھیں چھت سے لٹکے جانے منظر کو بدیہت ناک بنا رہے تھے۔ سامنے والی کھڑکی مکمل طور پر دیواریں کے قبضے میں تھی۔ انہوں نے ایک طرف سے دوسری طرف تک جالے تن دیئے تھے۔

ناز نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ ایک کھڑکی اور ایک دروازہ صحن کی طرف کھلتا تھا۔ ایک دروازہ دائیں طرف کسی کمرے میں اور دوسرا بائیں طرف والے کمرے میں کھلتا تھا۔

دیکھنے میں یہ کمرہ نیپہر روڈ والے اس کمرے سے زیادہ خوفناک تھا جس میں ناز کئی راتیں گزارا کرتی تھی۔ اسے خیال آیا کہ یہ شاید دنیا کا آخری کمرہ ہے جسے وہ دیکھ رہی ہے اور اس کا آخری سانس ان جالوں میں اکچر ختم ہو جائے گا۔

اس کا جسم چند دنوں میں ہی کھوکھلا ہو چکا تھا۔ منہ بہت دلوں سے دھلا نہیں تھا۔ بال بکھر کر پسینے سے جڑ گئے تھے۔ پچھلے میلے اور داغ داغ ہو رہے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیاں کانپ رہی تھیں ناز پائش خوں کے پٹے دھبوں کی طرح برہم ہو چکی تھی۔ ہونٹ اس پودے کی کلیوں کی طرح مرجھا گئے تھے جسے بہت دنوں سے پانی نہ ملا ہو۔ آنکھیں رورور سوچ گئی تھیں۔

”اس کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں آئے گا۔ یہاں نہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“ ناز چونک اٹھی۔ جیل اس کی بیٹیہ چھپے چھپے ڈاکر بنا تھا۔ ناز نے اپنے کندھے پر ایک ماتہ کا ہلکا بھکا بوجھ محسوس کیا اور مٹا۔

”اس کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں آئے گا۔ یہاں نہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“ ناز چونک اٹھی۔ جیل اس کی بیٹیہ چھپے چھپے ڈاکر بنا تھا۔ ناز نے اپنے کندھے پر ایک ماتہ کا ہلکا بھکا بوجھ محسوس کیا اور مٹا۔

اس نے دونوں کندیاں نیپہر ٹیک دیں، سر ہاتھوں میں رکھ لیا اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ جیل خانہ دہشت سے کمرے میں ٹپل رہا تھا۔ ناز اسی سلوک اور برتاؤ کا انتظار کر رہی تھی جو ہر رات اس سے ہو رہا تھا۔

اُسے اُدھ آتی پھر نیند کا سا جھونکا وہ اس کا سر ڈھلکا کر کندھے پر جا لگا اور وہ چونک کر سنبھل گئی۔ اس کی بیٹیہ جیل کی طرف تھی۔ وہ جیل کی طرف گھومی۔ اس کی آنکھوں میں البتہا نہیں آنکھ رہی تھیں۔ رات نصف سے زیادہ گزرتی تھی۔

ناز آہستہ سے اٹھی اور کرسی کا سہارا لے کر زندگی جیونی آواز میں بولی۔ ”یوں تو پڑا تھا کہ مجھے کیوں مار رہے ہو ظالمو! ایک رات تو سو لینے دو۔ وہ ٹانگیں گھسیٹ کر آگے بڑھی، جیلر ٹپٹنے ٹپٹنے کر گیا ناز آگے چل سکی اور سکے لگی۔

”بسن بچھا ہوا ہے سو جاؤ۔“ جیلر نے کہا۔

”نہیں۔“ ناز نے کہا۔ ”تم مجھے سوتے میں پریشان کر دو گے۔“

”ناز۔“ جیلر ٹھہری جیونی آواز میں بولا۔ ”میں نے تمہیں اپنے لیے نہیں غریب آدمی سے متعلق شاید

کچھ بھی نہیں جانتیں۔

”سب جانتی ہوں۔“ ناز نے بے بس عتاب سے کہا۔ ”تم خود سے ہو۔ بد معاش ہو تم ایسے

انسان ہو۔۔۔۔۔

”میں انسان نہیں ہوں۔“ جیلر نے اسے لوک دیا۔ ”میں جیلر جیب کٹر ہوں۔“ وہ تلخ سا گھونٹ

نکل کر بولا۔ ”خاموشی سے سو جاؤ۔ مجھے اپنے لیے تمہارے جسم کی ضرورت نہیں میں نے کبھی جھک نہیں

ماری۔“ نازک کے بولا۔ ”تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ، پھر سو جانا اور میں لو کہ آج سے تمہاری تمام تکلیفیں ختم ہیں۔

متنب کوئی بات بھی نہ لگائے گا۔ اچھا کھانا اور اچھے کپڑے ملیں گے۔ ایک لڑکا تمہاری خدمت کو موجود ہے

گا اور دو آدمی دوسرے کمرے میں پہرے پر ہیں گے۔ اب آرام سے سو جاؤ۔ جب جی چاہے جا کر آنا تمہارے

لیے سننے پڑے کل آتیں گے۔ رہنا لے دھو لے کا بندو بست بھی ہو جاتے گا۔“

”آؤ عجب تک مجھے قید رکھو گے؟“

”جب تک راپ نہ آ جاؤ۔“

”میں اس راہ پر کبھی نہ آؤں گی۔“ ناز نے ماری جیونی آواز میں کہا۔ ”کیوں ناحق اپنا وقت ضائع کرتے

ہو۔۔۔۔۔ مجھے مارو پھر میری لاش سے کھیلنے رہنا۔“

”جیلر نے عورت پر بھی وار نہیں کیا ناز تم اس کمرے میں قید رہو گی۔ اس کے سوا تمہیں اور کوئی تکلیف نہیں

ہو گی۔ تم یہاں سے ہزاروں شش کے باوجود بھاگ نہ سکو گی۔ تمہیں معلوم نہیں تم کہاں ہو۔ یہ جگہ زمین دوز ہے جہاں

سے کبھی کوئی نکل کے نہیں جاسکا۔۔۔۔۔ اٹھو۔۔۔۔۔ سو جاؤ۔“

”نہیں۔“ ناز نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے سوتے نہیں دو گے۔ تمہارے آدمی ہر رات

ایسا ہی کرتے ہیں۔“

”ناز۔“ جیلر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرم مزاجی سے بولا۔ ”تم بہت خوبصورت ہو میری کئی بیگمی

اس قدر دلکش نہیں تمہارا ہونہو! تمہارا جسم کچھ ایسا ہے کہ بڑے بڑے مسلمان کا فر ہو جاتیں گے۔

تمہارے نقش و نگار میں بے پناہ کشش ہے۔ اپنے حسن اور جوانی کو تباہ نہ کرو مگر یہ سن لو کہ مجھے تمہارے

حسن اور تمہاری جوانی کی ضرورت نہیں میں پتھر ہوں ناز میں برف کا بالک نہیں۔“

جیلر آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ناز کے کچلے مسلے ہوئے جسم میں ایک انوکھا سا اثر سرت کرتا جا رہا

تھا۔ اُس نے اعصابی تھکان اور تشویش میں ایک گونہ آواز محسوس کیا۔ جیلر کالب و لہجہ میں کچھ ایسا تھا۔

”میں متنب زیادہ اڑاں نہیں ہوں۔“ دوں کا۔ جیلر نے کہا۔ ”پرا تیروٹ رکھوں گا۔ دو سال کے لیے۔“

”تم مجھ پر رحم نہ کر سکو گے؟ جس جسم کی تم نے اتنی تعریف کی ہے اسے ہر رات سننے آدمی کے

آگے پھینک دیا کرو گے؟“

”میں نہ نہیں دیتا ناز آرام کرو، پھر سوچ لینا۔ میں تمہیں آزاد نہیں کر دوں گا۔“

ناز کو بڑھیا اور دوسرے ساتھیوں کے جیلر کے متعلق تمام باتیں بتادی تھیں۔ وہ اسے عجوبت سمجھنے

لگی تھی جو جہاں جاتا ہے، ایک نہ ایک انسان کو کھا کر آتا ہے۔ وہ جیلر سے خوفزدہ تھی۔ آج رات جیلر اس

نے جیلر کا سامنا کیا، اس کی باتیں سنیں اور نرم مزاجی دیکھی تو اس کے دل پر خوف کی گرفت طبعی پڑ گئی، حالانکہ

جیلر نے اسے صاف کر دیا تھا کہ وہ اسے آزاد نہیں کرے گا۔ پھر بھی ناز نے اس میں کسی حد تک ہمدردی کی

جھلک دیکھی۔ اسے یقین سا ہونے لگا کہ اس شخص نے اگر وار کیا تو اچھا نہیں ہوگا اور ناز کو بیوقوف بھی ہونے

لگی کہ جیلر اس کے حسن اور جوانی سے بہت متاثر ہے۔

”تم یہاں سو جاؤ۔ میں دوسرے کمرے میں سوتا ہوں۔“ جیلر نے کہا۔ ”آج رات فرش پر سو جاؤ،

کل پکنک اور اچھا لسن آ جاتے گا۔“

ناز بول بستر پر بیٹھ گئی جیسے گڑبڑی ہو۔ اس کا جسم ہلحال تھا۔ ٹوٹ چھوٹ گیا تھا۔

”لیٹ جاؤ۔“ جیلر نے کہا۔

وہ لیٹ گئی۔ جیلر دوسرے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ناز اسے دیکھتی رہی۔ جب اس نے دوسرے

کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ اٹھ بیٹھی۔

”سنو!۔“ ناز نے کہا۔

جیلر ک گیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”دوسرے کمرے میں۔“

”اسی کمرے میں سو جاؤ۔“ ناز نے سیمے ہوئے خفیہ لہجے میں کہا۔ ”اکیلے ڈر لگتا ہے۔“

جیلر ک گیا۔ ناز کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کی طرف لوں دیکھ رہی تھی جسے تنکے کا سہارا لے رہی ہو جیلر

والپس آ گیا اور کمرے کے وسط میں ناز سے کچھ پرے کمرے سے اٹے جوتے فرش پر لیٹ گیا۔

”یہ چادر لے۔“ ناز نے ایک چادر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”سر نہ بھی لے لو۔“

جیلر نے چادر لے لی، سر نہ لیا۔ چادر فرش پر بچھا کر لائیں بچھا کے سو گیا۔ ناز کے دکھ زدہ خیالات

ذرا سی دیر اندھیرے میں بھٹکے اور وہ بھی سو گئی، مگر دل میں ایک خدشہ لیے ہوئے کہ جیلر نے کس وقت کوئی

اسے دہلیز لے۔

اُسے کسی نے نہ جگایا۔ رات گزر گئی۔ سورج بھی نکل آیا۔ جیلر جاگا۔ ایک لڑکے کو ناز کے نہانے

دھونے اور کھانے پینے کے متعلق اور چند اور ہدایات دے کر باہر نکل گیا۔

ناز اُسی کمرے کوٹ پڑی تھی جس پر وہ گذشتہ رات لیٹی تھی۔ دن گزرتا جا رہا تھا مگر اس کی نیند بھری ہوئی جا رہی

تھی۔ دن کا پھیلا ہوا تھا جب اس نے کوٹ لی۔ آنکھ ذرا سی کھولی پھر سو گئی۔

شام کا غماز تھا جب وہ جاگی۔ اس نے کمرے میں ہر طرف دیکھا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ دل بہت تیزی

سے دھڑک رہا تھا۔ اعصاب جو اس قدر طویل نیند سے سکون پذیر ہو گئے تھے پھر پھٹنے لگے۔ خوف و ہراس چھپا

جانا تھا۔ وہ کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک نوعمر اور صاف ستھرا لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔
”نہایت لڑکے نے کہا۔“ اور تین غصنا نہ دکھا دوں میں چائے لے آتا ہوں۔“
”ہنوو... یہاں آؤ۔“

”یہیں تیس یہاں سے نکلنے کا راستہ نہیں بتاؤں گا۔“ لڑکے نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اور جو مری ہے پوچھ لو۔“

ناز مسکرا دی۔ ایسی مسکراہٹ جس میں شکست اور افسردگی رو رہی تھی۔
”یہاں بھی مجھے ماریں گے؟“ اس نے لڑکے سے پوچھا۔

”نہیں یہاں کسی کو مارا نہیں جاتا۔“ لڑکے نے جواب دیا۔ ”یہاں قتل کیا جاتا ہے۔“
”مجھے بھی قتل کریں گے؟“ ناز نے یوں اطمینان سے پوچھا جیسے اس کے جرم کی ہی سزا تھی جس کے لیے وہ دہشتی طور پر تیار تھی۔

”یہاں اس کو معلوم ہو گا کہ وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔“ لڑکے نے کہا۔ ”رات کو اس نے تمہارے ساتھ باتیں کی ہوں گی! وہ جسے قتل کرتا ہے اسے پہلے بتا دیتا ہے۔ میں کیا بتا رہا تھا؟“
”کہتا تھا تین یہاں کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ اور اب تم نہیں رہو گی اور۔۔۔“
”بس لیں۔“ لڑکے نے اس کا فہرہ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم اب گھر سے میں رہو گی۔ یہاں تمہیں کوئی نہیں ستائے گا۔ استاد جو کہ دیتا ہے وہی کرتا ہے۔“

لڑکا اس کے پاس بیٹھ گیا اور مسکرا کر پوچھنے لگا۔ ”تین استاد نے اپنے لیے رکھ لیا ہے؟“
ناز کو غصہ آئے سی والا تھا کہ اسے یاد آ گیا کہ وہ منڈب دنیا سے بہت دور زمیں دونوں ہی میں قید ہے وہ شہل گئی اور بولی۔ ”یہ تو مجھے معلوم نہیں۔۔۔ اس نے تمہیں کچھ بتایا تھا؟“
”نہیں تو! میں نے ویسے ہی پوچھا ہے۔“ لڑکے نے جواب دیا۔ ”لیکن وہ اپنے لیے کسی کو رکھتا نہیں۔ بالی نے اس کی بہت تئیں کی تھیں کہ وہ اسے جاپانی روڈ پر نہ بٹھائے، اپنے پاس رکھ لے۔ استاد نہیں مانا تھا۔“

”بالی خوبصورت ہے؟“ ناز نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں! اسے تو خوبصورت، لیکن تم سے زیادہ نہیں۔“ لڑکے نے یوں جواب دیا جیسے اپنے کھلونے کی تعریف کر رہا ہو۔ ”اس کی آنکھیں بڑی مست ہیں۔۔۔ اچھا میں چائے لانا ہوں مگر نالہ استاد کو نہ بتانا کہ میں نے چائے دیر سے دی تھی۔ اللہ قسم میری چوڑی ادھیلے کا۔۔۔ اور سنا! تم استاد سے کہو کہ تین اپنے لیے رکھ لے قیر اللہ کی تھی خوش خروگی کو کیا بتاؤں کہنا مجھے کسی نہ بناؤ، پلا تو سیرٹ رکھ لو۔ استاد کو نہیں بتانا کہ میں نے ایسے کیا تھا، میں؟۔۔۔ نہیں تو میں کہوں گا کہ یہ چھوٹی کھڑکی کھول کر جھانکے لگی تھی اور میں نے اسے بڑی شکل سے پچھا ہے۔ پھر استاد تین الٹا لٹکا کر مارے گا۔“

”چائے کہاں سے لاؤ گے؟“ ناز نے غصنا نہ کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

”بھول سے۔“ لڑکے نے جواب دیا۔ ”استاد نے کہا تھا کہ چائے کے ساتھ ٹاف لائے لڑکے اور ایک فروٹ ٹیک لانا اور رات کے کھانے کے لیے کھینی مرغی، چھ کباب اور دو شاہی کڑے کر دیا تھا۔“
ناز کے منہ میں پانی بھر رہا اور وہ غسل خانے میں گھس گئی جہاں تولیہ، صابن، کھچھی اور تیل کی تہی بوتل لگی

تھی۔ ایک طرف کھوٹی پرینٹے رنگ کا مہلن کا سوط اور دوسری لٹکا ہوا تھا۔ دروازے میں سے ہاتھ نرم لپٹے پڑے تھے۔ دیوار کے ساتھ نیا آئینہ لٹکا ہوا تھا

وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی مگر اپنے آپ کو سہلی نظر میں پہچان نہ سکی جب پہچان کی تو پہچانے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔ اس کے جسم کا انگ انگ کراہ رہا تھا جسے وہ برداشت کر رہی تھی لیکن اپنے چہرے کا یہ حال حلیہ دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھی اور نہ ہی اپنا سامنا کرنے کی اس میں تاب تھی۔ اس کے آنسو ٹپک آتے اور دل ڈوبنے لگا۔

ناز نے آئینے سے غصہ پھیر کر کپڑے اتارے اور دل کھول کر پیچھے گئی۔ پانی کی تیز اور دہیز دھار اس کی گیارہ دنوں اور بارہ راتوں کی اذیت اور تھکان دھونے لگی تھی تھی لیس اپنی جگہ پر آنے لگیں۔ اعصاب سکون پذیر ہونے لگے اور جھوک کی شدت کا بھی احساس ہونے لگا۔

جس رات جیلا ازم کے ساتھ بھول کے کمرے میں داخل ہوا تھا اس سے تھوڑی دیر پہلے ناز نے پیٹ اور جی جگر کے کھانا کھا یا تھا اور آج اتنے دنوں بعد اسے پھر اسی قسم کی جھوک محسوس ہوئی۔

جب وہ تویلے سے جسم کو پیچ کر مہلن کی تہی قیض پہننے لگی تو کپڑے کی جھک اور ملائم پن میں اسے تلخ سی لذت محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے قیض پہن لی۔ پھر لڑا رہی اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اپنی نکھری ہوئی صورت دیکھ کر اسے سکون سا محسوس ہوا۔ ہر زاویے سے اپنے آپ کو دیکھ کر وہ ہار نکل آئی۔

کمرے میں پہنچی تو وہاں چار پانی، کھچھی، اس پر کچھا ہوا اچھی قسم کا بستہ تھا۔ ساتھ ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر لڑکا جا رہے تھے جگہ تھا۔ وہ بے صبری سے چائے پر بیٹھ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے چاروں ٹاف بڑال اندھے اور سا فریٹ کیک کھا گئی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے جگر سے تھک گئے ہوں چائے کے گرم گرم گھونٹ جگر کو سہلانے لگے۔ اس کے جسم میں زندگی کی برق بیلر ہونے لگی اور اعصاب تازہ ہونے لگے۔

وہ کچھ سوچنے ہی لگی تھی کہ لڑکے نے اسے چوکا دیا۔ ”تم بالی سے زیادہ خوبصورت ہو۔“

لڑکا اتنی دیر سے اس کے دھلے ہوئے بالوں اور چہرے کی سپیدی کو دیکھ رہا تھا۔ اس سپیدی پر کہیں کہیں گلابی سے دھبے جو غیر موزوں نہیں تھے، نمودار ہو گئے تھے۔

”استاد تین اپنے لیے رکھ لے گا۔“ لڑکے نے کہا۔

ناز نے اس کی طرف دیکھا اور انوکھے سے انداز سے مسکرا دی۔ اس مسکراہٹ پر لڑکا بھی مسکرا دیا۔

”دیکھو۔“ لڑکے نے کہا۔ ”استاد کو نہیں بتانا، میں تو چھپے ہی کر رہا تھا تمہارے خاندان کے کی بات ہے۔“

”تم استاد کے نوکر ہو؟“ ناز نے مجروح سخی گفتگی سے پوچھا۔

”ہم ایسی باتیں کسی کو نہیں بتانا کرے۔“ لڑکے نے جواب دیا اور پوچھا۔ ”کھانا کس وقت لاؤں؟“

”وہ کس وقت آئے گا؟۔۔۔ تمہارا استاد؟“

”اس کا انتظار کرو گی؟“

”ہوں!“

کہنے لگا۔ اب کسی کی نوکری نہیں کروں گا، اب سائیکل رکشا چلاؤں گا۔ اُس نے قرض لے کر اٹھائی سو یا شاید ساڑھے تین سو روپے کی سائیکل رکشا خریدی کر لائسنس نہ ملا۔ لائسنس دینے والے ایک سو روپیہ مانگتے تھے۔ باب کو اور وہ پیہ نہ مل سکا۔ گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ چند روز بعد رکشا بیچ ڈالی۔ اس کا صرف ایک سو وہ پیہ ملا۔ پھر باب کو ہر وقت غصہ آنے لگا۔۔۔۔۔

”میں اُس وقت چھوٹا سا تھا۔ اُس نے گھر میں مار پٹائی شروع کر دی کبھی مجھے مارے کبھی مال فومارے۔ ایک دن اُسے بیمار ڈی کوئی میں نوکری مل گئی۔ میں روز کا کم پر گیا۔ ایک دن معلوم نہیں اس کے اوپر کیا گرا کہ اُس کا بازو ٹوٹ گیا اور وہ بیکار ہو گیا۔ نوکری سے بھی جواب مل گیا اور میں روز کے پیسے بھی نہ ملے۔ پھر باب سر روز اور اسی بات پر مجھے اور مال کو مارنے پٹنے لگا۔۔۔۔۔

”ایک دن اس نے مال کو گھر سے نکال دیا اور مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ مال معلوم نہیں کہاں چلی گئی اور ایک روز باب، مال کے جانے کے دس بارہ روز بعد صبح سویرے باہر گیا پھر واپس نہیں آیا۔ دو روز تک وہ نہ آیا تو میں فٹ پاتھ پر روتا پھر تیسرے روز اتنا جدیلے مجھے دکھایا۔ اُس نے میری ساری باتیں سنیں اور مجھے یہاں لے آیا۔ یہاں اب بڑے مزے میں دن بھر رہے ہیں۔ اب تو میں ماسٹر ہو گیا ہوں۔“

”کیسا ماسٹر؟“

”ایسا ماسٹر کہ تم ایک پل کیلئے ادھر دیکھو تو تمھارے داتیں کان کا بندہ میرے ماتھے میں ہو گا۔ کیا مجال تین پتھر بھی چلنے دوں۔ ماتھے کی صفائی ہے؟“

”تم بہت بچی باتیں کر لیتے ہو۔ کیا ہے عمر تمھاری؟۔۔۔۔۔ پندرہ برس ہوگی؟“

”میں آٹھ نو برس کی عمر میں بھی ایسی ہی بچی باتیں کیا کرتا تھا۔ لڑکے کے لہجے کی سنجیدگی میں غمزگی کی جھلک پیدا ہونے لگی۔ بولا۔ ”غز بول کے پچھے پچھے نہیں ہوتے، وہ پیالشی بڑے ہوتے ہیں۔ وہ جملان نہیں ہوتے۔ جوانی شروع ہوتی ہے تو وہ مچا جاتے ہیں۔ پھر ان کی لاشیں چلتی پھرتی ہیں کسی طرف ہانک کے لے جاؤ۔۔۔۔۔ جو ہماری دنیا میں آ جاتے ہیں انہیں کوئی نہیں ہانک سکتا۔ وہ بادشاہ ہوتے ہیں جیسے کالٹے میں، تالے توڑتے ہیں اور مزے کرتے ہیں۔“

نازکی آنکھیں کھلتی جاری تھیں۔ لڑکا اس کی توقعات سے کہیں زیادہ پختہ ذہن کا تھا۔ وہ لڑکپن کی اس کچی عمر میں عمر رسیدہ اور جانبدار بڑھا لگ رہا تھا۔

”استاد جدی کسی کے ساتھ زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ لڑکا بڑا رہا تھا۔“ صرف میرے ساتھ باتیں کرتا ہے۔ وہ میری باتیں سنتا ہے اور اپنی سناتا ہے۔ ایک دن میری باتیں سن کر وہ رو پڑا تھا۔ پھر مجھے بھی رونانا گیا جب میں رونے لگا تو اس نے زور سے میرے منہ پر پتھر مارا اور کہنے لگا، سالے رو ڈالو کہیں ہے؟

.... پھر اُس نے مجھے سگریٹ میں چرس بھر دی اور کہا، لگا دم، مٹے غم۔

”ارے؟“۔۔۔۔۔ ناز نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”تم چرس بھی پیتے ہو؟“

”نہیں! چرس مجھے اچھی نہیں لگتی۔“

”شاباش!“

”میں شراب پیتا ہوں۔ لڑکا بولا۔ ”چرس کے ایک کش میں جو مزہ ہے وہ شراب کی پوری بوتل میں

”اس کا کچھ پتہ نہیں۔“ لڑکے نے کہا۔ ”تم جس وقت کوئی کھانا لے آؤ گے کھا کے مرے سے سو جانا۔ یہاں ہمیں کوئی نہیں چھیڑے گا۔“

”یہاں اور کوئی بھی آتا ہے؟۔۔۔۔۔ رات کو؟“

”ہاں! استاد کے تین اور ساتھی، مٹا، پیرو اور بادل۔ وہ ساتھ والے کمرے میں سو تے ہیں۔ شاید وہ ہنسنا پس آتیں گے اور تمہیں دھدکا لانے کے لیے آکاسیں گے لیکن تمہیں چھیڑیں گے نہیں۔ اس گھر میں استاد نہیں بر معاشی نہیں کرتے دیتا۔ وہ بر معاشی کے لیے کئی کئی کپے پاس چلے جاتے ہیں۔“

”گلی کون ہے؟“

”وہ بھی ہماری ٹیکسی ہے۔“ لڑکے نے جواب دیا۔ ”پرائیویٹ ہے لیکن اچھی چلتی ہے۔“

”سٹوب ناز نے ذرا جھنجھٹتے ہوئے پوچھا۔ ”ٹیکسی سیٹ اور پرائیویٹ کیا ہوتا ہے؟“

”یہ ساری رزائل ہوتی ہیں۔“ لڑکے نے چار پائی کے کونے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ٹیکسی اُسے کہتے ہیں جسے گا ہک اپنے ساتھ لے لے یا کلفٹن یا سیٹل پٹ یا بول یا اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ سیٹ وہ ہوتی ہے جس کے ساتھ اپنا ایک آدمی ہوتا ہے۔ وہ گھوم پھر کر گا ہک کو تلاش کرتی ہے اور پرائیویٹ بڑی قیمتی چیز ہوتی ہے۔ وہ دھندلاری طرح جران اور خوبصورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے اچھی اچھی قسم کے مستقل

گا ہک ہوتے ہیں۔ وہ اپنے گھر میں ہی رہتی ہے۔ کوٹھے پر نہیں ٹھہرتی۔ اسے بعض لوگ بہت سارا وہ پیہ لے کر رشوت کے طور پر کسی بڑے افسر کے پاس بھیجتے ہیں۔

ناز چپ چاپ سن رہی تھی۔ اُس کے جذبات میں انوکھا سا لرعاش پیدا ہو رہا تھا۔ لڑکا بڑا رہا تھا۔

”نظم پرائیویٹ بن جاؤ تو اچھا ہے۔ بالی پرائیویٹ ہے استاد اسکی بہت خاطر کرتا ہے۔۔۔۔۔ ایک لگانے والی ہوتی ہے، جیسے ہمارا ہی ہے۔ وہ سٹ راجتی کاتی ہے۔ اسی سے لے شمار کدنی ہو جاتی ہے۔“

لڑکا کسی عجائب گھر کے گائیڈ کی طرح بول رہا تھا اور ناز تصور دل میں ان عجائبات کو جیسے چھو چھو کر دیکھ رہی ہو لیکن اس کے اعصاب ان تصور دل کے تحمل نہیں ہو رہے تھے۔

”تم کب سے یہاں ہو؟“۔۔۔۔۔ ناز نے لڑکے کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”میں دس بارہ برس کا تھا جب استاد کے پاس آیا تھا۔“

”کیسے؟“

”گھر سے بھاگ آیا تھا۔“

”تمھارے مال باب میں؟“

”پتہ نہیں۔“ لڑکے نے اس طرح قہر سے جواب دیا جیسے جان پہچان کے بھولیوں کے متعلق رسمی باتیں کر رہا ہو۔ کہنے لگا۔ ”مال کو میرے باپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔“

”کیوں؟“

”میرے باپ کو غصہ بہت آتا تھا۔ پہلے تو اسے کبھی غصہ نہیں آیا تھا۔ وہ معلوم نہیں کون سے

دفع میں چلا پڑا تھا۔ ایک دن گھر آتا تو میری مال کو کہنے لگا میں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ مال نے پوچھا،

کیوں چھوڑ دی ہے نوکری؟ کہنے لگا۔ صاحب مال بس کی گالیاں دیتا ہے۔ مجھے تھوڑا سا سرکاری خزانے

سے ملتی ہے لیکن صاحب مجھے اپنے گھر کام کے لیے بھیج دیتا ہے۔ مال نے کہا کوئی اور نوکری کر لو۔

نہیں لیکن شراب مجھے اچھی لگتی ہے۔

”متیس مال باندھیں آتی ہے۔ ناز نے دیکھے ہوئے لمبے میں کہا۔

”یاد کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔“ لڑکے نے کہا۔ ”شروع شروع میں اُستاد جیلانے اُسے

تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ نہ ملی۔ اس نے کراچی کا کوئٹہ چھان مارا تھا۔

”وہ اُسے بھی طوائف بنانا چاہتا ہوگا۔“ ناز نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں۔“ لڑکے نے کہا۔ ”اُستاد مرے ہتھوں کو نہیں مارتا۔ اُسے جانتی نہیں بڑا اچھا آدمی ہے

اللہ قسم اس نے کہا تھا تم میری مال کو تلاش کر کے اُس کے ساتھ شادی کر لو اور میں تمہارا بیل بن جاؤں گا لیکن

مال ملی نہیں۔ اب تو میں نے اُسے بھلا دیا ہے۔۔۔ اُستاد ہی میرا سب کچھ ہے۔۔۔ مال بھی باپ بھی۔۔۔

”متاری مال خوبصورت تھی۔“ ناز نے بے اختیار سے لمبے میں پوچھا۔

”مال تو اچھی وہ تم سے زیادہ خوبصورت تھی۔“ متیس نے چاری زندہ ہے کہ نہیں۔“ لڑکا کہتے کہتے رک گیا

اور اُس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ناز نے بے اختیار سے کدھ سے پکڑا اپنی طرف کھینچ لیا اور بازوؤں میں بھینچ کر اُس کی پیشانی چوم لی۔

اُس کی باتیں ناز کے دل کی گھڑائیوں میں اُتر گئی تھیں۔ اُس نے لڑکے کو اور زیادہ زور سے بھینچا اور اُس کے

آنسو لڑکھک کر لڑکے کے گالوں پر جا پڑے اور لڑکے کے دآنسوؤں نے انہیں اپنے اندر جذب کر لیا۔

لڑکے کو ایک عرصے بعد ایک طویل عرصے بعد عورت کی گود کا لگا نصیب ہوا۔ اُس نے اپنے گول

گول گال ناز کے سینے کے ساتھ لگا دیئے اور خود فراموشی کے عالم میں وہ اپنا چہرہ اُس کے سینے میں چھپانے

لگا۔ اُسے قرعہ محسوس ہونے لگا جیسے چڑیا کے گرسے ہوئے بچے کو پھر سے گھونسلے میں رکھ دیا گیا ہو۔

ناز کے شباب سے بھرپور سینے میں اُس نے وہ لذت محسوس کی جو اُس کے سونپوں اور زبان میں،

لتنے سال گزر جانے کے بعد ابھی تک باقی تھی۔ وہی لذت، وہی ذائقہ آج بھی اُس کی سرعت سے زندہ ہو کر اُس

کی رگ رگ میں سما گیا۔ اُس پر خود سہری اور درافنگی طاری ہو گئی۔ اُس نے انھیں بند کر لیں اور وہ ماضی کے ماہ و سال

پھلانا لگا گیا۔

دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ دونوں کے سینوں میں سکیاں اور پچھلیاں ٹپ رہی تھیں۔

چھت کے جانے شام کے پھیلنے ہوئے اندھیرے میں گم ہو رہے تھے۔ ایک بچہ ایک عورت

کی گود میں مال کی مانتا میں گم ہو رہا تھا۔ ایک عورت ایک بچے کو گود میں لیے مال کے روپ میں گم ہو رہی تھی۔

کراچی کا ایک اور دن ایک اور رات میں گم ہو گیا۔

لڑکا ایک عرصے سے نہیں روایا تھا۔ اُس پر میں دور دنیا کا طلسم طاری تھا مگر آج ایک عورت کے

سینے کی پیش سے طلسم ٹوٹ گیا۔ لڑکا جردیا تو اُس سے محسوس ہوا جیسے وہ جانے لگتی لمبی مسافت طے کر کے شمل

ہو گیا ہو اور وہ اُس مال کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو جس کے متعلق اُس نے کہا تھا کہ اسے بھول چکا ہے۔ اُنسو

اس کے تھکے ہوئے اعضا کو سہلا رہے تھے۔

ناز گیارہ دنوں سے دور رہی تھی۔ سراسر اُنسو انگارہ بن کر نکلتا تھا اور گالوں کو جلاتا رہتا تھا لیکن آج کے

رونے میں اُسے روحانی قرار نصیب ہوا۔ وہ لڑکے کو شاید رات بھر سینے سے لگاتے روئی ہی رہی لیکن لڑکا

حباب بیداری سے جاگ اٹھا اور ناز کی گود سے الگ ہو گیا۔

گھر سے میں گھپ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ لڑکے نے جیسے جیسے چائے نکالی۔ جلائی اور لالٹین کو روشن کر کے

ناز کی طرف دیکھے یا کوئی بات کہے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ ناز اٹھ کر گھر سے میں ٹپکنے لگی۔

کچھ دیر بعد لڑکا لکھانے آیا۔ ناز کھانے پر بیٹھ گئی۔ لڑکا نہ بیٹھا۔ ناز نے اسے کھانے کے لیے

کہا لیکن وہ نہ مانا۔

”ہم سب بوتل میں کھانا کھاتے ہیں۔“ لڑکے نے کہا۔ ”اُستاد ہر مہینے بل ادا کر دیتا ہے۔“

لیکن ناز نے اصرار کر کے اُسے اپنے ساتھ لٹھا ہی لیا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ناز چارپائی پر لیٹی خیالوں کے تانے بانے تن رہی تھی۔ اس کی نگاہیں چھت

کے جالوں میں کبھی ہوئی تھیں۔ لڑکا اسی مکان کے نہ جانے کون سے گھر سے میں جا کر سو گیا تھا۔

ناز کے گھر سے کا دروازہ کھلا۔ وہ اٹھ بیٹھتی تھی جیلا ہو گا لیکن وہ ٹپ رہا تھا۔

ٹپ ٹپ ٹپ چھپ چھپ برس کی عورت کا آدمی تھا۔ سر نہیں سے منڈھا ہوا، چہرہ سترست اور گول جسم بھرا پھر اُقدت

اور چال ڈھال سے فط ہال کا کھلاڑی معلوم ہوتا تھا۔ انھیں چھوٹی چھوٹی جس میں بڑے بڑے فتنے اور ہنگامے

چمک رہے تھے۔ وہ چڑچڑاہو لدا ریشٹ اور پاجامہ نہایتوں پہنے ہوئے تھا۔ دنا بھی انہی پٹوں میں تھا۔

ناز اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ اُس نے اسے پہلی بار اس گھر سے میں دیکھا تھا جس میں جیلا اُسے چھوڑ

آیا تھا۔ اس کو مل ٹول جیٹھی نے ناز کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ ناز نے اسے درندے اور وحشی ہی کے

روپ میں دیکھا تھا۔

آج رات جب وہ گھر سے میں آیا تو ناز کو پہلا صدمہ یہ ہوا کہ وہ جیلا نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ ٹپ رہا تھا۔

اُسے دیکھتے ہی ناز کے انگ انگ میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ دل ڈوبنے لگا۔ ٹپ کے ناز کے دھلے

ڈھلا تے چمکتے ہوئے بالوں اور چہرے مہرے کو دیکھا تو زیر لب سکرایا۔ اس کے ریشمی پٹوں پر نگاہ ڈالی تو اُس

کی نگاہیں مٹلیں سے پھلتی ناز کے پاؤں پر جا پڑیں جن کے ناخنوں سے نیل پالش بالکل جی دھل چکی تھی ناخنوں کا

قدتی گلابی رنگ نکھرایا تھا۔

”تمہارے استاد نے کہا ہے کہ اب تمہیں کوئی پریشان نہیں کرے گا۔“ ناز نے خوف زدہ رعب سے

کہا۔ ”تم نے مجھے ہاتھ لگا باتوں میں تمہارے استاد کو بتا دوں گی۔ اُس نے کہا تھا مجھے بتانا۔“

”ناز!۔“ ٹپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”استاد کا رعب دینے کی ضرورت نہیں تمہیں کوئی ہاتھ

نہیں لگاتے گا۔ وہ وقت کی گاراجب میں نے تمہیں پریشان کیا تھا۔“

ناز کا خوف دور ہوئے لگا۔

”اُستاد نے تمہیں بتا دیا ہو گا کہ تمہیں آزار نہیں کیا جائے گا۔“ ٹپ نے والیہ انداز میں کہا، پھر لولا۔

مجھے تمہارے اس خوبصورت جسم اور اس قدر حسین اور مہم جوہر سے ہمدردی ہے تمہارے پریشانی ہاں!

ان کی قیمت ہم سے پوچھو ناز! ہم موتیوں کے بیواری ہیں تم تو میرا ہو۔۔۔ مان جاؤ ناز! ہم تمہیں بھول کی طرح نہیں

گے تمہارے قدموں میں قالین پھانیں گے تم راہی بنی رہو گی۔ صرف اتنی ہی بات ہے کہ ہر رات صرف ایک

آدمی کو خوش کر دیا کرو۔ ہماری بڑھیا تمہیں ایسے ایسے گڑبٹا دے گی کہ تمہیں ذرہ بھر رحمت نہ ہوگی۔ گاہک تمہارے

قدموں میں سر کریں گے۔ وہ تمہیں کارنیشن کریں گے۔ سوئے کے مادیوں کے تمہارے قدموں میں دولت

لٹا تیس گے۔ سو سونا زبلوریاں کریں گے، اور تم محبت کا دھوکہ بن کر صرف ناک کھیلو گی.... اس جوانی سے فائدہ اٹھا لو نازا کچھ دن کھل کھلو۔ دولت؟ مٹی چاہو سیٹ لو۔
 طبعی طور پر انماز میں لوٹنا جا رہا تھا اور نازا اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ آج ٹیپو کلب لہجہ کو سخت نہیں تھا۔ اس کی باتوں میں اذیت اور تشدد کی ہونک نہیں تھی۔ نازا اس لہجے میں اپنائیت کی نمایاں جھلک محسوس کر رہی تھی مگر وہ کچھ بڑبڑاتا تھا، اس کے وہ بیزار ہوتی جاتی تھی۔

”تمہاری گلابی نشانی پر بھروسے ہوئے پچھوٹے چھوٹے بال خدا کی قسم بڑے بڑے لیڈروں اور فزروں کو کھینچ کر تمہارے سامنے لے آتیں گے۔“ ٹیپو بڑبڑاتا تھا۔ ”میں نے ان کی نگاہیں کبھی نہیں دیکھی۔ وہ تمہارے پاؤں کی خاک بھی نہیں۔ وہ ایک دوسرے کی نگاہوں کے ساتھ دل بہلاتے رہتے ہیں.... نازا تم ان سب چوکوتہ کر دو گی۔ ہم تمہارے حسن سے ایک ملک خریدیں گے۔ تمہاری جوانی کی خاطر لاکھوں روپے کمایں گے۔ کوئی کہتا ہے ہم تمہیں ریلوی بنائے گا۔ کھٹے پر بٹھائیں گے؟ ہم تمہارے اس حسن اور جوانی کو پامال نہیں ہونے دیں گے۔ تمہاری ایک نظر سے ہتھکڑیاں لوٹ جائیں گی۔ قانون بے بس ہو جائے گا۔ پچھائی کے چند سے لوٹ جائیں گے۔ اتنا دھیا نہیں سہرا نکھوں پر بٹھائے گا۔“

نازہ جانے کہاں کھو گئی۔ کارول کے تصور میں یا دولت کی چمک میں۔ اپنے حسن اور جوانی کی توقع میں یا اپنی بے بسی میں۔ جیسا کہ سہرا نکھوں پر بٹھانے کے خیال میں باجائے کہاں! اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ لڑیو حاکم کا ہے۔ صرف کوئی تھی اس کی باتوں کی جو محبت کے حوالوں میں ابھی ہوئی جھنجھنارہ تھی۔
 نازا کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ لیٹ گئی ہے اور اس کی آنکھ لگ گئی ہے۔

دوسرے دن اس کے لیے ایک اور موٹ اور شیون کا دو پٹر کیا چھت کے جا لے صاف ہو گئے دیواروں سے گرو جھاڑ دی گئی۔ فرش پر جانے کتنے عرصے بعد پہلی بار جھاڑو دیا گیا اور میز پر لائٹیں کے ساتھ ایک ٹائم پیس رکھ دی گئی جو نازا کے مقبضہ دل کی طرح کمرے کی جھالی بھونکی ہوئی وحشت میں ایک ٹھکانے کی طرح رہتی تھی۔ نازا کے ننھے مائندہ اعصاب ٹھکانے پر آنے لگے۔ دن کا کھیل پھر تھا۔ وہ کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ اسے باہر کی طرف کھنسنے والی کھڑکی کھولنے کا خیال آیا۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کھلی۔ کھڑکی کی دوسری طرف پاؤں کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ زادور سے گزرتی ہوئی کارول کے زناٹے، وکٹوریہ کے گھوڑوں کی ٹاپ ٹپ بسوں کا دایلا اور موٹر نشانوں کی بے لگم چٹا چٹ سنائی دے رہی تھی۔ آزاد دنیا اور اس زناں میں لکڑی کے صرف دو کوڑا حائل تھے۔ آزاد دنیا کی گناہی اسے جیسے بلارہی تھی۔ قید، تمنا کی اور اذیت اسے باہر کو پھیل رہی تھی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی انگلیوں نے لوہے کی چٹینی پر چھتا ہے جو تے جا لے کو محسوس کیا، پھر انگلیوں نے چٹینی تھام لی، پھر جیسے اس میں سے ہلکی سی آواز آئی ہو:

”اسے نہ کھولنا نازا“

وہ لیول چمک اٹھی جیسے چوری چھپے مٹی کھاتے کیسے کو باپ نے ٹائٹ دیا ہو۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ دروازے میں کھٹکھٹا تھا۔

”مٹا جیلا کا دست راست تھا، عمر تیس چالیس کے درمیان۔ مینے میں ایک بار ڈالھی مٹا لیا تھا۔“

آنکھیں چرس اور افیون کے نشے سے پڑھی ہوئی لال سرخ اور ان میں خمدار لودھو سے تھے۔ دانٹوں کا رنگ گہرا بادامی تھا، چہرہ پرمردہ جسم دہلا اور کندھے ذرا آگے کو جھکے ہوئے۔ بال بکھرے ہوئے، جانے کب سے نہیں کٹوائے تھے۔ خود خال کی زردی میں سمیت ناک کی نیکی تھی۔
 نازا کا تھکا رک گیا، چھٹوٹی سے ہٹ آیا۔ اس نے گھوم کر مٹے کو دیکھا تو کھسپائی سی ہوئی۔ ”بند خمرے میں طبیعت گھبرا رہی تھی۔“

”اُس نے کہاں سے بھی یہ کھڑکی کھولنے سے منع کر رکھا ہے۔“

”اُس طرف کیا ہے؟“

”وہ دنیا ہے اُس طرف جہاں اب تم نہیں جا سکو گی.... ہماری بات مان جاؤ نازا! ہم تمہیں ایسی کھڑکی میں بٹھائیں گے جس کے ساتھ ریشمی پردے لٹکے ہوں گے اور تم رانی بن کر چٹوٹی۔“ مٹا بڑبڑاتا تھا۔ ”جیسا جیسا ستارہ ہیں ہمیں نہیں ملے گا۔ اپنی دنیا کا دیتا ہے.... راہ پر آجاؤ.... عیش کرو گی۔“
 ریلوی بن جاؤں؟۔ نازا نے طنز اُلوچھا۔

”رہی نہیں، پرائیویٹ۔ کوئی جلدی نہیں، سوچ لو۔ اطمینان سے سوچو۔“

”میں سوچ چکی ہوں۔“

”کیا؟“

”میں اپنا جسم نہیں بیچوں گی۔“

”تم نے بہت تکلیفیں اٹھاتی ہیں نازا! پھر سوچ لینا۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں.... کہو تو چھوڑو! تمہارے پڑھنے کے لیے کوئی کتاب رسالہ لے آئے؟“

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“

”جھانکنے کی صحت سوچنا تم کو اچھی کے گلی کوچوں سے واقف نہیں اور ہم یہاں کی اینٹ اینٹ کو جانتے ہیں میں تمہیں دیکھتی نہیں دے رہا نازا! ہم تو بول پالیتے ہیں.... کسی تھانے میں جا بیٹھو۔ پل بھر میں اٹھالائیں گے۔ اتنے ہم لڑا کا جائے لے آجا۔ ننھے نے ٹرے میں رکھے ایک کو کچھا، اٹھایا اور کھٹکا اور کوکڑا

”کو بولا۔“ سونے کے پتے ایک ایک دھاں نہیں دیکھا تھا؟ سوکھ ڈرا اسے؟ دس روز کا بارنا معلوم ہوتا ہے۔ واپس لے جا اسے اور اس کو مزاد سے سے کہہ کہ آئندہ ایسی چیزیں بھیجیں تو ایک پیسہ نہیں ملے گا.... جھاک آنا کہ ایک لے آئے.... لڑکا جانے لگا تو مٹے لے آئے۔ کما۔“ اور اس نے ٹھل کے سامنے ہاتھ ٹال پئے! دھاں سے دس بارہ رسالے لے آئے۔“

”پیسے؟“

”میں دسے آؤں گا۔“

مٹا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نازا کو اس خیال سے راحت ہوتی تھا اب مٹے جیسا درد نہ بھی اس کی نازدار باں کو نہ لگا ہے۔ یہ وہی مٹا تھا جس نے ٹیپو اور بادل کے ساتھ نازا کے جسم کو کیا کیا اذیت نہ دی تھی۔ لیکن مٹے کے آج کے سلوک سے نازا اپنے آپ پر بھی بھروسہ کرنے لگی مگر وہ یہ نہ جان سکتی تھی کہ اب اس کے ذہن اور سوچ پر قبضہ کر رہے ہیں۔

چائے آئی اور ناز نے پی لی۔ اس کے سامنے فلمی رسالوں کا انبار بڑا تھا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ جیدانہ آیا۔ رات گزرتی۔ دن بھی گزر گیا۔ ناز اسی کمرے میں ٹھکتی رہی، فلمی رسالے پڑھتی رہی، سوتی رہی جھانگتی رہی خواب کھیتی رہی۔ کچھ سوتے کچھ جاگتے۔

مٹیا، بیپو اور بادل وقتاً فوقتاً اپنے مخصوص ڈرامائی اور کاروباری انداز میں اسے صحن اور جوائی سے دولت کمانے پر اکساتے رہے۔

لڑکا اس کی خاطر داری میں مصروف رہا۔ ناز جیدا کا پوچھتی رہی، انتظار کرتی رہی، کمرے میں گھومتی رہی۔ دس دن اور دس راتیں بیت گئیں۔

ان دس دنوں اور دس راتوں میں ناز نے وہ تمام رسالے پڑھ ڈالے جو مٹنے نے اس کے لیے منگوائے تھے۔ ان میں زیادہ تر فلمی رسالے تھے اور تین چار ایسے بھی تھے جن کا فلمی دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا لیکن ان کی ہر کمانی چلتی پھرتی فلم تھی۔ جرم و جاسوسی اور لڑائی مار کمانی کی جملہ عشق و محبت کی فلم۔ الفاظ میں منظر اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ دہن کے پردے پر ہر اکیشن نظر آئے لگتا تھا۔

ان کمانیوں میں ناز نے اپنے آپ کو دیکھا، اپنے زور پرست اور نالیش پسند بھائیوں کو بھی دیکھا جو اس پر گزری تھی، وہ اس نے کئی ایک کمانیوں میں پڑھی۔ اس نے رسالوں میں فلمی دنیا کو دیکھا جس میں اسے کوئی قیامت نظر نہ آئی۔ یہ دنیا اس کے لیے حسین تھی۔ جیدا کے اس قید خانے میں آتے ہی ایسے فلمی دنیا سے نفرت ہو گئی تھی کہ فلمی رسالوں نے اس نفرت کو محبت میں بدل دیا۔

غیر فلمی رسالوں میں جرم اور گناہ کو، عشق اور محبت کو جن عریاں اور مسخوکر دینے والے الفاظ میں بیان کیا گیا تھا، انہوں نے ناز کے ضمیر سے گناہ کا بوجھ اٹھا دیا۔ اسے اپنے وجود سے جکھن آنے لگی تھی، وہ تم ہو گئی۔ اس کے دل میں جیدا، تھے، بیپو اور بادل کا جو خوف تھا، وہ نکل گیا۔ اسے جرم بھی اچھا لگنے لگا اور جرم کرنے والے بھی اچھے لگنے لگے۔ جیدا اچھے سلوک کی وجہ سے اسے پہلے ہی اچھا لگنے لگا تھا، اب وہ جیدا کے انتظار میں بیتاب ہونے لگی۔

اس کے لیے یہ رسالے مٹنے نے اس لیے منگوائے تھے کہ پڑھی لکھی لڑکی ہے، اس کا دل پہلا رہے گا اور فرار کی نہیں سوچے گی۔ مٹنا خود ان پڑھ تھا۔ اس نے برین واشنگ جیسی اصطلاح کبھی نہیں سنی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ کسی کو اپنی راہ پر چلانے کے لیے تشدد کے سوا کوئی اور طریقہ بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ رسالے، ان کی تصویریں اور ان کی کمانیاں مٹنے کے ارادے کے بغیر ہی ناز کی برین واشنگ کر رہی تھیں۔ مٹنے کو اور ناز کو معلوم نہیں تھا کہ یہ رسالے شریف گھرانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک دوسرے کے پیچھے جرم و گناہ کی زمین دور لیتی ہیں اور ہر مرد و عورت کی دنیا میں کشاں کشاں لیے آ رہے ہیں، اور جو عملاً ادھر نہیں آتے وہ تصوروں میں ان فحش اور اخلاق سوز کمانیوں کے کردار بن گئے ہیں۔

ناز کا چھتاوا اور احساسِ مذمت ختم ہو گیا۔

گیا رجبوں رات اُدھی لگزرتی تھی۔ ناز کی آنکھ کھلی۔ جیدا نے کواڑ تو آہستہ سے کھولا تھا لیکن اندھیرے میں کسی چیز سے ٹھوکر لگ گئی تھی جس سے ناز جاگ اٹھی۔

”کون؟“

”تم جاگ رہی ہو؟“

ناز جیدا کی آواز سن کر اٹھ بیٹھی۔

”تم آگے؟“

”میں دوسرے کمرے میں سوتی گئی۔“ جیدا نے اندھیرے میں دو قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا اور پوچھا۔ ”کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

”بتی جلاوٹ۔ ناز نے بے تکلفی سے کہا۔

کمرہ دیلا سلاتی سے روشن ہو گیا پھر لائٹیں جل اٹھی۔

ناز نے جیلا کو دکھاتا ہوا سے تنک ہوا جیسے کوئی اور ہے۔ داڑھی بڑھی ہوئی اور آنکھیں جیسے اتنی باتیں بند ہی نہیں ہوئی تھیں قبض پٹیس سے پھٹی ہوئی تھی۔ بال بڑھے ہوئے اور گرد آلود تھے۔ چہرے کی لٹس لٹس میں شب بیداری کے آثار تھے۔ اس کی باتوں میں بھی تکان تھی۔

ناز اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی۔ ”یہاں سو جاؤ۔ میں فرش پر سو جاؤں گی۔“

”نہیں۔“ جیلا نے جہاں لے کر کہا۔ ”دوسرے کمرے میں میرا بستر بچھا ہوا ہے تم سو جاؤ۔“

اور پوچھا۔ ”یہ دن کیسے گزرے؟“

”اچھے گزرے۔“

”اچھا سو جاؤ۔“ جیلا دوسرے کمرے کی طرف جانے لگا

ناز نے اُسے روک لیا۔

”یہیں سو جاؤ... چارپائی پر۔“ ناز نے کہا۔ ”میں فرش پر سو جاؤں گی۔“

جیلا دوسرے کمرے سے اپنا بستر اٹھا لیا اور فرش پر بچھا لے جوتے لولا۔ ”میں یہیں سو جاؤں گی۔“

ناز اس کے بستر پر جا کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”یہاں میں سوؤں گی تم چارپائی پر سو جاؤ۔“

جیلا نے اس کی طرف دیکھا اور اُسے بازوؤں پر اٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا۔

یوں تو ناز مرد کے جسم کی لذت سے اچھی طرح واقف تھی لیکن جیلا نے اسے بازوؤں پر اٹھا یا تو اسے

ایسی راحت محسوس ہوئی جو اسے ہندب سوسائٹی کے مرد نہیں دے سکے تھے حالانکہ وہ خوش پوش اور

خوش وضع لوگ تھے اور جیلا دس بارہ دنوں سے نہایا نہیں تھا۔ اُس کے جسم سے پسینے کی بدبو آ رہی تھی۔ وہ

جس اور شراب بھی پیتے ہوئے تھا۔ وہ بے لطف تھا۔

ناز جیلا کو اور زیادہ قریب سے دیکھتی تو اسے ایک اور کچھ محسوس ہوئی۔ ایک انسان کے خون کی بو متھنوں

کے خون کی بو۔ اس خون کے قطرے جیلا کے خنجر پر جمے ہوئے تھے اور خنجر اُس کی پٹلی میں قبض

کے نیچے اڑسا ہوا تھا۔

بتی بچھ گئی۔ ناز نے اندھیرے میں جیلا کے قدموں کی آہٹ سنی اور فرش پر بچھے ہوئے بستر میں

لیٹنے کی آواز بھی سنی۔ وہ اُس کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی تھی مگر سوچ رہی تھی کیا بات کرے۔

”تم اتنے دن کمالا رہے؟“ ناز نے آخر پوچھ ہی لیا۔

کوئی جواب نہ ملا۔

”سو گئے؟“

خاموشی۔

”جیلا“

وہ گہری نیند سوچکا تھا۔ اُس کا جسم اور مایع سدھاتے ہوئے جانور کی طرح اُس کے اشاروں پر

چلتے تھے۔ لیٹتے ہی سو جاتا تھا، جاکتا تھا تو کبھی اتنی جاگتا ہی رہتا تھا۔ وہ لفظ لات اور پریشانیوں سے

آزاد تھا۔ اُسے نہ لگاتی اور ملاوٹ کا کوئی غم نہیں تھا۔ اس کی کوئی بڑی نہیں تھی اس کے سامنے کسی نہ

کو سکول یا کالج میں داخل کرانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، اس لیے اُسے نہ سفارش کی ضرورت تھی نہ رشوت

دینے کی۔ اُسے ایسا بھی کوئی غم نہیں تھا کہ اس کا بچہ بیمار ہو جائے گا تو ڈاکٹر کو پیسے کہاں سے دے گا۔

وہ لڑا تھا۔ اُسے لٹ جانے کا غم نہیں تھا۔ وہ جیب کپڑا تھا۔ اُسے جیب کٹ جانے کا ڈر نہیں تھا۔ قانون

نفسن تھا۔ اُسے پولیس کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ اُس کا ذہن آزاد تھا اس لیے سندس کی غلام تھی وہ عاشق سے

کانشیت اور عزت و فخر و ہونا تو مسائل اور پریشانیوں اسے سونے نہ دیتیں۔

ناز کے خیالات اندھیرے میں بھٹکنے لگے۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ اس خطرناک غنڈے سے کیوں بھلتی

جا رہی ہے؟ اُس نے چاہا کہ اس کے اور اپنے درمیان دیوار حال کر دے لیکن اس کے اندر کوئی ایسی

کمزوری پرورش پا رہی تھی جس کے ہاتھوں وہ بے بس ہوئی جا رہی تھی۔ کوئی جذبہ اسے جیلا میں گھل مل جانے

پر اکسارہا تھا جیسے جیلا اسے اس غار سے نکال کے گھر پہنچا دے گا۔

ناز سوچتے سوچتے سو گئی۔

ات گزر گئی۔

پچھلے شمار میں گزرتیں جن کا وہ حساب نہ کر سکی۔ اسی کمرے میں بند رہی۔ اُس کا طویل ترین سفر

کمرے سے نکلنے کا تھا۔ وہاں سے کمرے تک پہنچنا تھا کمرے میں ٹہل لیتی تھی یا بارآمد سے میں

گھوم پھرتی تھی۔

بابر کی طرف بھٹکنے والی کھال کی ہمیشہ بند رہی۔ ناز کو کبھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ اُسے کھولے۔ رسالے آتے

رہے۔ اچھے اور متن کھانے آتے رہے، نئے نئے سوٹ اور سینڈل آتے رہے۔ مٹا پٹو اور بادل لے

باتوں باتوں میں اپنے ڈھب پر لانے کے جتن کرتے رہے۔

اس عرصے میں اُس کسی نے کوئی سختی نہ کی بلکہ جیلا کے یونین ساتھی اور چھوڑا اس کے سامنے یوں

جھکے جھکے رہتے جیسے ناز ملکہ ہو اور وہ اس کے دربار کے غلام ہوں۔ گاہے وہ تنکمانہ لہجے میں بھی بول اٹھتی تھی۔

ایسے میں مٹا پٹو اور بادل اور زیادہ فمدوی بن جاتے تھے۔

ناز کے کردار کی بنیادیں تو پہلے ہی کچی تھیں۔ اب تین چار غنڈوں نے اس پر حاکمیت کا نشہ طاری کر دیا۔

تو عمارت ڈولنے لگی جو کسر رہ گئی تھی وہ فلمی رسالے، جرم و جاسوسی کے ناول اور افسانے پوری کر رہے

تھے۔ ناز بے ہال و پرالنے لگی اور وہ پتھر کے کوہی سارا جہاں بٹھنے لگی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی سوچ نہ

سکی کہ ایسے سلوک سے اُسے آہستہ آہستہ بیٹا ناز کی جگہ ملے گا۔

اس دوران جیلا کبھی اس کمرے میں سوتا کبھی اٹھ کھڑا کھڑا روز غائب رہتا۔ وہ جب ناز کے پاس جوتا

تو زیادہ دیر خاموش ہی رہتا۔ ناز بات کرتی وہ سن لیتا اور مختصر سا جواب دے دیتا تھا۔

ناز نے دو تین بار اُس سے اسلم کے متعلق پوچھا کہ اُس سے کچھ بھی ملاقات ہوئی ہے یا نہیں تو جیلا

نے ٹال دیا۔ اُس نے ناز کو یہ بھی نہ بتایا کہ اس عرصے میں اسلم پر اُس کی بلیک میلنگ کا پہلا کامیاب حملہ ہو چکا

ہے اور ناز کا خواہ چھپاتے رکھنے کے عوض اس سے باج سوروپے وصول کیے جا چکے ہیں جیلا نے

ناز سے اُس کے خاندان کے متعلق کوئی بات نہ پوچھی۔ اس نے ناز کو یہ بھی نہ بتایا کہ وہ اس کے متعلق اور اس

کے بھائیوں کی بے راہروی کے متعلق سب کچھ جانتا ہے۔

ایک بار ناز نے جیڑا سے کہا — ”اب لو اس قدر سے جی الما کیا ہے۔ ایک بار باہر بی سیر لالہ آیا ہے پھر جی دکھا دو میں جھاگوں گی نہیں۔“

”ابھی نہیں۔“ جیڑا نے کہا۔ ”تمہارے لیے ایک کاروباری ماں کا انتظار کر رہی ہے۔“

جیڑا کا رویہ ناز کے لیے عمدہ بنا رہا۔ وہ رات کو جب آتا تو مین کی دراز سے اُتر کر نکلتا۔ اسے لٹ پٹ کرتا چھوڑ کر کھینچ کر اور کرتا۔ ناز کو معلوم تھا کہ جیڑا جیب کھڑا ہے، ڈاکو ہے، خوبی ہے مگر اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ اسی مکان کے ایک حصے میں جیڑا نوے لاکھوں کو چوری، اٹھائی تیرہی اور جیب تراشی کے داؤ پیچ سکھایا کرتا ہے۔

وہ جانتی تھی کہ جیڑا اخلاقی قدروں اور قانون سے آزاد انسان ہے لیکن یہ احساس اُس کے دل میں پختہ ہونا چاہیے کہ اُس کی ذات کے لیے جیڑا کے دل میں ہمدردی ضرور ہے جیڑا پراسرار آدمی تھا لیکن اس میں وہ ایک شش محسوس کرتی تھی۔ یکیش بھی اُس کے لیے پراسرار تھی۔

اس عرصے میں ناز کے گرد و پیش میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہ ہوئی مگر وہ اپنے آپ میں ایسی تبدیلی محسوس کرنے لگی جسے وہ پسند بھی کرتی تھی، نا پسند بھی، جس میں لذت بھی تھی تمہی بھی، خواہ مخواہ کرب بھی۔ وہ ہمت کرتی تو وہ کسی بھی وقت کھڑکی کھول کر اس کمرے سے بھاگ سکتی تھی۔ اس کے دل میں دو ایک بار ایسا خیال آیا لیکن اُس نے ایسی ہمت کبھی نہ کی جب بھی اس کے دماغ میں یہ خیال آیا اس کی اپنی ہی مصیبت متبتی سے آواز آتی — ”اُسے نہ کھولنا ناز! — اور وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی اور یوں کمرے میں ہرگز دیکھنے لگی جیسے یہ شے کی آواز ہو۔“

بند کمرے کی تسمانی نے اُسے کیا کیا یاد نہ دلایا کیسی بھولی بھری کہانیاں نہ سنائیں جیڑا کے ہاتھ آئے سے پہلے کی کہانیاں، اس سے پہلے کی باتیں، اس سے بھی پہلے کی داستانیں۔ وہ بے فکر سا لیکن وہ معصوم سا لڑکپن، وہ جوانی کی قیامت خیزیاں، بھائیوں کی غمراہی، چاہنے والوں کے تحفے کچھ عمر میں ہی پختہ عشق بازی، خود فریبیاں، فحش، تصنع اور اسے سب کچھ یاد آیا۔

ایک وہ کمرہ کُرس کے بھائیوں نے اُسے برقعے سے نکالا تھا اور ایک لڑکھوہ ایک غنڈے کے کمرے میں ٹھہری طوائف بننے کا انتظار کر رہی تھی۔ ان دو لمحات میں تھوڑا سا عرصہ حال تھا لیکن۔ یوں جیسے افق پر دو جیسے ایک اس کنارے ایک اُس کنارے، ایک مشرق میں ایک مغرب میں — مشرق مغرب کی کشمکش نے اسے کہاں لایا پھینکا۔

اُسے اطمینان بھی یاد آیا لیکن سر جھٹک کر اُس کی یاد دوا گل دیا۔ اُس نے جب بھی گھر کی سوچی تو جھینپ گئی۔ رسوائی نے اُسے قید بننے پر مجبور کیا اور اس احساس نے اسے سو سو آنسو لالہ اب وہ آزاد بھی ہو گئی تو دنیا کا سامنا نہ کر سکے گی۔ وہ گھر سے بھاگ بیٹھتی ہے۔ سب جانتے ہیں۔ سو سائی میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ اب اس کے لیے ایک ہی جگہ ہے — اور ناز اس جگہ ٹھہری ہوئی تھی۔

بعض اوقات اُس کی ذہنی کیفیت پناہ گزین کی سی ہوجاتی تھی۔ ایسے میں جیڑا کا خیال اُسے پناہ میں لے لیا کرتا لیکن یہ پناہ بھی تو غیر یقینی تھی۔

جیڑا میرپس مارکیٹ میں چلا جا رہا تھا۔ قدموں میں ہلاکی تیزی تھی۔ فٹ پاتھ پر لوگوں کی جھجک کو چرتا جا رہا تھا۔ چہرے پر انوکھی سی پرچھائیاں، پیشانی پر جھارت و نفرت کی شکنیں، غم و غل میں بربریت اور تشدد آنکھوں میں انسان دشمنی کا چمکتا جوا تاخر جیسے میں جلتی ہوئی آگ کا پتہ دیتا تھا۔ پاؤں میں جکڑے ہاتھوں میں بے چینی، ہونٹوں پر پراسرار سا تبسم — یہ اُس کا اصلی روپ تھا لیکن آج وہ سہرا بھرا تھا۔

تین چار سینے ٹھڑے اُسے اطلاع ملی تھی کہ کراچی کی ایک نئی کالونی کے ایک عظیم الشان بینک میں

بیس ہزار کی مالیت کا گھر ہے اور ایک نوجوان لڑکی بھی ہے۔ شہتی نے ایک شش قیمت ہار کی فوٹاش کی تھی اس کے علاوہ پنجاب کے ایک استاد بدہ فروش نے اُسے اس لڑکی کے لیے کہا تھا اور پندرہ ہزار پر سودا طے ہو گیا تھا۔

ہر چوری کیا جاسکتی تھی لیکن لڑکی کو ایک میڈروں اور نو سہاراؤں کے ذریعے نکالنا آسان نہ تھا کیونکہ ہنگے والے اونچی سوسائٹی کے لوگ تھے جن کا اٹھنا بیٹھنا میزوں و زیریں میں تھا۔ لڑکی کے ساتھ میں جل پیدا کرنا ناممکن تھا۔ جیڑا نے اُس کے ساتھ لڑکی کو بھی اٹھا لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

یہ ہنگامہ عام چوری، لقب یاد اُس کے لیے موزوں نہیں تھا۔ وہاں کسی گھر بھیدی کی ضرورت تھی جیڑا نے ایک آدمی کو جس کا نام اُن تھا، اس ہنگامے میں ملازم کر دیا تھا اور اسے تمام ہدایات و سہ دی تھیں اُس کا پروگرام تھا کہ لڑکی اور لڑکا تیار و موزوں وقت بتلائے گا اور چوری یا دقت کے متعلق زمین سمجھا کرے گا اُن دنوں تین سینے ملازم رہا تھا اور کوئی تین روز ہوئے اُس نے اطلاع دی تھی کہ ہار کہاں پڑا رہتا ہے اور لڑکی کون سے کمرے میں سوئی ہے۔ اُن نے واردات سے متعلق تمام تفصیلات بتائی تھیں۔ اندھا جانے اور بھاگنے کے راستے بھی بتا دیئے تھے۔ جیڑا خود نہ جاسکا تھا، اُس نے اپنے تین آدمی یاٹکی میں اس کام کے لیے بھیج دیئے تھے۔

جیڑا کے آدمی اسی رات کو ہار والے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے سیف کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ دروں کے پیچھے سے چار پولیس کانسٹیبل ایک سب انسپکٹر پولیس اور ہنگامہ کالنگ آئے تھے اور تینوں آدمی گرفتار ہو گئے تھے۔ اُن کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جیڑا ذرہ بھر حیران یا پریشان نہیں ہوا تھا جرم و جیل ہی تو اُس کی زندگی تھی۔ اسے کسی قسم کا غم نہ تھا لیکن تین روز بعد جیڑا کو معلوم ہوا کہ اُن وعدہ معاف گواہ بن گیا ہے تو وہ آگ بگولا ہو گیا تھا۔

جیڑا دنوں سے کھینا خوب جانتا تھا۔ صفائی کے جھوٹے گواہوں کا ایک گروہ اس کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا جو استغاثہ کی عمر توڑ دیا کرتا تھا۔ سرکاری وکیل اور استغاثہ کے اہم گواہوں کے لیے اُس کے پاس دولت تھی۔ بالی اور گلی بھی نہیں شہتی اور کلنا بھی نہیں۔ استغاثہ کے گواہوں کو منحرف کرنا اس کے لیے مشکل نہ تھا لیکن وعدہ معاف گواہ کی صورت میں جو پیچیدگی پیدا ہوجاتی ہے وہ اس سے بھی آگاہ تھا۔ اُن کا استغاثہ کے ساتھ مل جانا اس کی براہ راست سے باہر تھا۔ پولیس نے اُن کو ضمانت پر رہا کر دیا تھا اور باقی آدمیوں کی ضمانت نامہ منظور ہو چکی تھی۔

جیڑا متعلقہ پولیس انسپکٹر سے ملا اور اُسے کیس کو گول کرنے کو کہا۔ انسپکٹر نے اُسے بتلادیا تھا — ”متم جانتے ہو وہ ہنگامہ کس کا ہے؟ بعض دزیراس کے زعفرانی ہیں۔ وہ بین الاقوامی سمگلر ہے۔ وہ خود موقع پر ہوجاتا ہے یہ محض اسی وجہ سے کہ واردات کی تقبیل سی آئی۔ اسے کر رہی ہے۔“

”خیر کسی نے کی تھی۔ جیسا نے پوچھا تھا۔

”پہلیں بتا سکوں گا۔“ اس کے پلٹے ہی میں جواب دیا تھا۔ ”میں بہت مجبور ہوں جیسا میں نے تمہارے لیے کی کچھ نہیں کیا البتہ اس معاملے میں کچھ بڑبڑاؤ صرف اتنا بنا دوں گا کہ مجھے یہی لگتی تھی“ جیسا کے آدمی ڈیڑھ دو برس کے لیے چل چلے بھی جاتے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اس نے دھوکے میں آکر کبھی بات نہیں کھائی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے دشمن پیچھے اس پر ہنس رہے ہیں۔ وہ چل چل رہا تھا۔ اس کے سامنے اب ایک ہی راستہ تھا کہ خبر کا سرخ لگائے اور اسے اپنے قانون کے تحت سزا دے اور وعدہ معاف گواہ کو بھی صاف کر دے۔ مجھے کا شک اب ان کے سوا اور کس پر ہو سکتا تھا۔ اس کا سلطان گواہ بن جانا اس کے خلاف کھلا ثبوت تھا۔

چنانچہ آج صبح دہلی سے پولیس اپنے وعدہ معاف گواہ کو تلاش کر رہی تھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ پولیس اس کے گھر کا کوئی تلاش کر رہی تھی۔ وہاں سی۔ آئی۔ ڈی بھادی گئی تھی لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ پولیس نے ان کی بیوی اور نوجوان بیٹی کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ آج دن کے پچھلے پہر جیسا نے اپنے والدین سے واپس آ رہا تھا۔ متعلقہ افسر نے اسے بلایا تھا۔ وہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن افسر نے پتلیں کی تھیں۔

”جیسا! جیل گارڈ والے میری نوکری کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔“ افسر نے اسے التجا کے لیے کہا تھا۔ ”خدا کے واسطے! ان کو چھوڑ دو اور اسے کورٹ میں حاضر ہونے دو۔ ہم اپنی اپنی غلطی پر پکھتا رہے ہیں کہ وہ صرف گواہ و ضمانت پر رہا ہونے کا موقع دے دیا۔ اسے جلدیشل حالات میں رکھنا چاہیے تھا۔“

ایک کڑکھین تھا کہ جیسا کے سوا ان کو کوئی غائب نہیں کر سکتا۔

”ابن میرے پاس نہیں ہے۔ جیسا نے جواب دیا تھا۔

”جیسا۔“ افسر نے درخواست کی تھی۔ ”میں نے تمہارے بہت کام کیے ہیں۔ ایک کام میرا بھی کر دو۔ ان والوں لا دو، وہ سرکاری گواہ ہے۔ درنہ میرا جو انجام ہو گا اس سے تم ناواقف نہیں۔“ ”تم نے میرا کوئی ایک بھی کام صفت کیا ہے تو بتا دو، پوری اجرت دوں گا۔“ ابن میرے پاس نہیں ہے۔ جیسا نے کہا تھا۔ ”آخر یہ کیسے گول کر دو تو پورے پانچ سو روپے دوں گا۔ اگر زیادہ مانگتے ہو تو گولی کو ایک رات کے لیے لے جاؤ۔ آخر یہی منظر نہیں تو مجھے گرفتار کر لو لیکن یہ یاد کر لیا کہ میں نے تمہارے کیسے کیسے کام کیے ہیں، تمہاری نوکری میرے ہاتھ میں ہے۔“

افسر نے جیسا کو گھر کی نظروں سے دیکھا اور جان کے گھونٹ پی کر دیا۔

اور جب جیب کمرے سے گھوڑا تو پولیس افسر کی نظریں جھک گئیں۔

جیسا بھی ابھی تھا نے سے آ رہا تھا۔ پولیس سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ انہوں نے ابن کو سلطان گواہ تو بنایا تھا لیکن اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا اور جیسا سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ اس نے ابن کو گھر بھیج دیا۔ ناخوشگاہ میں نوکری لایا تھا، وہاں اس کا کوئی اپنا آدمی ہونا چاہیے تھا۔ اسے اس غلطی اور شکست کے احساں کے علاوہ یہ خیال بھی بتا رہا تھا کہ میں بڑا کاروبار اور پندرہ ہزار روپے مالکی ہاتھ سے نکل گئی۔ اس سے یہ بات بھی جلد کے جاری تھی کہ پنجاب کا بارہ فروش کیا کئے گا کہ کراچی کے استاد اس قدر ناٹری ہیں؟ جیسا کا سر پنجاب والوں

کے سامنے نیچا ہوتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اسے ناز بھی غصہ آئے لگا کہ اتنے عرصے سے سفید ہاتھی بیٹھی ہے اور راہ پر نہیں آ رہی۔

جیسا بہت تیز چلا جا رہا تھا۔ کان بن بھا ہوا آدھا سگریٹ اڑا رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر ایک کانٹیلبل ڈیوٹی رکھڑا سگریٹ ٹکڑا رہا تھا۔ جیسا نے اپنے کان میں سے سگریٹ نکالا اور کانٹیلبل کے پاس رک کر اس کے سگریٹ سے اپنا سگریٹ سڈکا کر واپس کر دیا اور آگے چل پڑا۔ کانٹیلبل نے دیکھا اس کے ہاتھ میں مڑا تر آدھا سگریٹ تھا۔ اس کا پورا سگریٹ جیسا نے گیا تھا۔ کانٹیلبل نے درجائے ہوئے جیسا کو دیکھا اور کھپائی سی سنسنی نہیں پڑا۔

جب وہ بلس روڈ کے چکر میں سے گزر رہا تھا تو اس نے ایک دوکان کے سامنے ایک آدمی کو بٹوے میں نوٹ ڈالتے دیکھا۔ جیسا ذرا آگے جا کر رک گیا۔ اس آدمی نے بٹوہ کوٹ کی اندر دیکھ کر جیب میں ڈالا اور بلس کے انتظار میں جا کھڑا ہوا۔ جیسا آہستہ آہستہ اس کے قریب جا رہا۔

بلس کی قطار میں چلی آ رہی تھیں اور مسافروں کو نگلتی جا رہی تھیں۔ وہ آدمی کھڑا تھا اور جیسا کے کھیلوں سے دیکھ رہا تھا۔ آخر اس کے منبر کی بس آگئی۔ وہ تیار ہوا تو جیسا بھی تیار ہو گیا۔ بس کی تو اس نے اوپر چڑھنے والوں میں سے پہلے اترنے اور سب سے پہلے چڑھنے کی جگہ شروع ہو گئی۔ بس کے تنگ دروازے میں ایک جھوم پھنسا ہوا زور آزمائی کر رہا تھا یہی جھوم بازی اور جھکم پل ہی تو جیب کمرے کو دعوت عمل دیا کرتی ہے۔ بٹوے والے کو یہ تو معلوم تھا کہ کراچی میں کسی بھی وقت جیب صاف ہو سکتی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی جیب میں نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ پڑا ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے آگے کراچی کا ماہر گڑھ کھٹ اس کے سینے سے پیچھے لگاتے بس کے پائیدار پر کھڑا ہے۔

جیسا اس آدمی سے آگے آگے بس پر چڑھ گیا اور جب یہ آدمی دھکے دے کر اور دھکے کھا کر بس میں پھنسا ہوا داخل ہوا تو جیسا نے گھوم کر ایک بازو کی کھنی اٹھائی اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیوں نے ذرا جھک کی اور جیسا بلس سے باہر اس کا شکار بس کے اندر اور بٹوہ جیسا کی جیب میں تھا۔

مٹا بلیمپ اور بادل اپنے کمرے میں تھے۔ مٹا فرش پر پڑے ہوئے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ ٹیپو سامنے دیوار کا سہارا لیے بیٹھا تھا اور بادل دروازے کے سامنے بیٹھا سگریٹ کے تباکو میں چرس ملا رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ مٹا اور ٹیپو کی کی تیزی سے اپنی اپنی جگہ سے اٹھے اور چاقو نکال کر کھڑے ہو گئے۔ ایک دروازے کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف۔

بادل بدستور تباکو میں چرس ملا رہا جیسے اسے گرد و پیش کا خیال ہی نہ تھا۔ مٹے نے ہاتھ بڑھا کر بغیر کھول دی اور دونوں آنے والے پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ جیسا اندر داخل ہوا تو دونوں نے پیچھے ہٹ کر سمٹ گئے۔

جیسا دل کے پاس جا کر بیٹھا۔ وہ تھکا تھکا اور غصے سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے بٹوہ نکال کر ٹیپو کی طرف پھینکا۔ ٹیپو نے جلدی سے بٹوہ کھول کر نوٹ گنے، پھر بڑی گاری گئی۔ چار سو پچاس روپے دس آئے۔ ”کاٹا ہے؟“ — بادل نے پوچھا۔

جیدانے دو انگلیوں کی حرکت سے ساری بات واضح کر دی۔

”اور اس کا بھی کچھ سوچا استاد؟“ ٹیپو نے ناز کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

”دیکھا جاتے گا۔“ جیدانے بے پروائی سے کہہ دیا۔

”میری مالتو تو چلا دو استاد!“ ٹیپو نے مشورہ دیا۔ ”پندرہ بیس ہزار سے کم میں کیا جاسے گی۔“

”ہاں استاد۔“ بادل نے جس بھر سگریٹ سکا کر جیدا کو دیا اور کہا۔ ”چھ سات مہینوں سے سخت کا

کھا رہی ہے اور رازہ نہیں آ رہی۔“

جیدانے سگریٹ کا لمبا کش لیا جس کا دھواں بگلا اور دھواں کمرے کی بھی ایک وحشت میں گل گیا۔

”شٹی ہے، گلی ہے، گنار ہے...“ مٹنا کر رہا تھا۔ ”ہاں کو دیکھ لو، پان سات روز میں چل پڑی تھیں۔“

”دیکھو استاد۔“ ٹیپو نے کہا۔ ”کوئی علاج کرو نہیں تو چلتا کرو۔“

جیدانے سگریٹ کا ایک اور کش لیا، دھواں اگل کر اٹھا اور ناز کے کمرے کا دروازہ کھولا۔

نازمیر پر کمپٹن ٹیکے سر ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔ اس قید اور کمرے سے سمجھوتہ کر لینے کے باوجود اس

کا مستقبل کھل کر اس کے سامنے نہیں آ رہا تھا۔ اس پر ایک بار پھر ڈوبنے کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

اسی کمرے کو اس نے پناہ گاہ بنالیا تھا۔ یہاں اس کی سکوائی بھی قائم ہو گئی تھی لیکن چند دنوں سے یہ کمرہ اس کا

دشمن بننا جا رہا تھا۔ اس کمرے میں اب بھی اسے کوئی جہانی اذیت نہیں دی گئی تھی... اسے مرض کھانے

کھلائے گئے اور وہ لڑشی پڑے پنا سے گئے جن کے وہ اسلم کے سپلو میں بیٹھ کر خواب دیکھا کرتی تھی

لیکن مٹنا، ٹیپو اور بادل اسے صبح و شام میدان جانے پر اکسانے لگے تھے۔ ان کا لب و لہجہ ایک بار پھر

شیخ ہو گیا تھا۔

اب تو اس کمرے کی دیواریں بھی اسے کنگن لگیں تھیں۔ ”نازا! بیچ دو اس جسم کو۔ اب یہ منہ دب دنیا

کے قابل نہیں رہا۔“ چٹن اب کسی ایک گھر کی زینت نہ بن سکے گا۔

ناز نے بسا اوقات ان آوازوں کا جلیغ قبول بھی کر لیا تھا اور اکثر ان آوازوں سے بھاگ اٹھتی تھی لیکن ہاؤز

کوئی نہ تھی، اسے تو اس کی مزاحیہ کیفیت بگڑنے لگی تھی۔ چند دنوں سے نیند اور بھوک بھی کم ہو گئی تھی اور مزاج

میں لٹی سی لٹی تھی۔

”ناز! جیدانے اسے چونکا دیا۔

وہ تیزی سے اٹھی اور جیدانے کی طرف بڑھ کر دو تین قدم دوڑ گئی۔ روندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”خدا

کے لیے مجھے بتا دو میرا کیا بنے گا۔ کیا میں اسی طرح قیدی رہوں گی؟“

”فیصل تمہارے ہاتھ میں ہے ناز!۔“ جیدانے بے پروائی سے کہا۔

”تم مجھے ماری کیوں نہیں دیتے؟“ وہ یہ قید... اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا پھر ہاتھ بٹھا کر بولی۔

”مجھے قتل کرو جیدا! مجھے مار دو!“

جیدانے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور ناز بچھ سکی گئی۔

”بڑھا جاؤ۔“ جیدانے چارپائی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ناز کی منجی کم ہونے لگی۔ مزاحیہ کیفیت کا ارتعاش تھمتھکا اور وہ چارپائی پر جا بیٹھی۔ اس نے جیدا کی

طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھے ناز کے جسم نے چھوڑ لی اور اس کی

آنکھیں جھک گئیں۔

”میں نے تمہیں اغوائیں کیا خبر دیا ہے۔“ جیدانے قتل سے کہا۔ ”میں نے کاروبار میں پانچ

سو روپے لگاے ہیں۔ میں ہر رات پانچ سو روپے کمانا چاہتا ہوں۔“

”تم میرے جسم سے ایک پیسہ بھی نہ کھا سکو گے۔“ ناز نے روندھے ہوئے غصے سے کہا۔

”مجھے آزاد کرو میں تمہیں پانچ سو روپے لا دوں گی۔“

جیدا زیر لب مسکرایا۔

”تم آزاد ہونا چاہتی ہو ناز؟“ جیدانے آہستہ سے پوچھا۔ ”کہاں جاؤ گی آزاد ہو کے؟“

”اپنے گھر اور کہاں!“

”اُس گھر کے دروازے بند ہو چکے ہیں تم اُس گھر کے لیے انچوت بن چکی ہو۔“ جیدانے کچھ ایسے

انداز سے کہا کہ ناز اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی۔ جیدا کے لمحے میں غصہ نہیں تھا، طنز نہیں تھی ہمدردی

بھی نہیں تھی۔ تنگ سانس تھا جیہاڑ کے وجود میں سرائیت کرنے لگا۔ جیدا کہہ رہا تھا۔ ”تمہاری دنیا میں بھی جانتے

ہیں جو نہیں اغوائیں کیا گیا تھا۔ تم گھر سے چوری چوری چھپے ایک آدمی کے ساتھ بھاگ آئی تھیں یا تم اُس

دنیا کا سامنا کر سکی؟“ جیدانے پھر پوچھا۔ ”کمرہ سکی سامنا ان لوگوں کا جو تمہارے نام پر تھوک پٹکے ہیں؟“

”سے کوئی جو تمہیں اب بڑی بنا لے گا؟“

ناز اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

جیدا کھڑکی کی طرف بڑھا اور کھڑکی کے دونوں کواٹھکھول دیئے۔

”اگر آزاد ہونا چاہتی ہو تو جاؤ ناز!... بھاگ جاؤ۔“

ناز کے چہرے کا تاثر بدلنے لگا جیسے اعصابی تناؤ کم ہونے لگا ہو لیکن اس کا دماغ ساتھ نہیں دے

رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر تھی۔

”اٹھو ناز!۔“ جیدا پھر بولا۔ ”میں بنیو گی سے بڑا رہوں۔“

کمرے میں سکوت چھا گیا جس میں تاثر نہیں کی تک ایک ہلکا ہلکا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ جیدا کی تھکی آواز

نے سکوت کو بولا دیا۔ ”جاؤ! کس جاؤ اس گھر سے... تم آزاد ہو۔“

ناز اٹھی اور جیدا کی طرف تڑپیں دیکھا جیسے وہ اُسے دبوچ لے گا۔ وہ کھڑکی کے سامنے جا کر ایک

نظر جیدا کو دیکھا پھر بار دیکھنے لگی۔ سامنے دو دو تین تین منزلہ فلیٹ تھے۔ بالکنیوں میں اور کھڑکیوں میں آباد گھڑلوں

کی چپل پہن تھی، سڑک پر بسوں، ٹراموں، رکشاؤں اور کاروں کا جھوم بھاگا جا رہا تھا۔ ٹرک کے دونوں فٹ پاتھوں

پر انسانوں کا ٹٹھا تھا، ماتا انبوه رواں دواں تھا۔ ہر سڑک زلزلہ زدگی کی جاسی اور ہر گھر گھر تھا، مگر یہ ہر گھر ناز

کو سمندر کی طوفانی لہروں کی صورت میں دکھائی دیا۔

وہ بول جھینپ گئی جیسے جھوم اُس پر انگلیاں اٹھا کر چلا رہا ہو۔ ”وہ دیکھو آوارہ لوگو!... ایکسپس

...بدکار... گھر سے چوری کر کے بھاگ آئی ہے۔“

ناز کی اندرونی دنیا میں زلزلے بپا ہونے لگے۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپنی اور اُس پر ڈوبنے اور

ڈوب ڈوب کر ابھرنے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُسے پکڑے سے آنے لگے اور پیشانی پسینے سے

بھیک گئی۔

”جدا نازا!۔ جیدا بللا اور نوٹوں کی ایک گٹھی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔“ یوتھیں سفر فرج کی ضرورت ہوگی۔“

ناز نے ان نوٹوں کو دیکھا لیکن ان کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔ وہ تو دوسرے پرکھڑی تھی یا جیسے گرداب کی لپیٹ میں آگئی ہو۔ اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس نے کھڑکی کے دونوں کواٹ بند کر دیئے اور ایک ہاتھ پیشانی پر رکھا۔ لڑکھڑاتی اور جیدا کے سامنے دھڑلہ مچا رہی۔

”نہیں... نہیں!۔ اُس کی آواز تھرتھرا رہی تھی اور جسم کانپ رہا تھا۔ اُس نے جیدا کے ہاتھ تھام لیے۔ بولی۔“ یہاں سے چلی جی جاد تو کہاں جاؤں گی؟

جیدا خاموشی سے سن رہا تھا۔

نازدا سنبھل کے بولی۔ ”جین خواہوں میں ڈوب کر میں اسلم کے ساتھ بھاگی تھی وہ غواب ڈوب گئے ہیں... اسلم مر گیا ہے... وہ دنیا ہی مر گئی ہے۔ مجھے یہیں ڈار ہنہ وہ جیدا!۔ اُس نے جیدا کے ہاتھوں کو اور زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیا اور چہرہ اس کے دامن کے ساتھ لگا کر بولی۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو میں اب اس دنیا کا سامنا نہ کر سکوں گی۔ وہ انسان اب...“

”چلی جاؤ نازا!۔ جیدا نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

ناز اُس کے ساتھ ڈسے ہوئے پنچے کی طرح چپک گئی۔ اس کا چہرہ تھمارا تھا۔ ہونٹ لزر رہے تھے اس نے بند کھڑکی کی طرف بول گھبرا کے دیکھا جیسے انسانوں کا جسم کھڑکی کی راہ اندر آ جائے گا اور اسے سڑکوں پر گھسیٹنے کے لیے اٹھالے جائے گا۔ ناز کے سامنے اس کا ضمیر ننگا ناچ رہا تھا، وہ سمہارا ڈھونڈ رہی تھی۔

اب جیدا ہی اُس کا سمہارا تھا۔

”جیدا!۔ وہ جی انداز میں بولی۔“ سینے میں ایک بات دبا رکھی تھی۔ کو تو کہہ دوں سینہ جل رہا ہے۔“

جیدا خوشی پر بیٹھ گیا اور ناز اس کے سامنے فرش پر پڑھی اس کے زانو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”میں نے کہا تھا مجھے آزاد کر دو۔ تم نہ مانے۔ اب تم کہتے۔ بجاد تم آزاد ہو تو میں جانا نہیں چاہتی۔ مجھے آزاد دنیا سے خوف آنے لگا ہے۔ وہاں اب میرے لیے لجن وطن کے سوا کچھ بھی نہیں کبھی لگتا ہے جیسے تم نے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔ بھاگنا چاہتی ہوں تو انجانی سی قوت مجھے یہی رہنے پر مجبور کرتی ہے۔“ اس نے جیدا کی طرف نشہ سی نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ ”بہت روز سے محسوس کر رہی ہوں جیسے تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے میں نے خود کشی کے بھی ارادے باندھے لیکن ہر بار تمہارے ہی خیال نے مجھے موت کے منہ سے نکال لیا۔ شاید تم ہی میرے اور موت کے درمیان حامل رہے۔“

وہ خاموش رہ گئی جیدا اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور اس کے ایک ایک لفظ کو پوری توجہ سے سن رہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثر میں ذرہ بھر تبدیلی نہ آئی نہ ہی اس کی اندرونی کیفیت بدل سکی۔ ناز کے چہرے پر کچھ غم اور کرب کے تاثرات تھے اور آنکھوں کی بے چینی اس کی بے بسی کی ظہیر تھی۔

”میں نے بہت سوچا جیدا! بہت سوچا۔“ ناز نے بے چارگی سے کہا۔ ”میں نے تمہاری بیڑیاں کو توڑ دینا چاہا لیکن یہ میرے گرد پڑتی ہی گئیں۔ ہزار ہا ہنگامہ تھیں دل سے دور نہ کر سکی۔ اس لیے دھڑاٹے

جیدا کے بے تاثر چہرے کو دیکھا۔ وہ خاموشی سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ناز نے اس کے کوسٹ کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ ”کاش! تمہارے سینے میں انسان کا دل ہوتا اور تم میری کیفیت سمجھ لیتے مجھے

تم سے نفرت ہونی چاہتی تھی لیکن دل نہ مانا۔ تم مجھے اچھے سمجھنے لگے۔“

”ناز! جیدا نے اطمینان سے کہا۔“ میں بہت پرانا گھلاڑی ہوں۔“

”میری سن لو جیدا!۔ ناز نے اسے لوک دبا اور کہا۔“ میں تمہیں فری نہیں دے رہی، بے بس عورت ہوں تمہارے ہاتھ میں کھلونا جی میں آئے توڑ دو۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”ایک وہ دنیا ہے جو کھڑکی کے اُس طرف آباد ہے۔ اُس کے تصنع، فریب اور ظاہر واری نے مجھے گھر سے بے گھر کر کے اس حالت کو پہنچایا اور اب یہ دنیا ہے جو میری زندہ لاش کی قبر ہے لیکن اس کے گناہ اور اندھیروں نے مجھے حقیقت سے روشناس کیا ہے۔ آج چھ سات ماہ بعد جب تم نے مجھے آزاد ہو جانے کو کہا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ کمرہ میری پناہ گاہ ہے اور تم میرے پاس ہوں۔ خدا جانے یہ خیال کہاں سے آیا ہے... بس نے تم میں اور اسلم میں جو فرق دیکھا ہے مجھے اس فرق سے پیار ہو گیا ہے۔“

جیدا کے ہونٹوں پر جو غم تھا وہ طنز پر مسکرا سٹ بن گیا۔

”اسلم نے مجھے کہا تھا۔“ ناز میں تم پر مڑتا ہوں۔ اُس نے جھوٹ بولا تھا، اور تم کہتے ہو۔ نازا میں تمہیں طوائف بناؤں گا۔ تم جھوٹ نہیں کہتے۔ اُس نے کہا تھا۔ نازا کو اچھی جگہ میں محلوں کی رانی بناؤں گا۔ وہ فریب تھا، اس کے دل میں کچھ اور تھا اور تم کہتے ہو۔ نازا میں تمہارے جسم سے ولت کھاتوں گا! تو یہ فریب نہیں تمہارے دل میں یہی کچھ ہے تم نے وعدہ کیا تھا کہ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور تم نے وعدہ پورا کیا۔“

ناز نے سر کو لمبی جھنجھٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”وہاں صرف اسلم نہیں تھا، میرے خریدار اور بھی تھے۔ میرے بھائی نے سوسائٹی میں میرا تعارف کئی اور دولت مندوں سے کرایا تھا۔ یہ حقیقت مجھ پر بارش ہوئی ہے کہ نہ انہیں مجھ سے محبت تھی نہ مجھے اُن سے۔ انہیں میرے جسم کی ضرورت تھی، تھوڑی سی دیر کے لیے اور مجھے ان کی دولت کی ضرورت تھی، ہمیشہ کے لیے۔ دونوں طرف دھوکہ تھا۔“

ناز کے آنسو جاری تھے اور وہ یوں بولے جا رہی تھی جیسے سینے کا خبا را گل رہی ہوا اور غبار کا دھواں آنکھوں کو لگ رہا ہو۔

”جیدا! اُس نے کہا۔“ میرے بھائیوں کی دولت پرستی اور کینگی نے مجھے کراہا کیا۔ مجھے کیس کا نہ رکھا میں جہاں سے بھاگ کے آئی ہوں اب وہاں نہ جاسکوں گی۔ مجھے اب اسی قید سے اُلٹ ہو گیا ہے۔“

”مطلب یہ ہے۔“ جیدا نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ”تمہیں مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ مجھے محبت کے نام سے نفرت ہے۔“

”جیدا! ذرا سی دیر کے لیے انسان کے روپ میں آؤ۔“ ناز نے اُس کے زانو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”میں نے اپنے آپ کو جھوٹی محبت پر قربان کیا ہے اور تم سچی محبت سے بھاگ رہے ہو۔“

”مجھے قربان کرنا چاہتی ہو؟“

”نہیں جیدا! صرف اتنی سی التجا ہے۔“ ناز نے اس کی ٹھٹھری کو چھو کر موت کے لمحے میں کہا۔

”مجھے اسی سے میں یوں ہی اپنے قدموں میں پڑا رہنے دو۔ تمام عمر اسی حال میں گزار دوں گی میری محبت کو ٹھوکر مار دو لیکن مجھے اپنی خاموشی پوجا کر لینے دو۔ اور ایک التجا یہ بھی ہے کہ مجھے میوانی کی زندگی سے بچانے رکھو میں تمہارے لیے، صرف تمہاری خاطر اسی عمر سے میں قید رہوں گی“

جیڈا یوں چونک کر اٹھ کھڑا جو جیسے ناز نے اسے لشرچھو دیا ہو۔ وہ کمرے میں ٹپکنے لگا اور سوچ میں اچھو گیا۔

ناز نے کہا۔ ”میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتی ہوں کہ...“

”خدا کو پہنچ میں منت لاؤ۔ جیڈا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ایسے معاملوں میں خدا کا کوئی دخل نہیں ہوتا تمہارے دل میں نہ میری محبت ہے نہ کسی کی نفرت تمہارے سامنے تمہارے اپنے گناہ اور تمہارے بھائیوں کے گناہ مانج رہے ہیں تم ان سے پناہ ڈھونڈ رہی ہو“

جیڈا کسی قسم کا کوئی اثر معلوم نہ ہوتا تھا۔ کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ نازی اکھڑی اکھڑی سانس لیں سکوت میں ٹھیکل ہو رہی تھیں۔ جیڈا اس سکوت سے کہیں زیادہ ساکن اور جا رہا تھا۔

”ہاں ہوں ٹھیکت کھا گئی ہوں“۔ ناز نے جھنجھلا کر کہا۔ ”اور تمہارے قدموں میں گر پڑی ہوں“

”اور میں تمہاری شکست کو تسلیم کرتا ہوں“۔ جیڈا نے یوں کہا جیسے بیلار ہو گیا۔ ہمزدا بلند آواز سے بولا۔

”دیکھنا باز جو میرے سامنے گر پڑتا ہے میں اسے کٹش دیتا ہوں لیکن میں اسے ہم نہیں کٹتا، اپنی فتح کھانا ہوں تمہارے سر سے جھک کر میرے سر کو اونچا کر دیا ہے“

جیڈا کل گیا پھر الفاظ تول تول کر بولا۔ ”اچھی طرح سن لو میں تم سے محبت نہیں کر سکوں گا میں یوں ہی ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں“

اُس نے جیسے دس دس کے چند نوٹ نکال کر نازی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ روپے لیے پاس رکھ لو۔ ایک چھوڑا موجود ہے۔ اسے کھانے پکانے پر لگا دو اور ہٹل سے کھانا منگوانا چھوڑ دو لیکن یہ سن رکھو کہ تم اس قید سے آزاد نہ ہو سکو گی“

جیڈا نے اپنی ایک ضروری ناز کے سامنے رکھ دی جسے وہ خود بھی محسوس نہ کر سکا۔ اُس کا لاشعور اس کے دماغ پر غالب تھا۔ نازی شکست خوردگی نے جیڈا کی شخصیت اور دنیا دوں کو عریاں کر دیا۔ وہ ذہنی طور پر نابل نہیں تھا کوئی بھی عادی مجرم مارل انسان نہیں ہوتا۔

ناز نے اُس کے ہاتھ سے روپے لیتے ہوئے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”تمہارے اور اپنے لیے میں اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا کروں گی“

”نہیں!“۔ جیڈا نے فیصلہ کیا۔

”جیڈا! ناز کے انسوجاری ہو گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر جیڈا کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور کچھ نہ کہہ سکی۔

جیڈا کو نازان بار بار اور لال گلابی ہونٹوں کے لمس میں کوئی لطف آنا نہ نازی کی پیشانی پر لہرے لڑتی ہانوں نے اُس کی ذات میں ارتعاش پیدا کیا۔ اس قدر زہین جیم اور جیم چہرے کو اپنی ملکیت میں پاکر اس کی گولن میں حرارت پیدا ہوئی۔

”ایک بات بڑوں ناز!“۔ جیڈا نے کہا۔ ”اپنے متعلق ناز اچھی طرح سوچ لو۔ آخر کب تک اس

قد میں بڑی رہو گی میں ٹھیک زندہ رہوں گا۔ میں بروقت پھانسی کے تختے پر کھڑا رہتا ہوں۔ جانے کب لٹک جاؤں۔ جانے کب قتل ہو جاؤں میں جراتم پیشہ ہوں۔ میری دوستی اور میری دشمنی جراتم پیشہ لوگوں اور پولیس کے ساتھ ہے میں کسی بھی وقت قتل ہو سکتا ہوں۔ پولیس کو ضرورت محسوس ہوتی تو مجھے گولی مار دی جائے گی اور تم اخبار میں یہ خبر پڑھ لو گی کہ بدنام غنڈہ جیڈا پولیس پر قبضے میں مارا گیا ہے... تم اپنی راہ بنانے کی فکر کرتی رہو تمہیں روزی ملے گی تو میری ہی دنیا میں ملے گی تم میری ہی دنیا میں نام پیدا کرو گی۔ مہذب سوسائٹی میں سے بدنام کھتے ہیں، اُسے ہم لوگ نیک نام کہا کرتے ہیں۔ وہاں لوٹ کر جاؤ گی تو بدنام کھلاؤ گی... سوچو بخیریدگی سے غور کرو“

جیڈا نے اپنا ہاتھ ناز کے ہاتھوں سے آہستہ سے نکالا اور کمرے سے نکل گیا۔

اُس نے دوسرے کمرے میں جا کر کمرے میں پتھر اور بادل سے کہا۔ ”اب پہرہ دینے کی ضرورت نہیں۔ پھر پوچھا۔ ”لوٹنے آگئے ہیں؟“

”ہاں اودہ باہر بیٹھے ہیں“۔ بادل نے جواب دیا۔

صحن کے ایک کونے میں بارہ تیرہ برس کی عمر کے تین لڑکے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے جیڈا نے صحن میں آکر انہیں بلایا۔ تینوں بھاگ کر اُس کے پاس آئے۔

”غور سے سوت۔ جیڈا نے تینوں لڑکوں سے کہا۔ ”میری پتلون کی کسی جیب میں نقدی ہے۔ ایک طرف کھڑے ہو جاؤ مجھے دیکھو اور بتاؤ نقدی کسی جیب میں ہے“

وہ آگے چل پڑا اور چلتے چلتے پتلون کی دائیں جیب میں سے رومال نکال کر منہ صاف کیا اور رومال اسی جیب میں رکھ دیا۔ نوز آگے جا کر واپس آیا اور اس نے ایک بار پھر جیب سے رومال نکالا۔ منہ پر پھیلایا اور اسی جیب میں ڈال لیا۔

”تم بتاؤ۔ اُس نے ایک لڑکے سے پوچھا۔

”دائیں جیب میں“۔ لڑکے نے ذرا ہچکچا کر جواب دیا۔

جیڈا نے دوسرے لڑکوں سے پوچھا تو دونوں نے بائیں جیب بتائی۔

اُس نے پہلے لڑکے کو پاس بلا کر رعب دار آواز میں پوچھا۔ ”تم نے دائیں جیب کیوں کی تھی؟ میں نے اس قدر صاف اشارہ دیا تھا، پھر تم نے غلط جیب کیوں بتائی؟... بھول گئے؟“

لڑکے کے چہرے پر خوف دہراں چھا گیا۔ دیوار کے ساتھ بید کی چٹری پڑی تھی جیڈا نے چٹری اٹھا کر لڑکے کو دو تین طرہیں لگائیں۔ لڑکا ملبلا اٹھا۔

”تم نے بائیں جیب کس طرح بتلائی تھی؟“۔ جیڈا نے دوسرے لڑکوں سے پوچھا۔

ایک لڑکا زبردستی جیموں سے اٹھ کر لڑکے کے انداز میں بولا۔ ”جس جیب سے منہ صاف کرنے والا رومال بار بار نکلتا ہے اس میں نقدی نہیں ہوتی۔ ریزکاری ہو سکتی ہے نوٹ نہیں ہوتے۔ تمہارا رومال دائیں جیب میں تھا اور نقدی ضرور بائیں جیب میں ہو گی“

”سمجھو؟“۔ جیڈا نے پہلے لڑکے کو ایک ہتھ پڑا رہے ہوئے کہا۔ ”تمہارا باپ رومال الی جیب میں نوٹ رکھے گا، لوگ عقل والے ہوتے ہیں۔ رومال نکالتے وقت نوٹ گرنے کا خطرہ ہوتا ہے ہم ایسے

ہی عقلمندوں کی جیسے صاف کیا کرتے ہیں جو ذرا سی بات کا خیال رکھتے ہیں۔

”کون یہی جیل میں ہے۔ نوٹ نکالے گا؟۔ جیلانے لوگوں سے پوچھا۔

ایک لڑکے نے دوسرے دونوں کو ذرا دوسرے جانر کا نون کاٹ کچھ سمجھایا اور انہیں چھوڑ کر خود جیل کے پیچھے جا کر کھڑا ہوا۔

”استاد!۔ لڑکے نے جیل سے کہا۔ ”تم فٹ پیری پر جا رہے ہو تم میری اسامی ہو آگے چلو۔ جیل آگے چلا تو لڑکا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ سامنے سے وہ دونوں لڑکے تیزی سے جیل کی طرف آئے اور اس طرح اس کے سامنے پہنچ گئے جیسے اتفاقاً جیل سے ٹکرائے ہوں۔ ایک لڑکا گڑا۔ دوسرا نہایت قدرتی طریقے سے اس لڑکے کے اوپر گر پڑا۔ جیل دونوں سے ٹھوکر کھا کر اس قدر آگے جب تک گیا کہ اس کے ہاتھ زمین پر جا گئے۔ اس تصادم میں اداکاری یا بناوٹ کا ذرہ بھر شبہ نہیں ہوتا تھا خود جیل جیسے استاد نے اسے اتفاقاً ٹکڑا کر سمجھ لیا تھا۔ اسے غصہ بھی آگیا۔

جیل اسمبل رہا تھا کہ گرسے ہوئے ایک لڑکے نے اس کی رانوں پر پتلون کی جیبوں سے ذرا پیچھے ہاتھ رکھ لیے اور گڑا تو اسے لگا۔ ”استاد! ٹھوکر لگ گئی تھی ناراض نہ ہونا۔“ اس کے اوپر گرنے والے لڑکے نے بھی جیل کو اسی طرح مصروف کر لیا اور جیل کے پیچھے چلنے والا لڑکا اس کے قریب سے ہو کر گزر گیا۔

جب لڑکے اس سے الگ ہو گئے تو اس نے غصے سے پوچھا۔ ”نوٹ کیوں نہیں نکالا بھی

نکلتا؟

”نوٹ یہ ہے استاد!۔ لڑکے نے پانچ کا نوٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرے ہاتھ میں“ جیلانے ایسی باتیں جب میں ہاتھ ڈالا۔ نوٹ غائب تھا۔ اس کے منہ سے مباحثہ نکلا۔ ”شاباش!“ ”ٹیوٹ۔ جیل ٹیوٹ سے مخاطب ہوا۔ ”کل انہیں تلے سمجھاتے تھے؟“

”ہاں بھول کر رہتے تھے۔“ ٹیوٹ نے جواب دیا۔

”کیوں بے۔ جیلانے مار کھانے والے لڑکے سے پوچھا۔ ”ایگل مار کھانے کی کتنی چوٹیاں ہوتی ہیں؟“

”چار چوٹیاں، ایک سلاخ کی جابی سے کھل جاتا ہے۔ لڑکے نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

”سیدھی سلاخ سے کون کون سے تالے کھلتے ہیں؟۔ جیلانے ان سے پوچھا۔

”نیریں۔“ ٹیوٹ بول پڑا۔ ”یہ ابھی نہیں بتایا۔“

”ہمارے پاس تیار چھوڑے کتنے ہیں؟۔ جیلانے پوچھا۔

”دس ہیں۔“ بادل نے جواب دیا۔

”تین ملا کر تیرہ۔“ مٹے نے تصحیح کی۔ ”یہ بھی تیار ہی ہیں۔ صرف تالے سمجھانے باقی ہیں جیلوں کا کام کر سکتے ہیں۔“

”چار لوٹ جسے جیل میں ہیں۔“ ٹیوٹ نے بتایا۔

”دو کی وضاحت کرائی تھی نا؟۔ جیلانے پوچھا۔

”ان کے علاوہ دو اور ہیں۔“ بادل نے کہا۔ ”میں ان کی ملاقات کو جانتا رہتا ہوں اور ٹیوٹ۔ سگریٹ

صاف وغیرہ دے آتا ہوں۔“

”خیال رکھنا۔ جیلانے ہدایت دی۔ ”انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ پھر وہ لڑکوں سے مخاطب ہوا۔“ لہو اتے آئے۔ اس نے وہی پانچ کا نوٹ جیل لڑکوں کے پاس دے دیا تھا ان کی طرف پھینکے ہوئے کہا۔ ”جاؤ سینا دکھو اور کھاؤ۔“

لڑکے ہنستے کھیلنے باہر نکل گئے۔

جیل ایک اور کمرے کی طرف بڑھا اور کہا۔ ”اسے کھو لو ذرا۔“

مٹے نے آگے بڑھ کر ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ جیل کمرے میں داخل ہوا۔ یہ کمرہ ایسے وسیع غار کا منظر پیش کر رہا تھا جس میں کڑیوں کی حکومت تھی اور جن کے جالوں میں جیسے بدرویں کھیں ہوتی تھیں۔ دیواروں پر چھت سے مگرے والے پانی کے گھرے لٹائے نشان کمرے کی ہیبت میں اضافہ کر رہے تھے۔ کوئی کھڑکی نہیں تھی، ایک ہی روشندان تھا جسے جالوں نے بند کر رکھا تھا۔ چھت سے جالے اس طرح

لٹک رہے تھے جیسے پائے چھپڑے لٹک رہے ہوں۔ فرش کچا اور ناہموار تھا بعض جگہ شور بھی ابھرا ہوا تھا اور نشینی جگہوں میں کافی قسم کی تعفن اور بدبو سے دماغ چھٹا جاتا تھا۔

دروازے کے اوپر سجور دستی انداز کی تھی وہ جیسے جالوں میں آکھ کے کچھ گئی ہو۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک آدمی بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے اور غراؤ کو دھتے چوڑیوں جیسے ٹیپے میں سے نکالی ہوئی لاش کا ہوا آنکھیں نیم اور کھوپڑی میں دو راندر کو دھس گئی تھیں پوٹے سے ہوئے، گال پیچھے ہوئے منہ کھلا ہوا اور ہونٹ بجز زمین کی طرح خشک اور پچھے پچھے، وہ اس طرح بیٹھا تھا جیسے بیٹھا نہیں دھرا ہوا ہو۔

جیلاندر گیا تو لاش کی پکیں لرزیں پکوں میں اتنی سخت نہ تھیں کھٹھکیں۔ ہونٹ یوں بل رہے تھے جیسے پانی مانگ رہے ہوں۔

”اے جیلانے قریب جا کر اسے بلایا۔

وہ آہن تھا، وعدہ مصافحہ گواہ۔ اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دی تو سر دیوار کے ساتھ جا لگا۔ جیلانے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا تو آہن کی آنکھیں درد کی شدت سے کھل گئیں اور ہونٹوں سے گھٹی ہوئی سی چیخ نکلی جسے جالوں نے وہیں دبوچ لیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا یا جیلانے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔

”نیر کون تھا؟۔ جیلانے تھکا نہ انداز میں کھڑا ہنگی سے پوچھا۔

”آہن نے ٹیپے میں سر ملایا۔

”نیر کون تھا؟۔ جیلانے بلند آواز سے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ مری ہوئی سی آواز سنائی دی۔

”نیر کی کس نے کی تھی؟۔ جیلانے دانستہ پتے ہوئے پوچھا اور اس کے بالوں کو ایک اور جھٹکا دیا۔ آہن کا منہ کھل گیا اور دانستہ کھٹکا لے لگے۔ اس میں بولنے کی سخت نہیں تھی، اتنی سی سرگوشی کر سکا۔

”استاد رحم!۔“

جیدائے اُس کے بال جھوڑا کلاس کے مندر پر لیا گھونسہ مارا کہ آئین دیوار کے ساتھ جا لگا اور گر پڑا۔ ٹیپو اور بادل دور دراز سے اسے کھڑے خاموشی اور کچپی سے دیکھ رہے تھے۔ آئین نے گر کر نہ اٹھنے کی کوشش کی نہ ہلنے کی۔ اُس کے منہ سے خون بہنے لگا۔

جیدائے اُس کے ٹھیکر اُس کے سینے پر پاؤں رکھ دیا۔

”میرے تین آدمی کس نے گرفتار کرائے ہیں... مخبری کس نے کی؟“

آئین نے لمبی میں سر ہلایا۔

”سلطانی گواہ۔ جیدائے طنز کیا۔“ تم سلطانی گواہ ہو۔

حمرے کی ضخامتیں ملتی سرگوشی ڈھری۔ پانی۔ اور حمرے کی وحشت میں ڈوب گئی۔

”پانی لاؤ۔“ جیدائے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

دراستی ویرلید جیدائے کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا اور اُس کا پاؤں آئین کے سینے پر۔ آئین نے پانی کا گلاس دیکھا تو وہ تملایا۔ جیدائے نے گلاس کو ذرا اٹھا کر کے پانی کے چند قطرے گرا دیے جو آئین کے چہرے پر پھر گئے۔ اُس کی زبان باہر نکل آئی اور وہ تینا بی سے جوڑوں، ناک اور ٹھوڑی پر پھرے ہوئے قطروں کو چاٹنے لگا۔ اس کے ساتھ اُس نے اپنا ہتھکڑیاؤں بھی چاٹ لیا۔ دراستی بی نے اس کی زبان میں جیسے جان ڈال دی ہو۔

”پانی! آئین نے قدرے جان دار آواز میں التجائی۔

”تم سلطانی گواہ کیوں بنے؟“

”پانی... پانی۔“

جیدائے تھوڑا سا اور پانی اُس کے منہ میں بھرا دیا اور آئین تیزی سے خون اور پانی کے قطرے چاٹنے لگا۔ اس کی زبان سانپ کی سی تیزی سے چل رہی تھی۔

”تمہیں وعدہ معاف گواہ بننے کی کتنی تمہیں ملی ہے؟“

”کچھ نہیں... پانی... پانی۔“ آئین بولا جیسے سکیاں لے رہا ہو۔

”میں نے تمہیں اُس بنگلے میں اس لیے ملازم رکھا تھا کہ۔“ جیدائے اس کے سینے پر پاؤں باتے ہوئے کہا۔ ”بتاؤ، کیسے بڑا لگا داروہ لوگ کہاں رکھتے ہیں اور ان کی لڑکی کون سے حمرے میں سوتی ہے گھر میں کتنی نقدی ہے اور کہاں پڑی ہے۔“

پانی۔ آئین نے تڑپتے ہوئے التجائی۔ ”خدا کے لیے، صرف ایک گھونٹ۔“

جیدائے اب کے پہلے سے زیادہ پانی اس کے منہ پر گرایا جس سے گھونٹ بھر اُس کے منہ میں چلا گیا۔ کچھ ناک کے رستے جسم میں داخل ہوا اور کچھ زبان نے ادھر ادھر سے چاٹ لیا۔

”تم نے مجھے جو خردی غلط دی۔“ جیدائے بولا۔ ”مال اور کی منزل میں غما کرتے ہو بتایا کہ نیچے لکھا ہے۔ جہاں خالی سیف پڑا تھا۔ تم نے گھر والوں کو کبھی پہلے سے خبردار کر دیا اسی لیے پولیس وہاں چھٹی چلی میرے آدمی پڑا۔“

”میں نے مخبری نہیں کی۔“ آئین نے ثقاہت زدہ آواز میں کہا۔ ”اُنساہ میں بے قصور ہوں۔“

”آئین! جیدائے پاؤں کو اس کے سینے پر اور جاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس کام کے لیے

تمہیں پانچ سو روپیہ دیا اور تم ساڈھ روپے ماہوار تنخواہ دیاں سے لیتے رہے مخبری کا عالم تم نے الگ لیا ڈونوں طرف سے کھایا اور اب سلطانی گواہ بن گئے۔“

”نہیں! میں سلطانی گواہ ضرور بننا ہوں۔“ آئین نے سرگوشی کی۔ ”مخبری میں نے نہیں کی مجھے چھوڑ دو۔“

دو۔ وعدہ کرتا ہوں کہ عدالت میں جا کر اپنے بیان سے پھر جاؤں گا۔ کہوں گا کہ پولیس نے مار پیٹ کر سلطانی گواہ بنایا ہے۔“

جیدائے پاؤں اُس کے سینے سے اٹھالیا اور اس کے پہلو میں ایسی لات جمانی کہ وہ بدلا اٹھا خون کے مکتی قطرے اُس کے منہ سے نکل آئے جیدائے ایک ڈنڈا اٹھا با اور آئین کی باجھوں میں رکھ کر اُس کے دونوں سرول کو پاؤں سے دبایا۔ ڈنڈا آئین کی باجھوں کو چپے لگا۔ درد کی شدت سے وہ فریادیں کرتے ہوئے کمرے کی طرف

ڑھا۔ جیدائے کے سرول کو دبانا ہی چلا جا رہا تھا۔ آئین کی ٹانگیں پھٹ کر رہی تھیں۔ ہاتھ بدستور پٹے پیچھے بندھے تھے۔ اس کی گھٹی گھٹی جھینیں اور کرب ناک خڑے جیدائے کے دل میں رحم کا لکاسنا تب بھی پیدا نہ کر سکے۔

”سانپ باہت کھل کر خرباؤ۔“ جیدائے ڈنڈے سے پاؤں کا دباؤ ڈاکر دیا اور بولا۔ ”تم نے پولیس کو

کیا بیان لکھا تے ہیں میں ان کے مطابق صفاتی کا سند و لبت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی بتاؤ کہ مخبری کس نے کی؟“

جیدائے اس کے منہ سے ڈنڈا اٹھا یا تو خون کا دھارا آئین کی باجھوں سے بہ نکلا۔ اسے کھانسی کا شدید

دورہ پڑا۔ کھانستے کھانستے اُس نے پانی مانگا۔

جیدائے اُسے سہارا دے کر اٹھایا اور پانی کا گلاس اس کے منہ کے ساتھ لگا دیا۔ آئین نے بے صبری

سے پانی پی لیا اور کہا۔ ”ہاتھ بھی کھول دو، بتاتا ہوں۔“

جیدائے اس کے اشارے پر بادل نے اس کے ہاتھ کھول دیے۔

آئین نے اکٹھڑی سانپوں کو سنبھالنے کی سر توڑ کوشش کی۔ جیدائے کو ڈاری ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور

بولا۔ ”میں جی جکا۔ صرف چند باتیں۔“ اُسے پھر کھانسی کا دورہ پڑا جو پہلے سے زیادہ جگر خراش تھا۔ خفیف آواز

میں بولا۔ ”تمہیں معلوم نہیں اُستاد! میرے پانچ بچے ہیں۔ بیوی مدت سے بیمار ہے۔ دو اندازہ... مخبری

... روٹی نہیں ملتی، دوائی کہاں سے آئے... پانی... اُستاد! پانی۔“

جیدائے گلاس اپنے ساتھیوں کی طرف جھینکا ٹیپو پانی لینے چلا گیا۔

”میں نے تمہارا نام لکھا تھا نہیں دھوکہ دیا۔“ آئین نے کہا۔ ”مجھے دھوکہ باز بنایا میرے بھوکے پیاسے

بچوں نے، میری بیوی نے جو غریبی رہتی ہے مرنے نہیں۔“

ٹیپو نے پانی کا گلاس آئین کی طرف بڑھایا تو وہ گلاس پر ٹوٹ پڑا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔

پیرٹ چھ روز سے خالی تھا۔ اس میں اس قدر تیزی سے پانی جو کھیا تو درد کی شدید لہر اٹھی۔ آئین کی آنکھیں باہر نکلتے

لگیں اور وہ ایک پہلو پر لٹک گیا۔ اُس پر غشی سی طاری ہونے لگی لیکن وہ اپنے آپ کو ہلکے ہلکے جھٹکے کے

کوسٹہ جل گیا۔ بات کر کے ہی لگا تھا کہ کھانسی کا دورہ پھر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی منہ سے خون آسے لگا۔ پھر وہ

دوانا دوانا کھانسا، خون تو کتنا رگا۔ اس کی آواز ڈوب جاتی تھی، ابھر آتی تھی اور یوں گلتا تھا جیسے وہ بات ختم

کر لینے تک زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ وہ دوتا تھا، اُٹھتا تھا، پہلو پر لٹکتا تھا، کنبیاں ایک

محو ہونے جاتا تھا اور یوں کرتے، سنبھلتے کھانستے اُس نے جیدائے کو سنا دیا:

”میں چورتو نہ تھا۔ بھوکا نہ تھا۔ لیکن حرام نہ کھایا میں نے دن کے وقت توڑی کی اور رات کی چوکیداری بھی کی لیکن میں بیوی بچوں کا روٹی پکڑا بھی پڑا نہ کر سکا۔ بیوی بیمار پڑی تو اسے دو آئی نہ دے سکا۔ لڑکی جان بچوٹی تو اس کی شادی نہ کر سکا۔۔۔ باتیں لمبی ہیں استاد وقت نہیں کہ سناؤں۔ اتنی سی سن لو۔۔۔

”بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے میں نے کیا کیا تھیں نہ کیے۔ سائیکل رکٹ چلائی مگر چل نہ سکی۔ خافہ کشی نے اتنی طاقت ہی کہاں چھوڑی تھی۔ گودی میں مزدوری کی مگر کمر میں جان نہیں تھی کہ بوجھ اٹھاتا۔ وہاں خون زیادہ چوسا جاتا ہے اور بچوں کی قیمت بہت کم ملتی ہے۔ بیوی کو بیماری کھاری تھی۔ بچے بھوک سے بلہا رہے تھے اور میں روٹی کے ٹکڑے کی خاطر جگہ جگہ ہم کو چکنا چور کرتا تھا۔ لوگوں نے کہا تنہا ہی بیٹی جوان ہے کسی گھر میں آؤ گے کام پر لگا دو مگر میں نے ہاں نہ کی۔ سوچا زانہ خراب ہے اور بیٹی جوان ہے۔ پھر سڑی کا سوئم آگیا اور میرے بچے ٹھٹھڑے ہو گئے۔۔۔

”آخر تم مل گئے میں تمہارے ساتھ ملا تھا تو مجھ پر سے خوشی سے نہیں۔ میں نے سوچا تھا یہاں کیا لکھ سچ کیا کھوڑتی کیا حکم کیا وزیر بھی ہاتھ صاف کر رہے ہیں تو میں بھی دین ایمان کو الگ بھینک دوں گا۔ گروہ میں شامل ہو گیا۔۔۔ میں تو جوری کرنے اور پیشہ کمانے آیا تھا میں مختار سے ساتھ کیوں دانتداری کرتا؟ میں نے سوچا کیوں نہ چوری میں ایک اور چوری کر لوں؟ اسی خیال سے میں نے تم سے گھر بھری بننے کا ایک پیسہ لیا۔ تجری کا الگ انعام لیا اور وعدہ معاف گواہ بننے کی تمہیں الگ لی۔۔۔ میرے بچے بھوکے مر رہے تھے استاد! وہ اب بھی بھوکے مر رہے ہیں۔ نہ میرے ایمان نے ان کا پیٹ بھرا نہ میری چوری چکاوی ان کے منہ میں دو لوٹے ڈال سکی۔۔۔

”او جیدل استاد!۔۔۔ اٹن نے چکی لی پھر آہ لے کر بولا۔ ”اب نہیں خدا کے حوالے کر چلا ہوں۔“ جیدل نے اس کی ٹٹ پائی کا ایک اور گلاس ڈھایا تو اٹن نے سر ہلا کر کہا۔ ”اب پانی نہ دو چند نہیں باقی ہیں۔۔۔ استاد جیدل!۔۔۔ اس کی آواز ڈوبنے لگی۔ ”میرے بچے۔۔۔ اس کا سر ڈول گیا۔“ ”میری بیوی۔۔۔ میری بیوی۔۔۔ اور آخری بیوی۔“

اٹن کی آنکھیں پتھر اٹھیں۔ ایک بیوی نے اس کے سب روگ چھوٹ ڈالے۔ وہ لڑھک کر ایک پہلو پر گر پڑا۔

اٹن کی لاش کی آنکھیں بول کھلی ہوئی تھیں جیسے اب بھی جیدل کا سزہ تک رہی ہوں۔ جیدل اٹن کی لاش کو بول دیکھ رہا تھا جیسے اس کے دل کی گھڑائیوں میں اتر رہا ہو۔ ٹیپو نے نصف دیکھی اور جیدل کی طرف دیکھا۔

”اس کو نے میں دفن کر دوں جیدل نے کہا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ ”جانتے ہو یہ کہاں رہتا تھا؟“

جیدل نے دروازے میں رگ کر لو پھٹا۔

”ہاں اب مجھے معلوم ہے۔“ بادل نے جواب دیا۔

”آج والا ٹوہ اس کی بیوی کو دے آتا۔ جیدل نے کہا۔ ”ٹوہ ہمیں گرم کر دینا۔ رقم آسے دے آنا۔ لیکن رات کے وقت۔ یہ بھی خیال رکھنا کہ اس کی بیوی تھیں دیکھ نہ سکے۔ اگر دیکھ لے تو بچان نہ پاتے۔ کہنا میں اٹن کا دوست ہوں اور یہ بھی دیکھ لینا کہ اس کے گھر کے قریب پولیس کے مخبر ہوں گے۔“ اس نے پوچھا۔ ”اپنے پاس اور کچھ ہے؟“

”باہر کچھ نہیں۔“ بادل نے جواب دیا۔ ”سب کچھ اندر ہے۔“

”خیر۔ جیدل نے ذرا سوچ کر کہا۔ ”اندر سے نکالنے کی ضرورت نہیں کہیں دو چار ہزار کا ٹنڈا مارواؤ۔“

وہ بھی اس کی بیوی کو دے آؤ۔ اس کے بچے بھوکے نہ رہیں مستقل انتظام میں خود کر لوں گا میں خود وہاں جاؤں گا۔ تم یہ چار پانچ سو روپے اس کی بیوی کو دے آؤ۔۔۔ آج رات۔“

”چار ہزار بم“ اس شخص حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”تو تمھارے جلیتے ہوئے سڑھ صاحب اچھا گئے اور رونے سے کبھی حاصل ادا تو اس گلی سے آگے سر کر رہی چونچ کو موٹر سائیکل رکشا میں چلا گیا ہے میں نے خود دیکھا

ذرا آگے جا کر پرانی کراچی کی گلیوں کا وہ علاقہ شروع ہو گیا جہاں تین تین چار چار منزلہ مکان ایک ایک سو سے ایک دوسرے کے سہارے کھڑے ہیں۔ گلیاں روزِ اوّل سے دھوپ کو ترس رہی ہیں جہاں کچھیں مچھروں اور کھٹکوں کا بیڑا ہے۔ ران گلیوں میں اس قدر مڑاؤ اور پیچ و خم ہے کہ انسان گم ہو جاتا ہے، جیسے ابھی جا رہا تھا کہ کسی دوار سے اسے اپنے اندر جذب کر لیا جو گلیاں گلیوں میں گم ہو جاتی ہیں۔

ہے۔ ہاتھ میں ہرے رنگ کی تھیلی سی تھی۔

”وہی، وہی“ سیٹھ نے اچھل کر کہا۔ ”ہرے رنگ کی تھیلی، مندر پر سرخ رنگ کا ڈورا تھا“

سیٹھ یہ بھولی سی جگہ پر لکھیاں دس منٹ کے اندر اندر کسی سڑک سے نہیں جا ملتیں اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی ہرے رنگ کی تھیلی اس سے صرف ایک ہاتھ دور اس آدمی کے کندھے پر پڑی ہوئی تھیں۔ فیض کے نیچے ہے جس کے اوپر اس نے ہاتھ رکھا تھا وہاں ہے اور وہ کراچی کا استاد ہے سیٹھ کو اسی قدر معلوم تھا کہ اس کا ”چار بتاؤ“ جا چکا ہے اور اب بھائی بیکار ہے۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور زبرد آواز سے رونے لگا۔

سیٹھ کے گرد مچلتے کے بچوں، عورتوں اور مردوں کا جھوم جمع ہونے لگا تو حیدر بہروپ میں، مثلاً اور لوگ کا دال سے کھسک گئے۔ اور کراچی کے جرائم میں ایک واردات کا اضافہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد حیدر اپنے دونوں ساتھیوں سمیت ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔ وہ ابھی تک بہرپ میں تھا۔ ڈرائیور انجن کا دھکا کھوے انجن میں جھکا ہوا تھا۔

ایک پولیس کا ٹیلیفون ٹیکسی ٹینڈ سے پانچ چھ قدم دور دیوار کے ساتھ کھڑا جمائیاں لے رہا تھا۔ وہ بار بار پورے کا پورا منہ یوں کھول رہا تھا جیسے لمحات کو نکلنے کی کوشش کر رہا ہو اور ڈیوٹی کے تین چار گھنٹے بھر وہیں سو جانا چاہتا ہو۔

حیدر نے ٹیلیفون کا دھکا کھول کر اس میں سے دس دس کے نوٹ نکالے۔ نوٹوں کو ہاتھ میں دبا دبا کر اور مرد کو گولی سی بنائی۔ پھر اس گولی کو انگوٹھے اور درمیانی انگلی میں پکڑ کر ہاتھ ٹیکسی سے باہر نکالا اور جب سپاہی نے پھر جمائی لینے کے لیے منہ کھولا تو حیدر نے شہادت کی انگلی سے نوٹوں کی گولی کو غیلے کی طرح اٹھانے پر چھینک دیا۔

گولی اڑتی ہوئی ٹیکسیل کے مندر پر لگی۔ ٹیکسیل نے چونک کر مندر بند کر لیا۔ اس نے نیچے دیکھا اور جھک کر گولی اٹھالی۔ کھولی تو دیکھا کہ دس دس کے دو نوٹ تھے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا حیدر نے لعلی مرتخیں اتارتے ہوئے ٹیکسیل کو آواز دی۔ ٹیکسیل نے ٹیکسی کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

”ٹیکسی چلی گئی۔ سپاہی کی جمائیاں ختم ہو گئیں اور وہ جُستی سے اپنے علاقے میں ٹپکنے لگ گیا۔

”کیوں جُستی؟“ حیدر نے ٹیکسی ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ مار کر پوچھا۔

”ہماری ٹیکسیوں کو گاؤں میں رکھنا ہوتا ہے۔ یہاں نہیں؟“

”ٹیکسی ڈرائیور نے گھوم کے دیکھا اور چونک اٹھا۔ ”اُستاد؟“ وہ... تیری قسم میں نے سچ مانا نہیں! اس نے چپکے ہوئے کہا۔ ”کیوں نہیں اُستاد!... ہم تو تھا را دیکھا ہے جسے تم غم نہ کرو۔ میں تمہاری سبب بیٹوں کا بہت خیال رکھتا ہوں۔“

گھر سے ان کی غیر حاضری کا سالواں روز تھا۔ آج تو وہ دنیا ہی سے غیر حاضر ہو گیا تھا۔ اس کی بیار بیوی، نوجوان بیٹی اور پانچ بچے پریشان حالی میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ صرف پیٹ کا منہ ہوتا تو کوئی حیلہ بہانہ کر کے وقت گزار لیتے۔ بیماری بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہر غریب انسان کی طرح ان کی بیوی نے

بھی اپنے آپ کو فریب دے لیا تھا کہ یہ بھی کوئی بیماری ہے، پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہے۔ خودی ٹھیک ہو جائے گی لیکن یہ گڑبڑ معمولی نہ تھی۔ اس کے اندر دنی اعضاء فلسی اور نرم فافہ کشی کی حالت میں اوپر تلے پانچ بچوں کو جنم دینے سے بچا چکے تھے۔ پیٹ میں شدید درد کے دورے آگئے تھے جنہیں وہ اب دبا لینے کی عادی ہو گئی تھی۔ جسم کا نگوں پانچ بچوں نے دودھ کے رستے پی لیا تھا۔ اوپر غربت کھٹاؤں کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

ان کی مختصر سی آمدنی تھی جس سے مشکل روٹی کا دھندا چلتا تھا۔ لڑکی جوان ہو کر مچھانے لگی تھی۔ اس کی جوانی جاڑے کے چاند کی طرح خاموشی سے گزرتی جا رہی تھی دو بچے سکول میں داخل ہوئے تھے لیکن تیسری جماعت سے آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ ان کے انہیں سکول سے اٹھایا تھا۔ اس کے کندھے اس قدر بوجھ نہ اٹھا سکتے تھے۔ وہ اب دو لڑکیوں کی ایک دکان پر پندرہ پندرہ روپے ماہوار اور روٹی کپڑے پر نوکرتھے۔ ننھے ننھے بچے لڑکے کے گھر سے نکلتے اور آدھی رات واپس آتے تھے بعض اوقات نیند اور تھکان انہیں گھر تک بھی نہیں پہنچنے دیتی تھی۔ وہ رستے میں ہی فٹ پاتھ پر سوجاتے تھے۔

تین چار مہینوں سے ان کے گھر میں دو پیسے دکھائی دینے لگے تھے۔ ان اور اس کی بیوی کو اُسید بندھ چلی تھی کہ ان کی بیٹی کا شاید بیاہ ہو جائے گا۔ انہوں نے دو چارے پکڑے بھی بنوائے تھے۔ بیوی نے ان سے پوچھا تھا کہ اُسے اتنی زیادہ تنخواہ کہاں سے ملنے لگی ہے۔ ان نے اُسے بتایا تھا کہ وہ دو مہینوں پر ملازمت کر رہا ہے۔ اس نے بیوی پر کبھی غلام نہ ہونے دیا تھا۔ فلسی اور فافہ کشی اسے تارکب راہوں پر لے گئی ہے اور وہ اب چوراہوں کے گرد میں شامل ہو گیا ہے۔

اب یہ تنگدست گنبد سات آٹھ دنوں سے پریشان تھا۔ نوبت فاقول تک آگئی تھی، لیکن فاقے اتنے پریشان کن نہیں تھے جس قدر مصیبت کہ جب سے ان گھر سے غیر حاضر ہوا تھا پولیس نے اس کے کنبے کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ پولیس کا گواہ تھا۔ اس کے بیویکس کامیاب نہیں ہو سکتا تھا اور وہ غائب ہو چکا تھا۔ اس کے بیوی بچے بھی اس کی غیر حاضری سے پریشان تھے کہ آخر وہ کیا کہاں؟ پہلے تو کبھی گھر سے غیر حاضر نہیں ہوا تھا۔

سات دنوں میں پولیس نے دو بار آدھی رات کے وقت ان کے کوارٹر میں چھاپا مارا تھا اور گھر میں رکھے ڈنگ خوردہ ٹنگوں کو بھی الٹ پلٹ کیا تھا۔ سوتے ہوئے بچوں کو بازوؤں سے کھینچ کھینچ کر جگا دیا تھا۔ ان کی بیار ماں کو گھنٹہ بھر کھڑا کر کے پوچھ گچھ کی تھی۔ جوان لڑکی سے چھٹیا خانی بھی کی تھی۔ بڑے دو لڑکوں کو تھکانے لے جا کر مارا پٹا بھی اور دو دو راتیں حالات میں بھی بند رکھا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ ان کا اتنا بتا دیاں۔

ان سات دنوں میں شاید ہی کوئی ایسا دن گزرا ہو جب پولیس کا سپاہی دل میں دو تین بار ان کا دروازہ کھٹکھٹا تے بغیر اندر نہ گھس آیا ہو اور دونوں عمرے اچھی طرح نہ دیکھ لیا ہو۔ ان کی بیٹی مارے شرم کے زمین میں گڑی جاتی تھی کبھی اس کے کال چھوٹے جاتے کبھی پٹھ پر ہاتھ پھیر جاتا تھا۔ صرف بچے کھتے جنہیں جھوک لگتی تھی۔ ماں بیٹی کو کھانے کا ہوش تھا نہ سونے کا۔

آٹھویں رات دس بجے کے قریب ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ماں بیٹی خوف سے دم بخود ہو گئیں۔ ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر دروازہ کھولیں۔ یہ دستک ان کی تو نہیں تھی۔

دروازہ کھٹکھٹا تو لڑکی ابھی۔ یہ دستک پولیس کی بھی نہیں تھی کسی نے سلجھ جوتے طریقے سے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ لائیں ہاتھ میں لے کر لڑکی نے دروازہ کھولا۔ دیکھا کوئی اجنبی تھا۔ سیاہ داڑھی، سر پر ملل کی ٹوپی، آنکھوں پر چاندی کے فریم کی عینک قبض اور پا جا مہ پہنے ہوئے اور اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھا۔
 ”ابن نہیں رہتا ہے؟“ اجنبی نے پوچھا۔
 ”ہاں! لڑکی نے ڈرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن آٹھ دس روز سے معلوم نہیں کیاں جلا گیا ہے۔ وہ میرا باپ ہے۔“

”تمہاری ماں کا اب کیا حال ہے؟“ اجنبی نے پوچھا۔
 ”خیر حال ہے، کوئی علاج تو نہیں رہا۔“ لڑکی کو قدرے اطمینان ہوا کہ یہ لب و لہجہ اور صورت پولیس کی نہیں تھی۔ اُس نے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“
 ”اُن کا دوست جنوں۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے وہ لاہور چلا گیا ہے۔ چند دنوں تک لوٹ آئے گا۔۔۔۔۔ میں اندر آ سکتا ہوں؟“
 لڑکی خاموش کھڑی اُس کی طرف دیکھتی رہی جیسے کبھی ہو کہ اندر نہ آ تو بہتر ہے۔

”ابن کا پیغام ہے!“
 یہ سن کر لڑکی ایک طرف ہٹ گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ جی تو نہیں چاہتا کہ کسی مرد کو اندر آنے دوں لیکن تم میرے باپ کا پیغام لاتے ہو۔
 وہ جب اندر گیا تو دیکھا کہ ایک چارپائی پر ابن کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔ زرد چہرے پر ٹھوک لے رہی اور خوف کے آثار تھے۔ دو بجے ایک چارپائی پر سیلے کچیلے بستر میں سوئے ہوئے تھے اور تین ایک اور چارپائی پر چھپڑوں میں لیٹے ہوئے تھے۔

لڑکی پاس پڑی ہوئی چھوٹی سی میز پر لائیں رکھ کر مال کی پانسی بیٹھ گئی اور اجنبی چارپائی کے قریب سٹول پر بیٹھ گیا۔ اُس نے جب بات کی تو اُس کے انداز اور لہجے سے ایسی گواہی جس میں اپنا نیت اور ہمدردی بھی بیا عورت اور حوال سال لڑکی کے کچھ تھے اعصاب ٹھکائے آنے لگے۔
 اجنبی نے ابن کی بیوی سے گھر کا حال احوال پوچھا تو اُس نے بڑی تلخ تفصیلات سنائیں اُنہوں کی روانی میں اس نے ابن کی گھٹکی گھڑکی ناگفتہ بہ حالت، پولیس کی دست درازیوں اور زنیاتوں کی ایک ایک بات سنائی۔ لڑکی کے بھی آنسو بہ رہے تھے۔

”دیکھو بہن!۔۔۔ اجنبی نے کہا۔ ”ابن بسے کام پر گیا ہوا ہے۔ اُس کا غم نہ کرو۔“ اُس نے چادر میں سے ہاتھ نکالا۔ ہاتھ میں نوٹوں کا بٹل تھا۔ اُس نے یہ بٹل ابن کی بیوی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”یہ رقم ابن نے بھیجی ہے۔۔۔ چار ہزار روپیہ ہے۔“
 نوٹوں کا بٹل اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر عورت یوں پیچھے ہٹ گئی اور یوں تڑپی جیسے کالے نال نے اُس پر حملہ کر دیا ہو۔

”میں اسے نوٹ مجھے نہ دکھاؤ۔۔۔ وہ طیل سی خود داری سے بولی۔“ لے جا دیر دولت!“
 ”میں بہن! یہ روپے۔۔۔“
 ”یہ روپے تم جیسے غریبوں کی عزت خریدنے کے کام آتے ہیں۔“ ابن کی بیوی نے کانپتی لڑنی آواز

میں کہا۔ ”میرے غریب کی بیٹی کی آبرور دہشتی ٹوٹ سکتے ہو جیسے رہن خنجر کی نوک پر کسی کی حسیب خالی کر لیا کرتے ہیں۔۔۔ چار ہزار۔۔۔۔۔ تم چار لاکھ دو تو بھی۔۔۔“

”میں کیا کر رہی ہوں؟“ سیاہ داڑھی والے اجنبی نے چار ہزار روپیہ پیچھے کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”کس وجہ میں پڑ گئی ہو؟“ تھیں مجھ پر بہت سبائیں؟“ قرآن ہاتھ میں لے کر بات کر رہا تھا۔
 ”جس کے ہاتھ میں چار ہزار روپیہ ہو اُس کے ہاتھ میں قرآن مجید ایک کتاب سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ چار ہزار پر عزت یک جاتی ہے۔ چار ہزار پر ایمان یک جاتا ہے۔“

اجنبی جھنجھلا رہا۔ اُس نے اس عورت کو غور سے دیکھا جس کے چہرے پر مرض کی نہیں موت کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ کوڑی کوڑی کی، اناج کے دانے دانے کی محتاج تھی، مگر چار ہزار روپے کو قبول کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ اجنبی نے اس گھر سے کو دیکھا جو کال کوٹھڑی جیسا تھا۔ چھت جالوں سے لٹی ہوئی اور دیواریں بد رنگ تھیں۔ گھر سے میں ایسی بدبو تھی جیسے اس عورت نے ہر سارے پچھلے اچھے اچھے جنے ہوں۔ اس گھر سے میں ایک عورت عزت، آبرو اور ایمان کی باتیں کر رہی تھی۔

”میرے خاندان نے اتنی رقم کہاں سے حاصل کی ہے؟“ ابن کی بیوی نے پوچھا۔ ”وہ اپنے سارے خاندان کو بیچ ڈالے تو بھی اُسے چار ہزار روپیہ نہیں مل سکتا۔“
 ”یہ تم جانو اور ابن جانے۔“ اجنبی نے کہا۔ ”میں اس کی امانت دینے آیا ہوں تم بھی اُس کی امانت ہو۔ اس کی بیٹی بھی امانت ہے۔ اپنی امانت لو اور میں جاتا ہوں لیکن میں یہ ضرور پوچھوں گا کہ تم نے ایسی باتیں کیوں کی ہیں۔ اگر کسی نے تمہیں پریشان کیا ہے تو مجھے بتاؤ۔“
 مال بیٹی کو یقین ساہوئے نگاہ کوئی درد مند ہے۔ انہوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”پریشانی کی پوچھتے ہو؟“ ابن کی بیوی نے کہا۔ ”پولیس نے ناک میں دم کر رکھا ہے ہم سے پوچھتے ہیں ابن کہاں ہے ہم کبھی سے پوچھتی پھر رہی ہیں ابن کہاں ہے۔ پولیس والے بھی نہیں بتاتے کہ وہ ان کو کیوں ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہاں کے لوگ ہمیں کہتے ہیں کہ پولیس کو کچھ دے دلا کر چلا کر وہاں پاس کچھ جوتوں۔۔۔۔۔ تم جانتے ہو اب ان لاہور کیوں چلا گیا ہے؟ مجھے شک ہوئے لگا ہے کہ اُس نے ہمیں دھوکہ ڈالا ہے۔ اسی لیے اُسے پولیس ڈھونڈ رہی ہے۔“

”اُس نے کہیں بھی ڈاک نہیں ڈالا۔“ اجنبی نے کہا۔ ”تم یہ رقم رکھ لو مت ڈرو۔“
 ”ڈروں کیسے نہیں؟“ ابن کی بیوی نے کہا۔ ”کل شام ساڑھے چار سو روپوں نے ہماری عزت ٹوٹ لی ہے۔ اب تم چار ہزار لے کر آتے ہو۔“ عورت کے جسم میں اتنی سکت نہیں تھی کہ غصے، غم اور خون کے ابال کو برداشت کر سکتی۔ اُس کے جوت کاپنے لگے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”یہاں کیا تم نے؟“ اجنبی نے نوٹوں والا ہاتھ پیچھے کھینچ کر حیرت زدگی سے پوچھا۔ ”ساڑھے چار سو روپوں نے کیا کیا؟ جلدی بناؤ مجھے، جلدی بناؤ۔“
 ”خدا غریبوں اور لاوارثوں کے گھر میں لڑکی پیدا نہ کرے۔“ عورت نے روتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ، نکل جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔ میں دولت کا لالچ دینے آئے ہو۔“

”خدا کے لیے ہیں، مجھے بناؤ تو جو کیا ہے؟ میں روپے لے جاؤں گا لیکن کچھ بناؤ تو سہی۔“
 ”کل شام ایک غنڈہ آیا تھا۔“ اِن کی بیوی نے چھت پر لٹیں گاڑنے ہوئے کہا اور لڑکی اٹھ کر باہر چلی گئی۔
 ”تمہاری سی طرح میرے ہاتھ میں ساڑھے چار سو روپے لے کر دیتے اور بہت دیر چلی جاتی ہیں کرتار باقوں بالوں میں میری ٹیٹی کو دوسرے ٹرے میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے لڑکی کی کھٹی کھٹی جھپٹیں سنائی دیں۔ میں نے آوازیں دیں۔ زینت زینت پکارا۔ اُس مردود نے شاید اس کا گلا دبا لیا تھا مجھ میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ نیچے باہر نکل گئے تھے میں گرتی پڑتی اٹھی۔ اس دروازے تک چارپائی کے سمارے پہنچی۔ کھانا کھول کے جو دیکھا تو...“ وہ اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور جھکیاں لے لے کر رونے لگی۔

اجنبی کا چہرہ ٹھٹھے سے لال پیدا ہو گیا۔ آنکھیں جیسے ابھر کر باہر آ جاتی تھیں۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ غصے میں اٹھا اور لوٹوں کا بندل اِن کی بیوی کے سینے پر پھینکنے ہوئے بولا۔ ”یہ چار ہزار روپیہ اِن نے لاہور سے بھیجا ہے۔ یہ تمہارے خاوند کا روپیہ ہے۔ میں اور اِن ایک کاروبار کر رہے ہیں۔ یہ منافع ہے میں تم پر احسان کرنے نہیں آیا۔ یہ رقم تمہاری ہے۔“
 ”آپ ہیں کون؟“ اِن کی بیوی نے پوچھا۔ ”آپ کا نام بتاؤ؟“
 ”میں کوئی بھی ہوں نہیں اس سے کیا واسطہ؟ صرف یہ خیال رکھنا کہ کسی کو عیلم نہ ہو کہ کوئی آیا تھا اور یہ رقم دے گیا ہے۔ اسے ایسی جگہ چھپا کے رکھو جہاں پولیس نہ دیکھ سکے جس میں دباؤ اور تھوڑا تھوڑا نکال کے خرچ کرتے رہنا۔“

”اِن کا باپ کب لوٹے گا؟“
 ”تھوڑے عرصے بعد... میں کچھ بھی بتاؤں؟“
 ”اور یہ پولیس اُس کے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہے؟“
 ”ایک کس میں اُس کی گواہی ہے... اور کچھ نہیں تم کھڑے مت۔“ بل پڑا۔ پھر ک گیا اور بولا۔
 ”ہاں یہ واردات سن کر ضروری بات بھول چکی تھی۔ اِن نے کھلا بھیجا ہے کہ میں کچھ بھی اسی طرح رو بہ بھیجتا رہوں گا۔ لوگوں کو سکول داخل کروا دینا اور سب سے پہلے کبھی اچھے ڈاکٹر سے اپنا علاج ضرور کروانا... اور بہن! مجھے اپنا بھائی سمجھو۔ مجھے اس لڑکی کا باپ سمجھو۔ مارا کا دروازہ بچل نکلا ہے۔ اب اپنے آپ کو غریب سمجھنا چھوڑ دو۔ باقی رہا پولیس کا قصہ اگر تم چاہو تو میں تمہیں یہاں سے کسی ایسے مکان میں بھیج سکتا ہوں جہاں پولیس کو ساری عمر تیر نہ چلے گا۔“

”بھائی میرے!۔“ اِن کی بیوی نے التجا کی۔ ”اگر الیا کو سکھو تو بڑا احسان ہوگا۔“
 ”ایسے ہی ہوگا۔“ اُس نے کہا اور جس طرح اندھیرے سے نور ڈھانپا تھا، کمرے سے نکلا جھن جھن کیا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

کراچی کی نناک رات گزرتی جا رہی تھی۔

ناز نے کمرے میں لٹٹی خیالوں کے تانے بانے میں الجھی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ جیدا کی

ڈائری پڑھتی رہی تھی۔ اُس نے جیدا سے مل کی بات کہی تھی اور آزاد ہونے کا مسئلہ طے کر لیا تھا۔ اس طرح کہ اس نے وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ سکون سا محسوس کر رہی تھی۔ شام ہی کو اُس نے رسالے الگ پھینکے اور میز کی دراز کھول کر جیدا کی ڈائری نکالی۔ اس میں ناز کی اپنی اور اُس کی داستان بھی چند ایک فقروں میں لکھی ہوئی تھی۔

ناز نے ڈائری کے بے شمار اوراق پڑھ ڈالے اور اس پر انکشاف ہوا کہ جیدا صرف جرم پیشہ نہیں کچھ اور بھی ہے۔ درندہ تو ہے لیکن انسان بھی ہے۔ ناز کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈائری پڑھنے سے پہلے وہ جیدا کو بے ڈھب سے روپ میں دیکھتی رہی ہو۔ ڈائری میں جیدا نے اپنی ٹوٹی ٹھوٹی شخصیت کا مزہ خرابے نقاب کر رکھا تھا۔

ناز ڈائری پڑھ کر تھک سی گئی تھی، اس لیے نہیں کہ وہ طویل تھی بلکہ اس لیے کہ اس کے اعصاب اس قدر تخیلوں کے ذکر کے تحت نہیں ہو رہے تھے۔ دو تین موقوفوں پر اس کے آنسو نکل آتے تھے۔ ایک جگہ جیدا نے لکھا تھا:

”آج شام بچپن کے وہ دن یاد آتے رہے جب میری ماں زندہ تھی۔ ماں کے ساتھ میں بھی مرجاتا تو کتنا اچھا جیتا۔“

ناز نے یہ فقرہ پڑھا تو ڈائری بند کر کے لیٹ گئی۔ اسے بھی وقت کے بستے لمحوں کے اُس پاپا اپنا بچپن کھرا دکھائی دے رہا تھا۔

مٹنا بیوا اور بادل اپنے کمرے میں جس کے دھوپیں سوئے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہاتھ گیارہ بجے رات ان کے سونے کا وقت تو نہیں تھا لیکن اِن کی لاش کے لیے گڑھا جو کھودا تو وہ تھک گئے تھے۔

یہ لوگ گناہوں کی دنیا کی مخلوق تھے۔ وہ مخلوق جو چریاں کرتی ہے جیسیں کاٹتی ہے، ڈاکے ڈالتی ہے اور ہر وہ جرم کر گزرتی ہے جس مذہب دنیا کے انسان سم سم جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کی فطرت اور عادات میں ہر پھر نہیں رہتا۔ آپس میں مل بیٹھتے ہیں تو اپنے اپنے شکار کی باتیں کر سُن کر ہنستے ہیں جب ہنستے ہیں تو دل کھول کر ہنستے ہیں۔ مذاق کرتے ہیں تو فحش اور عیاں مذاق کرتے ہیں۔ گالی دینا چاہیں گے تو گالی ہی دیں گے۔ رانے پر آجائیں تو لڑکے ہی دیں گے۔ دل میں کچھ اور چاہیں گے اور کچھ نہیں رکھتے۔ ان میں ظاہر داری نہیں ہوتی۔ فوالتشی حقے نہیں ہوتے، بے جا خوشامد نہیں ہوتی۔ مذہب سوسائٹی والی ڈیوٹی نہیں ہوتی۔ وہ ایک دوسرے کے ہمارا اور چہرہ ہوتے ہیں۔ البتہ مذہب دنیا کے لوگوں میں بیٹھتے ہیں تو سر تپا فریب ہوتے ہیں۔ ان کی انکسں جھوٹی اور ان کی سکھائیں بناوٹی ہوتی ہیں۔ وہ روئیں تو ان کی آنکھوں سے مگر مجھ کے آنسو بہتے ہیں۔

اس کے عکس آج رات بادل کے دل پر ایک بوجھ تھا جو اُس نے ساتھیوں سے چھپا رکھا تھا۔ ایک دوبارچی میں آئی کہ ٹھٹھے اور ٹیکو کو سنا ڈال لے لیکن جھجک گیا۔ وہ بے چین سا بھی تھا لیکن بے چینی کو بھی چھپا رہا تھا۔

تینوں اپنے اپنے بستر و مل میں لیٹے تو دروازے پر دستک ہوئی۔ ناز کے خدمت کار لوٹے۔ ناز نے اپنے کمرے میں سے لالٹین اٹھائی اور باہر نکل کر دروازہ کھولا۔ جیدا کھڑا تھا... سر پر مل کی سفید ٹوڈ

آنکھوں پر پتھر پڑا، پاجامہ قمیض پہنے ہوئے اور چادر اوڑھتے ہوئے تھا۔ وہ ان کی بوجھ کو چارہ رورو پیہ دے کر لٹا تھا۔ اُس نے دروازہ بند کر کے وارٹھی لٹوئی اور چادر اتار کر لٹکے کودے دی۔
”سب کہاں ہیں؟“ اُس نے پوچھا۔

”کمرے میں ہیں، شاید تھکرا انتظار کر رہے ہیں۔“

جیلا اُس کمرے میں جا لگا جہاں اس کے تینوں ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ جب ایک دوسرے سے ملا کر تے تو ہنس کر ملا کرتے تھے۔ اُس رات جیلا کمرے میں آیا تو مٹا اور ٹیوٹو ہنس پڑے مگر بادل کے ہنٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہ آئی۔ جیلا کا چہرہ بھی سنجیدہ رہا۔ اس کا چہرہ تو اپنے ان ساتھیوں کو دیکھ کر بھول کی طرح ٹھہل جایا کرتا تھا۔

ستے اور ٹیوٹو نے جیلا کی سنجیدگی کو بھی، پھر بادل کا چہرہ دیکھا، پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کوئی بات بھی ضرور کوئی بات تھی۔ ان کا استاد بادل کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ ستے نے جلدی جلدی سے سگریٹ سے کچھ تبا کو نکالا۔ اسے تھپلی پر رکھ کر اس میں چرس ملائی۔ تبا کو سگریٹ میں بھرا اور سگریٹ ساکھ کر جیلا کی طرف بھلایا۔ جیلا نے سگریٹ کا کش لے کر سگریٹ ٹیپو کو دے دیا۔
”تم شاید ان کے گھر گئے تھے استاد۔“ ستے نے جیلا سے پوچھا۔

”ہاں!۔ جیلا نے جیسے آہ بھری ہو۔ کہنے لگا۔ ”رقم اُس کی بیوی کو دے آیا ہوں۔“ اُس نے بادل کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہمارا دوست بادل بھی وہاں ساڑھے چار سو روپیہ دے آیا ہے تم سب کے سامنے میں نے اسے پانچ سو روپیہ دیا تھا۔“

”ارے؟“ ٹیوٹو نے پوچھا۔ ”پورے پانچ سو کپول نہ دیتے؟“

بادل کا رنگ اُڑ گیا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔

”تو انٹری تو نہیں سالے!۔“ ستے نے بادل سے کہا۔ ”ہم چور ہیں اٹھائی گزیریں، بے ایمان

تو نہیں۔“ استاد نے پانچ سو کی پاکیٹ ماری اور ٹوٹے پچاس پر اپنا ایمان برباد کر لیا۔

”مجھے پچاس کا علم نہیں۔“ جیلا نے کہا۔ ”اس نے ایک اور جھک ماری ہے۔ وہ میں اسی کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔۔۔ تم بھی سنو۔“

بادل نے ستے اور ٹیوٹو کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھا لیکن انہوں نے نظریں پھیر لیں۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ اس سے کوئی ناقابل معافی حرکت سرزد ہو چکی ہے۔ وہ بھی جانتے تھے کہ رحم کی درخواست بیکار ہے۔

”کل تم ان کے گھر ساڑھے چار سو روپے دینے گئے تھے؟۔ جیلا نے بادل سے پوچھا۔

”ہاں استاد۔“ بادل نے اکھڑی ہوتی آواز میں جواب دیا۔

یہ وہ بادل تھا جس نے تن تہا دو دو تین تین آدمیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کے ریکارڈ میں دیکھتی تھیں واردا تھیں۔ جیلا کا وہ جانباز ساتھی تھا لیکن جیلا کے سامنے وہ اب بالکل بے بس تھا۔ وہ اپنے اوپر فاج کا سا اثر محسوس کر رہا تھا۔

”تم نے ان کی بیوی کو روپے دیتے اور اس کی بیٹی سے کیا سلوک کیا؟“

”مجھے سب بھول ہو گئی استاد۔“ بادل نے جواب دیا۔

”کیا میں نے تمہیں وہاں برعاشی کے لیے بھیجا تھا؟“

”نہیں استاد۔“ بادل نے ڈرے ہوئے بچے کے لمحے میں جواب دیا۔

”کیا میں نے کبھی دھیان نہیں رکھا کہ تم مرد ہو؟“

”رکھا ہے استاد۔“

”کیا میں نے تمہیں ان کی بیٹی کو بے آبرو کرنے کی اجازت دی تھی؟“

”نہیں استاد۔“

”اور تم نے اُس کو بے آبرو کیا؟“

”بخش دو استاد! خطا ہو گئی۔“

”تم مرنے ہوئے کے سینے پر کودے ہو۔“

”جہاں لوگ کو دیکھ کر استاد۔۔۔“

”تم دونوں نے اس کا قصور اور بیان سن لیا ہے؟۔ جیلا نے اُنکی بات سن کر تے ہوئے ستے اور ٹیوٹو سے پوچھا۔

”سن لیا ہے!“

”کیا یہ قصور وار ہے؟“

”اس میں شک ہی کیا ہے!“ ستے نے کہا اور ٹیوٹو نے تائید میں سر ہلادیا۔

”اسے میں جو بھی سزا دوں، تم قبول کر لو گے؟“

”کھلیں گے استاد۔“ ستے نے کہا۔

”بادل۔“ جیلا نے کہا۔ ”تم جانتے ہو ہم کتنے برسوں سے اکٹھے ہیں اور ہم نے کہاں کہاں اور کیسی کیسی وارداتیں کی ہیں کوئی ایک واردات بنا دو جس نے کسی جھگی میں یا کسی کار میں کی ہو یا تم میں سے کسی کو کرنے دی ہو۔ کیا ہم نے کبھی ایسے گھر کا تالہ توڑا ہے جہاں کے رہنے والے اپنے پیٹ کاٹ کر اپنی بیٹیوں کے جہیز بنایا کرتے ہیں؟ میں نہیں کہتی بار کہ چکا چول کہ آسانی دیکھ لیا کہ روپے نہ تو کپڑوں سے اور چکر سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ آدمی آدھا مہینہ تنخواہ پر اور باقی مہینہ آدھا پر گزارا ہے؟“

”سب ٹھیک ہے استاد۔“ بادل نے گڑگڑا کر کہا۔ ”یہ قصور و عاف کر دونا! بھول ہو گئی ہے۔“ اُس نے ستے اور ٹیوٹو کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یار! وہ لڑکی دل کو اتنی اچھی لگی کہ۔۔۔“

جیلا نے اسے نیچی گالی دے کر کہا۔ ”وہ مرنے ہوئے باپ کی بیٹی ہے۔ وہ اُس غریب باپ کی بیٹی ہے جس نے اس بیٹی کی خاطر اپنا ایمان بیچ ڈالا تھا۔ جیلا کی آواز میں تہرا گیا۔ دانت پس کر بولا۔ ”اس ملک میں بہت سے لوگ ہیں جو ایمان بیچ کر بچوں کو کھلا رہے ہیں۔ ایمانداری نے انہیں فاقے کراتے تھے۔۔۔ اور تم نے اس باپ کی بیٹی کو بے آبرو کیا؟“

بادل تو اُس کے آگے دب گیا تھا مگر اسے اچانک غصہ آ گیا۔ وہ دب اس لیے گیا تھا کہ جیلا اُس کا استاد تھا جب تراشی اور قفل شکنی کے جو تہ جیلا نے اُسے سکھاتے تھے، وہ کوئی اور نہیں کھا سکتا

تھا۔ استاد کی جتنی عزت جراتم پیشہ لوگوں میں ہے، وہ معاشرے کے کسی اور شعبے میں نہیں ہوتی۔ استاد کا اتنا زیادہ احترام شاگردوں اور بالکل کے دلوں میں اس لیے بھی ہوتا ہے کہ استاد انہیں گرفتار ہونے سے بچاتے رکھتا ہے۔ گرفتار ہوجانے کی صورت میں استاد ان کی ضمانت کرانا اور ان کے گھر والوں کے اخراجات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ پولیس کے ساتھ رابطہ رکھ کر کیس گول کرالیتا یا بری کرالیتا ہے۔

بادل جیسا سے جودہ کیا تھا، اس کی دوسری وجہ یہ تھی جیلا کا رابطہ صرف پولیس کے ساتھ نہیں بلکہ اُس وقت کے ایسے سیاسی لیڈروں کے ساتھ بھی تھا جو اکثر وزیر بننے رہتے تھے اور جب وہ حزب اختلاف میں ہوتے تھے تو جیلا ان کی بہت بڑی طاقت بن جاتا تھا۔ بادل کو جیلا نے سگین وارداتوں میں گرفتاری سے بچا کے رکھا تھا، مگر اب ان کی بیٹی کے معاملے میں جیلا نے اُسے کچھ ایسی باتیں کہ دیں کہ بادل بھڑک اٹھا۔

”مولوی زینو استاد!۔۔۔ بادل نے کہا۔ ”میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا ہے کہ غلطی ہو گئی ہے معاف کر دو“

”میں معاف کرنا نہیں جانتا۔“ جیلا نے کہا۔

”میں جانتا ہوں تم مجھے کیا سزا دو گے۔“ بادل نے کہا۔ ”استاد! یاد رکھو ہمارے پیٹ میں بھی مال ہے۔ اس مکان میں ایک لاش دہی ہوتی ہے اور ایک اخوا کی ہوتی لڑکی بھی ہے۔“ بادل اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”تم مجھے سزا دو گے تو میں بھی تمیں سزا دے سکتا ہوں۔“

مٹا اور میوچریت سے بادل کو دیکھ رہے تھے۔ بادل جیلا کا پہلا شاگرد اور ساتھی تھا جو اُس کے سامنے اس طرح بولا۔ ”مٹے نے غصے سے اُسے کہا۔ ”کیا بچنا ہے رے استاد کے پاؤں کا پڑے جیلا نے خنجر نکالنے کے لیے ناف پر ہاتھ رکھا تو بادل نے ایک چوڑی بھری، مکرے سے نکلا اور جتنی دیر میں جیلا خنجر نکال کر باہر نکلتا تھا، بادل مکان سے نکل گیا۔

تیسرے روز اخباروں میں چھوٹی سی خبر چھپی:

”آج صبح کھاراد کی ایک گلی میں ایک لاش پڑی ملی جس کے جسم پر خنجروں یا چاقوؤں کے گہرے زخم تھے۔ پولیس کا آگاہ ہے کہ برعبدالعلی عرف بادل بستی کی لاش ہے جو تین بار کا سزا یافتہ اور تین وارداتوں میں مطلوب تھا۔ پولیس کے ایک ذمہ دار افسر نے بتایا ہے کہ بادل بستی کو غالباً اس کے جراتم پیشہ ساتھیوں نے چوری کے مال کی تقسیم پر جھگڑے میں قتل کر دیا ہے۔ پولیس نے مقدمہ زیر دفعہ ۳۰۲ درج کر لیا ہے۔“

”ناحال کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد لاوارث ہونے کی وجہ سے پولیس کے انتظام کے تحت دفن کر دی گئی ہے۔“

گرفتاری کبھی بھی عمل میں نہ آئی۔

اُس رات بادل بھاگ گیا۔ جیلا اُس کے پیچھے گیا اور دروازے سے واپس آگیا۔ وہ اُس کمرے میں چلا گیا جہاں ناز اُس کے انتظار میں بیٹھی تھی جیلا اس کی طرف دیکھ کر میز کے ساتھ کھڑی ہو کر پوچھ گیا۔ ”اُس نے کچھ نہیں پرکھا اور کہنیاں نیز پرٹیک لیں۔ ناز اس کے قریب آن کھڑی ہوئی اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”کچھ پریشان نظر آتے ہو۔“ ناز نے کہا۔

”ہاں۔“ جیلا نے بے خیالی میں کہا۔

”کیوں؟“

”تمہارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔“ جیلا نے کہا۔

”کیوں؟“

جیلا نے جھنجھلا کر کہا۔ ”کیا یہ ضروری ہے کہ میں تمہاری ہر کیوں کا جواب دوں؟۔“ جیلا نے میز کی نیچے والی دراز کھولی اور شراب کی بوتل نکال کر اسے کھولا۔

”جیلا۔“ ناز نے کہا۔ ”شراب چھوڑ دو۔“

”کیوں؟۔“ جیلا نے بے رنجی سے پوچھا۔

”مجھے اس سے کھن آتی ہے۔“

”کیوں؟۔“ جیلا نے ناز کی طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔

ناز نے بوتل اُس کے ہاتھ سے لے کر پرے رکھ دی اور بولی۔ ”کیا یہ ضروری ہے کہ میں تمہاری ہر کیوں کا جواب دوں؟۔“ ناز کھنی اُس کے کندھے پر ٹیک کر اُس پر جھک گئی۔

جیلا نے حیرت سے دیکھا۔ ناز مسکراتی تھی۔ ناز نے اُس کے ہاتھ سے بوتل اتنی سرعت اور ایسی بے ساختگی سے چھینی تھی کہ جیلا کو بُری معلوم نہ ہوئی۔ اُس نے ناز کی طرف دیکھا۔ ناز اُس پر اور زیادہ جھک گئی۔

”تم سو جاؤ۔“ جیلا نے کہا۔

”اور تم؟“

”مجھے کین نہیں آ رہی۔“ جیلا نے کہا۔ ”تم سو جاؤ۔“ جیلا کے لہجے میں اتنا ہٹ نہیں تھی۔

ناز نے ڈائری میں اُس کا اصلی روپ دیکھ لیا تھا اور زندہ اس کے ساتھ اتنا کھٹنے کی جرأت کبھی نہ کرتی۔

جیلا سے بے تکلف ہو جانے میں اسے مسرت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

”جیلا ناز!۔“ جیلا نے کہا۔ ”سو جاؤ۔“

”تم بھی جلدی سو جاؤ۔“ ناز نے پیار بھرے لہجے میں کہا اور بستر کی طرف چل دی چارپائی پر بیٹھی تو

پوچھا۔ ”چائے پیو گے؟“

”نہیں!۔“ جیلا نے جیسے بے خیالی میں جواب دیا۔ ”دوسرے ہی تائیسے چوک کر پوچھا۔“

”کیا پوچھا تھا تم نے؟“

”چائے پیو گے؟۔“ ناز نے کہا۔ ”میں نے آج باورچی خانہ بنا لیا ہے۔“

”ہاں! بہن! گا۔“

ناز باہر نکل گئی اور جیلا خیالوں میں کھو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ناز رشتی طرے میں سجایا ہوا نیالی سیٹ لیٹ کر اسے مکرے میں داخل ہوئی، ٹرے جیلا کی میز پر رکھ کر چائے بنائی اور پیالی جیلا کے سامنے رکھ دی۔

جیلا نے پیالی اٹھائے کی بجائے جھک کر ایک گھونٹ لیا۔ گھونٹ پینے کی بجائے حلاوت میں گھورنے لگا۔ اُس نے گھونٹ اس طرح منہ میں رکھا جتنا تھا جسے اس کا ذائقہ چکھ رہا ہو یا اسے کچھ یاد آئی ہو۔ اُس نے گھونٹ غیر لادری سے طور پر نگل لیا۔ پھر پیالی سے اٹھتے دھوئیں کو سنبھلے لگا۔ اُنہیں کی آنکھیں کھلتی جاری تھیں اور پیشانی کے نشکں گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

اُس نے ایک اور گھونٹ لینے کے لیے پیالی سے ہونٹ لگا تے ہی تھے کہ اس طرح پیچھے ہٹ گیا جیسے چاتے بہت گرم تھی۔ وہ اپنے آپ میں ایک بھل محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر حلاوت میں گھورا جیسے کسی چیز کو دیکھنے اور پچاسنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”ناز! میں چاتے نہیں ہوں گا۔“ جیلا نے قدرے اداس سے لہجے میں کہا۔

”کہوں؟ ٹھنڈی ہو گئی ہے؟“

”نہیں!“

”گرم تو ہے، پی! لو!“

”نہیں، نہیں... میں نہیں پیوں گا۔“

”آخر کیوں؟... اچھی نہیں بنی؟“

”صرف اس لیے کہ یہ بہت اچھی بنی ہے۔ ناز! اس کے لیے میں دیکھ سادیا ہونے لگا۔ ذرا سوچ کر پوچھا۔“ اس چاتے میں کیا ہے؟“ پھر ٹنڈا آواز سے بولا۔ ”ناز! لے جاؤ یہ چاتے مجھے ہوٹل کی چاتے منگوا دو۔“

اُس کی آواز میں عجیب اثر چڑھاؤ تھا جو ناز نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی بات سننے لگی اور اس کی اندرونی حقیقت کسی حد تک سمجھنے لگی۔

جیلا نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔ ”مجھے ہوٹل کی چاتے لاؤ۔ کسی گندے سے باورچی کے ہاتھ کی بنی ہوئی چاتے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں کی استعمال کی ہوئی اور پھینکی ہوئی پی کی بنی ہوئی چاتے جس سے بدبو اٹھ رہی ہو...“ ٹھنڈی چاتے میں خوشبو سے ناز! یہ نئی اور خوبصورت پیالی میں سے مجھے ٹوٹے ہوئے گلاس میں چاتے ملاؤ۔ جیسے ہوٹلوں میں ہوتے ہیں۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ اُس پر دلیا گئی سی طاری ہونے لگی۔ پوچھا۔ ”کیسی خوشبو ہے ناز؟...“ سچ بتاؤ

اس چاتے میں تم نے کیا ڈالا ہے؟“

ناز نے اُسے نظریں بھر کر دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ناز کے دماغ میں ہونٹوں پر ایسا جہنم تھا جیسے جو خواب میں مسکرا رہا ہو جیسا کہ معلوم نہ تھا کہ وہ جھکنا یا توڑ سکتا ہے، یادوں کے دھلگے نہ توڑ سکے گا جس ماضی کو اُس نے جانے کہاں پھینک رکھا تھا وہ چاتے کے لطیف دھوئیں میں لہرا رہا تھا چاتے کے ایک گھونٹ سے ہی اس کی بہت پست ہوئی جا رہی تھی۔

”کیا ڈالا ہے تم نے اس چاتے میں؟“ جیلا نے جھنجھلا کر پوچھا۔

”عورت کی محبت!“ ناز نے رومانی سے انداز میں کہا۔

”ہوں!“ جیسے جیلا نے اپنے آپ سے کہا ہو۔ ”مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔ ایک واردات...“

بھولی لمبری ایک بات... مجھے کیا یاد آ جا رہا ہے ناز؟“ وہ ذرا بلند آواز سے بولا۔ ”بتاؤ ناز!“

بتاؤ۔ میں یہ پیالی توڑ دوں گا۔ چاتے کے اس گھونٹ کے میرے سینے میں گنگ لگا دی ہے۔“ اگر جیلا کے شکار دُڑا ہے اس حالت میں دیکھتے تو کبھی نہ مانتے کہ یہ جیلا ہے۔ اُن کا استاد جیلا کبھی یوں ڈر نہ گنا نہیں سکتا۔ وہ بھی درجہ ہے پھر انہیں نہ رہا تھا۔

ناز نے بایاں بازو جیلا کے کندھے پر اس طرح رکھ دیا کہ بازو اُس کی گردن کے گرد گھیر رہا تھا جو اس کے ماتس گال کو چھونے لگا۔

جیلا عورت کے لمس سے ناواقف نہیں تھا۔ اس نے عورتوں کی خرید و فروخت کا کاروبار بھی کیا تھا۔ وہ اس مخلوق میں سے تھا جو عورت کوئی نفع نہ لے سکتی تھی۔ مگر وہ عورت کے جذبات سے لمس سے آشنا نہ ہوا تھا۔ باوجود اس لمس کو بھول چکا تھا جس کا تعلق جسم کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اب وہ ایک نئی دنیا میں داخل ہو رہا تھا جس میں وہ داخل نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن کوئی قوت یا کوئی کمزوری اسے لے گئی تھی آگے دھکیل رہی تھی۔

”کوئی عورت یاد آتی ہو گی تمہیں!“ ناز نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔ ”شاید کوئی بہن....“

شاید مال.... یا بتا رہا ایک گھر۔“

جیلا نے اُس کی طرف دیکھا۔ ناز کی سانسوں اس کی پیشانی پر پکھنے لگیں۔ ریشمی دوپٹہ اس کے گالوں کو چھونے لگا جیلا نے عورت کی قربانی دیکھی تھی مگر مستورائیت کے لطیف لمس کی قیمت خیر کی کبھی نہ دیکھی تھی۔ ناز کی گرم سانسوں نے اور دوپٹے کے لمس نے اُسے دیوانہ بنا ڈالا۔ وہ اپنے آپ میں تڑپ رہا کسی پرچم نہ کرنے والے خوفناک مجرم کی ذہنی حالت قابلِ رحم ہو گئی۔

”کی کیا تم نے؟“ اُس نے دیکھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ پھر کہو ناز! شاید کوئی بہن.... بتا رہا ایک گھر... شاید ایک مال...“ اس نے گال اور آگے بڑھ دیا۔ شاید اس لیے کہ وہ پٹر پٹری طرح اُس کے گالوں کو چھو سکے۔

ناز کے دوپٹے نے جیلا کے ماضی کا گھونٹ اٹھا دیا۔ پتھر شاید مال کے دوپٹے سے کھیل رہا تھا۔ جیلا نے آہستہ سے اپنا ہاتھ سر کا یا اور ناز کے میز پر رکھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”میرے دل میں یہ بوجھ کیسا ہے؟“ اُس نے ناز کے ہاتھ کو ہاتے ہوئے کہا۔ ”جیسے میں ڈر رہا ہوں۔“

”بسک گئے جو جیلا ہے؟“ ناز اُس پر اس قدر جھک گئی کہ اُس کی پیشانی کے بال جیلا کی پیشانی کو چھونے لگے۔ بولی۔ ”تم اور ڈر؟“

جیلا نے اپنا سر اور دایاں گال پوری طرح ناز کے ساتھ لگا دیا۔ اُس پر خاموشی سی طاری ہو گئی۔ اُس نے آہستہ آہستہ سر جو گھمایا تو اس کی نظریں اپنے ہاتھ پر پڑیں جس میں اُس نے ناز کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

اُس نے تیزی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

طلسم ٹوٹ گیا۔

پیارے جس بچہ جیسے کو سلا دیا تھا، وہ جاگ اٹھا۔

”نہیں! نہیں!“ وہ غم آلود عرصے میں بولا۔ ”سمت یاد لاؤ مجھے.... لے جاؤ یہ چاتے....“

عورت کی محبت... ایک ڈھونگ، ایک فریب.... وہ زمانہ سبٹ گیا... بچپن برس گزر گئے ہیں میں اب لوٹ کے اتنی دور نہیں جانا چاہتا۔ اس نے میرے بچہ اٹھا کر کہا "اس محبت کو اور گنتے گزرے اس زمانے کو میں نے اس بچہ کی نوک پر رکھ دیا ہے"

"جیدا! ناز نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔ "تمہیں محبت کی سرخوشی کبھی نصیب نہیں ہوتی تم نے شاید محبت کی نہیں دیکھی نہیں... میں تمہیں وہ محبت دے دوں؟"

اب جو دونوں کی آنکھیں کھرائیں تو جیدا کے وجود میں زلزلے پانچوں نے لگے، پھر ایک جان لیوا کشمکش!

"لو چاہتے پی لو"۔ ناز نے پیالی سرکاتے ہوئے کہا "طبیعت سنچل جاتے گی... ٹیڑب میں کیا رکھا ہے"

مگر ناز اس کا چہرہ چھڑ کر پیالی آگے نہ سرکاتی تو شاید طلسم کچھ دیر اور قائم رہتا اور جیدا مسخو ہو کر گھٹنوں کے بل آجاتا۔

"نہیں!" وہ قہر سے دیکھے ہوئے مگر سنبھلے ہوئے لمحے میں بولا۔ "لے جاؤ۔ اٹھا لو... ان برتنوں کی چمک میں مجھے وہ دنیا نظر آتی ہے جسے میں چکنا چور کر دینا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی ہی دنیا میں رہنے دو ناز!"

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"کمال جا رہے ہو؟" ناز نے اسے روکتے ہوئے پوچھا۔

مگر وہ پھیلے کی طرح ایک ہی جہت میں کمرے سے نکل گیا۔

"اپنی دنیا میں"۔ ناز نے جھٹکتی ہوئی سی گونج سن کر پھر یہ گونج بھی جیسے جیدا کے ساتھ ہی باہر نکل گئی ہو۔ اپنی دنیا میں۔

رات آجی گزری۔ ناز جیدا کے انتظام میں بے تاب تھی۔ چائے کے برتن ابھی تک میز پر ہی رکھے تھے۔ ناز جانا چاہتی تھی کہ جیدا کی دلچسپی غیر یقینی ہے۔ وہ آتے نہ آتے، اپنے کسی اڈے یا کسی رنڈی کے کوٹھے پر جا سوتا ہو گا۔ اس کی دنیا وسیع تھی اور ٹھکانے بٹنار کین ناز شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ وہ آج کی رات اکیلے نہیں گزار سکے گی، اس سے نیند نہیں آئے گی اور جیدا نہ آیا تو رات بھر بے چین رہے گی۔ بے تیزی زالی سی تھی رہ رہ کے اس کی نظریں دروازے پر جا پھرتی تھیں۔ ہر آہٹ اسے جیدا کی آہٹ معلوم ہوتی تھی چارپائی پر بیٹھی تھی تو اچانک کے اچھڑھٹ میں نکل جاتی تھی۔ دروازے سے جا کال لگاتی پھر لوٹ آتی تھی، اس نے اپنے آپ میں رقابت کی چنگاری سنکتی محسوس کی اور وہ اور زیادہ بیتاب ہونے لگی۔

وہ گنا کو دھڑام سے چارپائی پر بیٹھ گئی اور اس کا دماغ اپنے آپ ہی کسی اور طرف سے ہو گیا۔ اسے یاد آئی کہ وہ تو اپنے آپ کو اسیروں و ذیروں کی چیز سمجھا کرتی تھی۔ سوسائٹی میں اس کی بڑی مانگ تھی مگر وہ سکے چاہنے لگی ہے؟۔ اس خیال سے وہ جھینپ گئی اور یہ جھینپ بڑی تکلیف دہ تھی۔

اس نے اپنے آپ کو تعین دلایا کہ وہ اس چری، شرابی خنڈے کو نہیں چاہتی اور اسے دھوکے کر میاں سے بھاگ نکلے گی۔ مگر اپنی سوسائٹی کو کیا بتائے گی کہ اتنا عرصہ کہاں رہی؟۔ اس سوال نے جیسے اس کے نورنجیلے ہوں۔ وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

وہ اپنی سچوں میں اس طرح اچھ گئی جیسے دوپٹہ خاردار جھاڑی میں الجھ جاتا ہے۔ ایک طرف سے الگ کرو تو دوسری طرف کے کانٹے اسے پھنسا لیتے ہیں۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ ناز نے جھانک کے دیکھا جیدا کھڑا تھا۔ انھیں چرخی ہوئی، سر ڈول رہا تھا۔ چہرہ شراب کی گرمی اور نشے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ٹانگیں لڑکھڑاہی تھیں۔ ناز اٹھی مگر آگے نہ بڑھی۔

جیدا نے کوا کا سہارا لیا۔ پھر ڈولتے ڈولتے گھٹکاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ اس کا جسم شل تھا۔ دوسری قدم اٹھاتے ہوں گے کہ وہ بڑی طرح ڈولا جیسے گر پڑے گا۔ سنبھل نہیں رہا تھا۔ ناز نے لپک کر اسے تھام لیا اور چارپائی کی طرف لے جانے لگی۔ جیدا کا بے جان جسم ناز پر گرا جا رہا تھا۔

یہ دوسرا موقع تھا کہ ناز اور جیدا کا جسم اس حد تک ایک دوسرے کے قریب آئے تھے، ورنہ جیدا ناز کے جسم سے دور ہی رہا تھا۔ میسرہ دوڑا لے کمرے میں بھی اس کے قریب نہیں گیا تھا اور اسے اپنے

کمرے میں قید رکھ کر بھی اس کے جسم سے دور رہا تھا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ ناز کو اچھا لگنے لگا تھا۔

آج رات جب جیدا کا جسم بے بس ہو کر مکمل طور پر ناز کے بازوؤں میں آیا تو اسے ایسا سکون محسوس ہوا جو اس کی روح تک اتر گیا اور چند لمحوں پہلے اس کے دماغ میں جو سوچیں آتی تھیں، وہ دھوپ کے ساننے دھند کی طرح اڑ گئیں۔ جیدا کے منہ سے بدبو کے بھبھوکے نکل رہے تھے لیکن ناز جیسے اس بدبو سے بے نیاز اور لاتعلقی ہو گئی تھی۔

چارپائی کے قریب پہنچ کر اس نے جیدا کو لٹا دینا جا ہا مگر غرا دی طور پر رک گئی۔ اس نے جیدا کے ہاتھ تے ہاتھ رکھ کر اس کے ڈھلکے ہوئے سر کو اوپر اٹھایا اور اپنا گال اس کی پیشانی پر اس قدر زور سے دبا کہ

وہ چونک اٹھی۔
”خدا جانے کتنی کچھ پی آئے ہوں۔“ ناز نے اسے چار پانی پرٹا تے ہوئے کہا۔ ”اپنی بھی کچھ نوش رکھا کرو۔“

جیدا سننے اور سمجھنے کی حالت میں نہ تھا۔ ناز جانتی نہ تھی کہ ایسے مدبوس آدمی کو کس طرح سنبھالتے ہیں وہ اُسے ہوش میں لانا چاہتی تھی ورنہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ سونہ سکے گی۔ وہ اپنے آپ میں ایسا جذبہ سوس کر رہی تھی جس میں ہری کی محبت تھی، بہن کا پیار اور مال کا انشار تھا۔

وہ اُسے اچھی طرح لٹا کر باورچی خانے میں لگتی اور پیالے میں پانی بھر لاتی۔ جیدا کے سر ہانے بیٹھ کر دھال پانی میں بھگو اور تڑکھ کر کے اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ جیدا اکھڑی اکھڑی سانس لے رہا تھا۔ رات گذرتی چلی گئی۔ ناز جیدا کا سر اپنے زانو پر رکھے اس کی پیشانی کو مسلاتی بھی رہی اور بھیجے ہوئے دھال سے ٹھنک بھی پہنچاتی رہی۔ وہ اُس پر کئی بار جھکی۔ اسے شراب کی ٹوہری نہ لگی۔

بتی کا تیل ختم ہو گیا شعلہ کا نپا اور آہستہ آہستہ بجھ گیا۔ اس اندھیرے میں کس قدر قہر تھا، اس شخصیت جاری میں کس قدر لذت تھی جیدا کا سر گود میں رکھے اس کی خدمت میں کس قدر سکون تھا۔ ناز ایسے سرور سے ہوش ہونے لگی جس کا ذائقہ اس نے پہلے بھی نہ چکھا تھا۔

صبح کی سپیدی کمرے میں داخل ہوتی تو ناز نے جیدا کا سر نہایت آرام سے اپنی گود سے بیٹھا کر سر ہانے پر رکھ دیا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے چھوٹی میز چار پانی کے قریب رکھی اور کرسی بھی اُس کے ساتھ رکھ کر چلا گیا۔

چند منٹ بعد ناز کمرے میں آئی۔ ماتھے میں ناشتہ تھا۔ ٹرے میز پر رکھ کر جیدا کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ لڑکا پانی سے بھرا مین اور تولیہ اٹھاتے کمرے میں آیا۔ مین چار پانی کے پاس اور تولیہ چار پانی پر رکھ کر چلا گیا۔

جیدانے کچھ کھولی۔

”نہی! جیدانے آہستہ سے کہا۔ سر کو ذرا سا گھما کر بلند آواز سے بلایا۔ ”شہمی!“

ناز سامنے آگئی۔

”اوہ ناز! وہ حیران سا ہو کر اٹھ بیٹھا۔ لہجہ کو دیکھا۔ کمرے کو دیکھا، پھر ناز کو دیکھا۔

”لو منہ ماتھ دھولو۔“ ناز نے مین آگے سر کاٹے ہوئے کہا۔

جیدا حیرت زدگی کے عالم میں ناز کو دیکھ رہا تھا۔ ناز اس کی کیفیت سمجھ رہی تھی۔ اس نے مین اُس کے پاؤں میں رکھ کر اُس کے سر کو جھکا دیا۔

”اے تڑے سو گئے۔ ابھی منہ ماتھ دھونے کی تیر نہیں آتی۔“ ناز نے اُس کا سر اڑھکاتے ہوئے مین سے چلو بھر بھر کے اس کے منہ پر جھینٹ مارے اور بچے کی طرح اُس کا منہ دھو ڈالا۔ پھر اس کا چہرہ اوپر کر کے تولیے سے صاف کیا اور تولیہ اس کے کندھے پر ڈال دیا۔

ناز نے یہ سب کچھ اس قدر تیزی اور بلندی سے کیا کہ جیدا کو مزاحمت کرنے یا کچھ کہنے یا سوچنے کی فرصت

ہی نہ ملی۔ ناز کی اس بے تکلفی اور بیباکی میں ایسا اثر تھا کہ جیدا دم بخود سا ہو گیا۔ شہمی، کچی، بالی اور گلزار نے اسے ہر طرح کی جمائی لذت اور مسرت دی تھی لیکن آج ناز کے والہانہ انداز میں اُس نے جواہریت اور سرخوشی محسوس کی وہ اس کے لیے اُنکھی تھی۔ اُس کی حالت اُس انسان کی سی ہونے لگی جس نے پہلی بار شراب پی ہو۔ دل پر لغزش کا بوجھ، دماغ میں خمار۔

”لو ناشتہ کرلو۔“ ناز نے کہا۔

”یہ برتن کہاں سے آئے ہیں؟ جیدانے تعجب سے پوچھا۔

”تم نے کل اتنے سارے پیسے جو دیے تھے۔“ ناز نے کہا۔ ”میں نے یہ برتن اور دو چار اور چیزیں منگوائی ہیں۔“

”میں رات یہیں سویا تھا؟“

”ہاں!“

”اور تم؟“

”فرش پر۔“

”مجھے یہاں کون لے آیا تھا؟ میں تو شہمی کے پاس تھا۔“

”تم خود ہی آئے تھے۔“

”تم فرش پر کیوں سوتی تھیں؟ جیدانے ایسے لمحے میں کہا جیسے ناز کا فرش پر سونا اسے ناگوار گزرا ہو۔ اس کے لمحے میں اس کی جھلک بھی تھی۔ بولا۔ ”مجھے اُس کمرے میں کیوں نہ پھینک دیا۔“

”پتھر تو نہیں ہونم کو پھینکے تھی۔“ ناز نے پیار سے کہا۔

”لو اور کیا بولیں؟“ وہ ناز کی طرف دیکھ کر ایک لمحہ چپ رہا پھر قدرے دیکھے ہوئے لمحے میں بولا۔

”ناز! میں پتھر ہی ہوں۔“

”لیکن تم انزل پتھر ہو۔“ ناز نے شگفتہ مزاجی سے کہا اور اُسے اپنی انگوٹھی کا نگینہ دکھا کر بولی۔

”یہ بھی تو پتھر ہی ہے۔“

”ناز! جیدانے آہ لے کر کہا۔ ”مجھ پر ایک کرم کرو۔۔۔ میری ایک بات مان لو۔“

”کیا؟“

”مجھے میری ہی زندگی چھین دو۔ جیدانے کہا۔ ”میں آشیانے اجاڑتا ہوں بنانا نہیں ہوں۔“

”یہ بھی کوئی جینا ہے؟“

”دیکھ لو، جی رہا ہوں۔“

”تم سو آشیانے اجاڑو جیدا! سو آشیانے جلا دو، صرف ایک آشیان مجھے آباد کر لینے دو اور اسے آباد

ہی رہنے دو۔۔۔ چاہتے پتھر، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

جیدانے جانے کی پیالی اٹھائی۔ ایک گھونٹ پیو اور ٹوسٹ اٹھا کر کہا۔ ”میں کسی کے خون سے اپنے

ہاتھوں میں منہ پی نہیں لگاؤں گا۔ میں رستے بسنے گھراؤں کو لٹتا ہوں پھر غورٹس جاتا ہوں۔ بنارہوں پٹپے

دوستوں اور رنڈیوں کو دے آتا ہوں، شراب پی لیتا ہوں، چرس پی لیتا ہوں۔“

”جوجی میں آتے کرو جیدا۔ ناز نے چپ ہو کر نظریں جھکا لیں۔ دو چار تانے بعد نظریں اٹھا کر ملتی لہجے میں بولی ”مجھے یہ گھر بسا لینے دو۔ پھر تم مجھی کبھی جب تمیں کبھی فرصت ملے، رات کی طرح میں نے ملو کھڑا تے یہاں آکر اورو میں تمیں تھا کر گو میں سلا لیا کروں گی تم نقب لگا کے آؤ، غول کر کے آؤ لیکن یہاں آجا کر دو۔ میں تمہاری راہ میں نہیں آؤں گی، تمہاری راہ دیکھا کروں گی۔ مجھے ایک عارضی سی منزل سمجھ لو جیدا! دم بھر کو سنا اور آگے چل دیتے۔“

”میں تمہاری ان باتوں کو سمجھتے ہوئے بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتا۔“
”کیونکہ تم سمجھنا نہیں چاہتے۔“ ناز نے کہا۔ ”تم اپنا روپ بدلنا نہیں چاہتے۔“
”اوہ۔“ جیدا نے طنز پر لہجے میں کہا۔ ”تم میرا روپ بدلنا چاہتی ہو۔ کل مجھے کچھ دوگی کہ حبیب تراشی اور چوری چکاری گناہ ہے۔“

”نہیں۔“ ناز نے جذباتی سے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارا روپ نہیں بدلوں گی پھر نہیں دوں گی میں بھی گناہ گاروں میں تم بھی گناہ گار ہو گناہ سے پیار ہوتا ہے۔ انسان ایک گناہ کر کے دوسرا گناہ کرتا ہے کہ جھوٹ بولتا ہے کہ اس نے گناہ نہیں کیا گناہ کو گناہ چھپا سکتا ہے، جس طرح تم نے مجھے چھپا رکھا ہے۔“

اور میں تمیں اپنے سینے میں چھپا لینا چاہتی ہوں۔
پالیوں میں سے جھاپ اٹھ رہی تھی کراچی کا شور ابھر تے سورج کے ساتھ ابھرتا تھا۔ جیدا اذنا ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے اپنا اپنا دل کھول کر ایک دوسرے کو دکھا رہے تھے۔ ناز کی آنکھوں میں شب بیداری کی لٹکان خمار بن کر اس کے جن کو سحر انگیز بنا رہی تھی۔ بھرے بھرے بے ترتیب بال اسے نیا روپ دے رہے تھے۔ جیدا پہلی بار محسوس کرنے لگا تھا کہ ایک زنجیر اس کے گرد لپیٹی جا رہی ہے اور وہ آزاد ہونے کو ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔

”ایک منزل!۔“ جیدا نے زیر لب کہا۔ ”بھرا ایک لمبی آہ لے کے بولا۔“ میری رامیں منزل کے فریب سے جیسا آزاد رہی ہیں ناز میں رات تم سے جھاک گیا تھا۔ صرف اس لیے کہ مجھے تمہاری ذات میں، تمہاری مسکراہٹ میں، تمہاری ہر بات میں اور چاہنے کی پیالی میں منزل کی کوئی تھی۔ ایک کھوئی ہوئی جھپی ہوئی منزل کی بو۔۔۔ مجھ سے بہت کچھ میں لیا گیا تھا ناز اس وقت میں ذرا جتنا بڑھتا تھا۔
”تم تو اب بھی پیچھے ہی ہو۔“ ناز نے مسکرا کر اس کی مزاحیہ کھوئی کو ذرا کم کرنے کی کوشش کی۔ بولی۔

”چاہے پیو، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“
جیدا نے پیالی کو دیکھا چند لمحے دیکھتا رہا پھر غصاٹ پوری پیالی پی لی اور پیالی پرچ میں رکھنے کی بجائے ناز کی طرف بڑھا دی۔ ناز نے پیالی پھر بھری۔
”کیا سوچ رہے ہو؟“ ناز نے کہا۔ ”آئی جلدی اداس نہ ہو جا یا کرو تم جیسے آدمی کو تو بہت سے کھیلے رہنا چاہیے۔“

جیدا نے یہ پیالی بھی پی ڈالی۔

”کچھ پیسے ہیں؟“ ناز نے پوچھا۔

”شام کو مل جائیں گے۔“ جیدا نے کہا اور دوسرے کمرے میں جا گیا۔

جیدا کمرے میں داخل ہوا تو منٹا اوٹھ پوچھا اُٹھے تھے۔ اُسے دیکھ کر تھکی تھکی سی آنکھیاں لہیں اور اُٹھ بیٹھے۔ منٹے نے سر ہانے کے نیچے سے چرس کی گولی نکالی پھر سگریٹ میں سے تبا کو نکالنے لگا۔
”ابن کے بال بچوں کو کسی اور جگہ منتقل کرو۔“ جیدا نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔
”کس جگہ؟“ منٹے نے پوچھا۔

”تم دیکھ لو! ان کی جگہ مناسب ہے۔“ جیدا نے کہا۔ ”پولیس کو پتہ نہ چلے۔“

”کوئی جھکی خالی کروا لیں؟“ ٹیپو نے پوچھا۔

”دیکھو!۔“ جیدا نے دیا سوچ کر جواب دیا۔ ”تین ہزار ڈھ کیسار ہے گا؟ دوسرے دونوں اڈوں کا

پولیس کو علم ہے تیسرا خالی کرالو۔“

”ہاں!۔“ منٹے نے چرس بھرے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔ ”وہ جگہ بھی اچھی ہے اور استاد وائل

جاہوی کو کوئی آہ نہیں سب دوسرے اڈوں پر جاتے ہیں۔“

”ہزار تیسے کی ٹیکسیاں لے لینا۔“ جیدا نے منٹے کے ہاتھ سے سگریٹ لیتے ہوئے کہا۔

”لیکن رات بہت دیر بعد۔ اور یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں کہ ان کی بیٹی باہری کو۔۔۔“

”بہیں بادل سمجھ لیا ہے استاد؟“ ٹیپو نے سنجیدگی سے کہا۔

”دوسری بات!۔“ جیدا نے چرس کا دھواں اگل کر سگریٹ ٹیپو کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ”اپنے پاس

پڑھا لکھا اور دیانت دار لو! ان کوں سا ہے؟“

”سالے بھی بڑھے لکھے ہیں۔“ ٹیپو نے جواب دیا۔

”دیانت دار تو وہ ہے۔“ منٹا بولا۔ ”کیا نام ہے اُس کا۔۔۔۔۔ اُسے دی جس نے اُس روز آٹھ سو

کا ہاتھ مارا تھا۔“

”کون؟ غوث؟“

”ہاں! ادبی!“

”اُسے ان کے خاندان کی دیکھ بھال پر لگا دو۔“ جیدا نے کہا۔ ”اور اُسے صرف اسی کام پر

کار بہنے دو۔“

”غلط بات!۔“ ٹیپو نے مخالفت کی۔ بولا۔ ”یہ کام لوٹوں چھپو کروں کا نہیں تمہیں لڑکی کا خیال ہے تو

ونڈے کے کوہاں نہ بھیجو۔“ دیا سوچ کر کہنے لگا۔ ”میں خود سمجھاں لوں گا تم مجھے بتاؤ کیا کرنا چاہیے۔“

”ہاں استاد! لوٹنا بیکار ہو جائے گا۔“ منٹے نے کہا اور ٹیپو کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر ایک

بسی کش میں جو کر ڈالا۔

”اور سونو!۔“ جیدا نے کہا۔ ”اس کے بچوں کو سکول داخل کرادینا۔ ان کے پاس روپیہ بہت خیر ہے۔“

پیسے کا معاملہ میں خود سمجھاں لوں گا۔“ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”ان کے سمن شاہ کے تھانے میں ہیں

اُسے کہنا دو چار سو لے لو اور سمن مین غین کرو۔ ان کے متعلق پوچھے تو کہنا جس اس کا کچھ پتہ نہیں۔“

جیدا باہر نکلنے لگا تو رگ گیا اور بولا۔ ”اپنے تمام چھپو کروں سے کہنا کہ اپنے ہاتھ سے باہر نہ جانا

نہیں۔ پرسوں بشیر سے نے گا کہ کیا تھا کہ ہمارا ایک چھوٹا اُس کے علاقے میں سے دو سو کی آسانی ملا یا ہے۔“

یہ حرکت ٹھیک نہیں۔ اگر آسانی دانت سے نکل جاتے تو جانے دو۔ دوسرے کے علاقے میں مت جاؤ وہاں کے استاد کو خبر کرو جنہیں کاٹو، ایمان مت خراب کرو میز سرور سڑل کے سامنے نیچا نہ کرو۔ وہ بات کہی رہا تھا کہ ناز کا خدمت گار لڑکا دانت میں شے اور ٹیپ کے لیے ناشتہ اٹھائے مگر میرے میں داخل ہوا۔ یہ ناز نے مجھوایا تھا، ورنہ وہ لوگ تو ناشتے کی پابندیوں سے آزاد تھے۔ انہوں نے نہ ہی پہچان لیا۔ دیکھیں، ٹوسٹ دیکھتے تو وہ بھرتے خوش ہونے کے سنجیدہ ہوتے۔

”یہ کیا ہے؟ منے نے جیسا ہے پوچھا۔

”ناشتہ ہے تمہارا؟“ جیلا بولا۔ ”ناز نے بھیجی ہے۔“

منے اور ٹیپ نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور یوں اپنے درمیان کھی لڑے کی طرف دانت بٹھا کر جیسے غلاب مرضی اپنے استاد کے حکم کی تعمیل کر رہے ہوں جیلا مگر سے بے نکل گیا۔ جیلا سورج غروب ہونے کے بعد واپس آیا۔ وہ جلدی میں تھا۔

”میتیں کتنے پیپل کی ضرورت ہے؟“

ناز نے مگر سے میں کرسی پر بیٹھی جیلاوں میں مگر تھی کہ جیلا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”اوہ تم آگئے۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”پیسے؟ جتنے دے سکو۔“

جیلا نے تپلون کی جیب سے پانچ اور دس دس کے بہت سے نوٹ بے پروائی سے اس کے سامنے پھینک دیے۔

”کس کا گھر جا رہا ہے؟“ ناز نے پوچھا۔

”چوری کا مال میں۔“ جیلا نے مگر سے میں ٹپتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ حلال کی کمائی ہے۔“

”حلال کی کمائی؟“ ناز ہنس دی۔ بولی۔ ”اور تمہاری جیب میں؟“

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ جیلا اور سنجیدہ ہو گیا۔ بولا۔ ”غلاش میں جیتا ہوں۔“ اور وہاڑے

کی طرف چل پڑا۔ رک کے پوچھا میں غبار ہوں.... اور کچھ چاہتے؟

”تم خود ہی آجانا۔“ ناز نے شہزادہ امیر مسکراہٹ سے کہا۔

”کیسی کام کی چیز تھوڑے ہی ہوں۔“ جیلا نے کہا۔

”تو کوئی کام کے دو آدمی بھیج دینا۔“

”کام کیا ہے؟“

”پرست پوچھو۔“ ناز نے چپکتے ہوئے کہا۔ ”اور تم گھبراؤ نہیں میں بھاگوں گی نہیں کچھ فرنیچر منگواؤں گی۔“

جیلا کے ساتھ کے شکن ذرا گھر سے ہو گئے۔ اس نے ناز کو دیکھا اور باہر نکل گیا۔

وہ رات کو نہ آیا۔ صبح بھی نہ آیا۔ ناز نے رات کو گھر کے کچھ سامان کی فہرست بنائی تھی۔

صبح جیلا کے پیچھے ہوئے دو آدمی آگئے۔ ناز نے انہیں فہرست دے کر چند ایک مبالغہ

دیں اور رقم ان کے حوالے کر دی۔ پھر اپنے خدمت گار لڑکے کو ساتھ لے کر نکل گیا مگر سے کو کو کو کو اس سے

پہلے کبھی نہیں کھولا گیا تھا۔ وہاں چند ایک ٹوٹی چھوٹی چار پائیاں رکھی تھیں اور تمام کمرہ جالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ناز نے لڑکے کو ساتھ لگا کر دونوں کمروں کی خوب صفائی کی چھت اور دیواریں تک جھاڑوا لیں۔

رات کا پہلا مہرگز رہا تھا جب جیلا واپس آیا۔ منٹا اور ٹیپ بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ بھی تمام دن غائب رہے تھے۔ جیلا اپنے کمرے میں داخل ہوا تو ٹھٹھک کے رہ گیا۔ کچھ کچھ نظروں سے مگر سے کو دیکھنے لگا۔ ناز کڑی مسکراہٹ تھی۔ اس کا حال حلیہ بلے سے نکالی ہوئی لاش سے ملتا جلتا تھا۔ وہ ابھی ابھی کمروں کی جھاڑ پونچھ اور سجاوٹ سے فارغ ہوئی تھی۔

جیلا اپنے کمرے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے غلطی سے کسی اور گھر میں آن گھسا ہو۔ اس کے کمرے میں سفیدی نہیں ہوئی تھی۔ کواڑوں پر رنگ نہیں ہوا۔ ناز نے وہاں صوفے نہیں رکھے تھے۔ قالین نہیں بچھائے تھے۔ ریشمی پردے نہیں لٹکائے تھے۔ مگر سے میں عطر کی خوشبو نہیں تھی۔ وہاں صرف یہ انقلاب آیا تھا کہ جالے صاف ہو گئے تھے۔ اور دیواریں جھاڑ دی گئی تھیں۔ کواڑ چھل گئے تھے۔

اس صفائی کے علاوہ کمرے میں یہ تبدیلی آئی تھی کہ جیلا کی صدیوں پرانی میز اور پرانی کرسی وہاں نہیں تھی۔ جیلا جب اس کرسی پر بیٹھ کر کنہیاں میز پر رکھا کرتا تو میز اور کرسی دائیں بائیں ہلتے رہتے تھے۔ ان دونوں کی جگہ اب وہاں تری میز اور تری کرسی رکھی تھی۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کی چھوٹی سی الماری رکھی تھی۔ مگر سے کے درمیان معمولی سی مگر تپائی پڑی تھی۔ دوسری دیوار کے ساتھ نیا پلنگ پڑا تھا اور اس پر نیا پلنگ پوش تھا۔

”تو نے میرا کمرہ اجاڑ کے ہی دم لیا۔“ جیلا نے اس سے سنجیدگی سے کہا۔

ناز نے آگے بڑھ کر جیلا کو کلائی سے کپڑا اور دوسرے کمرے میں لے گئی۔ وہاں دو نئے پلنگ رکھے تھے۔ ان کے درمیان ایک تپائی تھی اور تپائی پر مصنوعی چھوٹوں کا گلدستہ تھا۔ دیواروں کے ساتھ میز پر لٹک رہی تھیں۔ جیلا نے ان پر اس طرح نگاہ ڈالی جیسے دیکھ کر بھی نہ دیکھی ہوں۔

ناز اسے پہنے کمرے میں لے آئی۔

”اب تم اس کرسی پر بیٹھو۔“ ناز نے کہا۔ ”میں کھانا لاتی ہوں۔“

جیلا کھوپا کھوپا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ ناز باورچی خانے میں چلی گئی جیلا کے دل و دماغ اس قدر دل فریب تبدیلی کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ اسے پسند بھی کر رہا تھا ناپسند بھی۔ اس کے اعضاء اس قدر خوبصورت گھر کے متحمل نہیں ہو رہے تھے۔ یہ کوئی بستر شا گھر تھا۔

جیلا کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ دولت تو ہر جگہ کا کھیل تھا۔ مگر دولت کو اس نے کبھی یوں استعمال نہیں کیا تھا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ گرد سے اٹے ہوئے فرش پر بیٹھ چھیلے بستر میں ہی سو جاتا تھا۔ آج جب ناز نے اس کے لیے نواری پلنگ بچھا دیتے اور اس اندھیرے غار کو فرنیچر اور تصویروں سے سجایا تو جیلا کی حالت اس دائمی مرض کی سی ہوئے لگی جو برسوں سے پرہیزی غذا کا عادی ہو چکا ہو اور اس کے پیٹ میں مرغی غذا ٹھونس دی جاتے۔

یہ آباؤ آشیانہ اسے پریشان سا کر رہا تھا۔ اس کا دماغ اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس کا ذہن پلٹ کر ماضی کی منزل میں طے کرنے لگا۔ وہ ایک کش مکش میں مبتلا ہو گیا۔

اس دہری کش مکش میں اس نے دیوار پر نظر ڈالی اور تصویریں دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں ایک تصویر پر جم

کے رگتیں، جواں سال عورت ننھے سے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی مصوٰر نے عورت کے غم و حال میں مانتا کو دلکش رنگوں سے سمیٹا تھا۔ ایک ایک روتیں سے مانتا بھوٹ رہی تھی۔ سچ مسکرا رہا تھا ایسی کلاٹ جس میں قدرت کی تمام تر سرسریاں اور رعنائیاں رچی ہوئی تھیں۔ عورت کی مسکراتی آنکھیں بچے کو دیکھ رہی تھیں۔ ناز نے یہ تصویر خاص طور پر منگوائی تھی۔ اُسے یاد تھا کہ وہ کبھی بار بار اپنے بھائی کے ساتھ کراچی آئی تھی تو صدر کے علاقے میں اس نے دو تین دوکانوں میں یہ تصویر دیکھی تھی۔ آج اس نے چھوکرے کو سمجھا بھجا کر بازار بھیجا تھا اور وہ یہ تصویر ڈھونڈ لایا تھا۔

جیڈا نے اس تصویر سے نظریں ہٹانے کی کوشش کی مگر بٹانہ نہ سکا۔ اُس کے دماغ میں جیسے سوتیاں سی چھینے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ذہن میں بچے اٹھنے لگے، نفرت، حقارت، غصہ۔ انتقام، تلخ کامی، تشنگی اور جانے کیسے کیسے تباہ کن، زہر آلود جذبات جیڈا کو جھنجھوٹنے لگے۔ یہ سارا طوفان ایسی تیزی سے اٹھا کہ جیڈا بے ہوش ہی نہ سکا۔

اُس کی نگاہوں نے اب تصویر سے ہٹنے کی جدوجہد نہ کی۔ جیڈا تصویر کو دیکھتا رہا، پھر اُس پر وحشت طاری ہونے لگی۔ وہ ماضی کی کسی ایسی منزل پر پہنچ گیا جواس سے چھین لی گئی تھی۔ جہاں سے اُسے نکال دیا گیا تھا اور اب یہ منزل جل رہی تھی۔

جیڈا جل اٹھا۔

وہ تصویر پر نظریں کاڑھے ہوئے تھا جیسے تصویر نے اُسے سینما نماز کر لیا ہو۔ چہرے پر وحشت اور بربریت کے تاثرات ابھر آتے تھے اور اس کا ایک ہاتھ ناف کی طرف جا رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے پستول سامنے آگیا۔ جیڈا نے پستول تصویر کی طرف کیا اور دھاتیں دھاتیں کے دو دھماکوں نے کمرے کو ملبا کے کرکے دیا۔ ایک گولی ماں کے سینے میں لگی دوسری۔ بچے کی پیشانی کو چیر گئی۔ تصویر کا شیشہ چکن چور ہو گیا۔ مگر جیڈا کا ماضی اُس کے سامنے دیوار کے ساتھ لٹک رہا۔

اگر کچھ دیر اور تنہا رہتا تو جانے کیا کر لڑتا لیکن اسے اتنی صلت نہ ملی۔ مٹا، ٹیپو، دولہا کے اور ناز کو لیبوں کی آواز سننے سے ہی کیوں لی طرح کمرے میں آ پہنچے۔

یہ کچھ توجہ دیکھا کہ زمین دوڑاؤ تھا جہاں۔ لے مکینوں کو معلوم تھا جانے کس وقت کیا ہو جائے۔

وہ بے رحم چوکس اور تیار رہتے تھے جیڈا کے ساتھی مرنے مارنے کے لیے دوڑے آئے تھے لیکن دیکھو جیڈا کو کسی پریشیا تصویر پر نظریں کاڑھے ہوئے تھا۔ پستول ہاتھ میں تھا اور چو لال سرخ، پیشانی پر پسینے کے قطرے اور اذیت انسانی شخص کے حالت میں پس رہے تھے۔

”کیا بڑا جیدے!“ ناز نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”گولی کیسے چلی؟“ وہ چپ چاپ تصویر کو دیکھتا رہا ٹیپو نے اُسے دیکھا پھر تصویر کو دیکھا۔ وہ بات سمجھ گیا۔ مٹا اور ٹیپو اس کے ہمراز تھے، بہت پرانا ساتھ تھا ان کا۔ اس کے مزاج کے زیر و بم کو سمجھتے تھے۔

”جیدے!“ ناز نے اُسے کندھوں سے کپڑے جھنجھوڑا۔ ”جیدے!“

جیڈا چپکا۔ ناز کی طرف دیکھ کر بغیر اُس نے سر پر پھینک دیا اور چہرہ دونوں بازوؤں میں چھپا لیا اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ کندھوں کی لرزش سے معلوم ہوتا تھا اُس کی گھٹکی بند کئی تیس

”سب چلے جاؤ۔“ ٹیپو نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”مٹے اسکرپٹ بھلاؤ۔“

لو کے چلے گئے۔ مٹا اسکرپٹ میں چرس بھرے اپنے کمرے میں چلا گیا اور ناز وہیں کھڑی رہی۔

”تم بھی چلی جاؤ۔“ ٹیپو نے ناز سے کہا۔

لیکن وہ جانا نہ چاہتی تھی اُس نے ٹیپو کی طرف دیکھا جیسے کہ رہی ہو۔ ”میں اسے اس حالت میں چھوڑ کر کیسے چلی جاؤں؟“

”ناز!“ ٹیپو نے جھجکا کر کہا۔ ”تم یہاں سے چلی جاؤ۔“

ناز چلی گئی۔

ٹیپو نے جیڈا کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔ مین کی دراز سے دسکی کی بول نکالی اور کارکن نکال کر بول جیڈا کے سامنے رکھ دی۔ مٹا اسکرپٹ میں چرس بھر کے لے آیا۔ ٹیپو نے جیڈا کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُس نے سر اٹھا کر ٹیپو کی طرف دیکھا۔ لال سرخ آنکھوں میں آنسو تھے۔ مٹے لے اسکرپٹ سکا کر اس کی طرف بڑھایا اور ٹیپو نے دسکی کی بول سر کا دی۔ جیڈا نے اسکرپٹ کا لباس لیا اور آہستہ آہستہ دھواں لگنے لگا۔ ٹیپو نے ماں اور بچے کی تصویر پر نگاہ ڈالی جواب کھل کے ساتھ ڈرائیو میں ہو کے لٹک رہی تھی پھر اس نے قرا کو دھماکوں سے کمرے کا جائزہ لیا اور مٹے کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ناز ٹیپو کے کمرے میں کھڑی تھی۔ مٹا دیوار کے ساتھ بیٹھ لگا۔ مٹھا تھا۔ ٹیپو کمرے میں ٹپل رہا تھا۔ اُس کے اترے ہوئے چہرے پر غصے کا تاثر تھا۔

”آج تم جو کیا تھا؟“ ناز نے ان سے پوچھا۔ اس نے پسینے سے پوچھا لیکن ٹیپو اور مٹے نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔

”تم پہلی عورت جس پر اسٹاؤ نے اتنا برا کرم کیا ہے۔“ ٹیپو نے رک کر کہا۔ ”معلوم نہیں کیوں؟“ میں نے تو کچھ اور پوچھا تھا ٹیپو!“ ناز نے کھڑکی ماکن کے انداز میں جھکا نہ لیجے میں کہا۔

”سُن چھو کر!“ ٹیپو نے اُسے تلخ اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”ہم لوگ سچے سچے گھڑلوں میں رہنے والے نہیں ہم زمین کی تہوں میں جینے والے انسان ہیں۔ ہم بچے تھروں کو اجاڑتے ہیں۔ گھر بسا نے نہیں ہم راتوں کو جاگتے ہیں دن کو سوتے ہیں ہم سونے چاندی سے کھیلنے میں لیکن سوتے اس مٹی میں ہیں۔“

”میں جیڈا کو اس ذلیل زندگی میں نہیں رہنے دوں گی۔“ ناز نے ذرا تن کر کہا۔

”تم خطرہ مول لے رہی ہو۔“ ٹیپو بولا۔

”کیسا خطرہ؟“ ناز نے طنز پر پوچھا۔ ”اپنی جان کا؟ مجھے اپنے مر جانے کا ڈر نہیں۔“

”تمہارے مر جانے کا کسی کو ڈر نہیں۔ مٹا فوس ہوگا۔“ ٹیپو نے ناز کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں“

جیڈا کے مر جانے کا ڈر ہے۔ وہ جیتے ہی مر جائے گا۔“

”وہ تصویریں وہاں سے بٹاؤ۔“ مٹے نے کہا۔

”یہ کنگ اور کرسیاں وہاں سے اٹھاؤ۔“ ٹیپو نے غصے سے کہا۔ ”یہ ٹھانڈا جیڈا کے لیے موت ہے۔ وہ خودکشی کرے گا۔ آج وہ اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔“

”تصویریں وہیں رہیں گی۔“ ناز نے تلخی سے کہا۔ ”سب کچھ وہیں رہے گا۔ یہ جیلا کے لیے ہے۔“
 ”پاکل نہ بنو لڑکی اچھروں سے نہ بھراؤ تم سوچو۔“ ٹیپو نے طنز کو مسکراہٹ سے کہا۔
 ناز کچھ کہنے سی لگی تھی کہ جیلا کے کمرے میں بے ہنگم کھٹکا جوا ناز دوری پہنچی۔ دیکھا جیلا فرش پر
 پڑا تھا کرسی ایک طرف تھری ہوئی تھی۔ وہ سکی کی غالی تولیہ پر پڑی تھی۔ وہ بہت زیادہ پی گیا تھا۔ شراب کے
 ساتھ وہ چرس بھی بیٹا رہا تھا۔ دو لون چیزوں نے بل کر اسے اندھا کر دیا ناز اسے اٹھانے لگی لیکن اس کا بوجھ
 اس کی طاقت سے زیادہ تھا۔

مٹا اور ٹیپو بھی پہنچ گئے۔ ایک نے جیلا کی ٹانگیں پکڑیں، دوسرے نے بازو اور اسے لاش کی
 طرح اٹھا کر پلنگ پر پھینک دیا۔ مٹے نے اس کی چپل اتاری اور تپوں کی پٹی ڈھیلی کر دی۔ ناز کو ان کے اس
 گنوار پہنے پغصہ آیا اور جیلا پر افسوس بھی ہوا۔
 ”ڈار ہنہ دو۔“ مٹے نے کہا۔

”اس کے مُنہ میں پانی ڈالوں؟“ ناز نے گھبراتے ہوئے آواز میں پوچھا۔
 ”گھبراتے کیوں ہو؟... مرنے نہیں۔“ مٹے نے طنز پر لہجے میں کہا۔ ”زیادہ پی گیا ہے۔“
 ”شراب اور چرس پر ہی تو یہ زندہ ہے۔“ ٹیپو نے بریکنگ سے کہا۔

وہ دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے لیکن ناز اپنے آپ میں نہ تھی اُسے یوں لگا جیسے اُس کا جہ
 سمارا اُس سے چھن رہا ہے۔

اس اندھیرے غار میں جیلا ہی اس کا سہارا تھا۔ مٹے اور ٹیپو کے رویے میں جو غیریت تھی ناز کو
 اس سے نفرت تھی جیلا ان دونوں کا استاد تھا لیکن ناز یوں محسوس کرتی تھی جیسے یہ دونوں جیلا کو خراب
 کر رہے ہوں۔

وہ جیلا کے سرٹانے کھڑی اسے ٹھکی باز رہے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سوچا جیلا پاگل تو نہیں ہو گیا؟
 خود کشی تو نہیں کر لے گا؟ ناز کا دل ایسے اذیت ناک خدشوں کو قبول تو نہیں کر رہا تھا لیکن کوائف اور قرائن
 سرور ہم سنوار ہے تھے جیلا نے اتنی پیاری تصویر کو گولی مار کر توڑ ڈالا تھا۔ وہ رویا بھی تھا اور اب وہ ہوش
 بھی پڑا تھا اور اس کے ساتھیوں نے اُسے دراز کی طرح اٹھا کر پلنگ پر پھینک دیا تھا۔

”آخر یہ سب کیا ہے؟ ایسے کیوں جوا تھا؟“ ناز بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ اس کو کبھی دنیا میں
 وہ مٹی تھی، کچھ بھی نہ جانتی تھی۔ وہ انسانی نفسیات سے بے بہرہ تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ جرم پیشہ انسان
 نارل نہیں ہوا کرتے، وہ فیم پاگل ہوتے ہیں وہ تو اپنی نفسیات سے بھی واقف نہیں تھی۔ اسے بھائیوں
 نے انبار دل بنایا تھا، اسی لیے اسے انبار دل آدمی ہی اچھا لگتا تھا۔ یہ ذہن لاشعور کی کرشمہ سازیاں تھیں۔

وہ اسی قدر جانتی تھی کہ جیلا بے ہوش ہے۔ بے بس ہے اور وہ خود اس سے کہیں زیادہ بے بس
 ہے۔ اُس نے پہلی بار محسوس کیا جیسے جیلا سے اُسے بے پناہ محبت ہے اور وہ دونوں جرم پیشہ دنیا میں
 بھٹک کے چلے آتے ہیں اور وہ دونوں یہاں قیدی ہیں۔ جیلا بھی ناز بھی!
 بے ہوش جیلا کو دیکھ کر ناز کو ایک ثانیہ کے لیے بول محسوس ہوا جیسے جیلا اُس کی کوکھ سے پیدا ہوا
 ہو سکی کی طرح یہ خیال سامع کا اور سمجھ گیا اور ناز کے آنسو نکل آئے۔

دو مہینے گزر گئے۔

تصویر اُسی حالت میں دیوار کے ساتھ لٹکتی رہی، جیلا کا معمول وہی رہا۔ اکثر راتیں غائب رہتا اور کبھی کبھا
 ایک آدھ رات ناز کے کمرے میں گزارتا تھا۔ جب سے ناز نے کمرہ کو سجا سنا لیا تھا وہ زیادہ ہی
 غیر حاضر رہنے لگا تھا۔ اگر کمرے میں آتا تو اس کا داغ غیر حاضر معلوم ہوتا تھا۔
 اُس کا گھر وہاں جی میں جرم کی رفتار اور اعلیٰ دشمنان میں اضافے کرتا رہا۔ کراچی کی راتوں کے اندھیرے
 اور زیادہ خوفناک ہوتے گئے اور جیلا ایک مہینہ بن کر چھپا رہا۔

اُن کا خاندان نئے گھر میں آباد ہو چکا تھا۔ بچے سکول میں داخل کرادیے گئے تھے اور اس کی
 بیوی رخصت تھی۔ ان کے نو دن پھر آتے تھے، دیکھتی تھیں کالیں عدالت میں چل رہی تھیں لیکن پولیس ابھی
 تک اپنے گمنامہ وعدہ معاف گزارہ اُن کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اب تو اُن کا سارا کنبہ ہی غائب ہو چکا تھا۔ پولیس کے
 لیے پورے کنبے کی تلاش کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ کنبہ اُس وقت وہاں سے نکلا تھا جب پولیس کا
 ایک مجرّم وہاں موجود تھا۔ کنبے کو وہاں سے نکالنے والے مٹا اور ٹیپو تھے۔ مجرّم دونوں کو جانتا تھا اور دونوں مجرّم
 کو جانتے تھے۔ مجرّم کوئی زاہد اور پارسا نہیں تھا۔ مٹے اور ٹیپو کے پیشے کا ہی آدمی تھا۔ اُن کا کنبہ اُس کی نظروں
 کے سامنے وہاں سے نکلا تھا اور اُس نے دور دراز پولیس کو اطلاع دی کہ گھر کے سب لوگ جانے
 کس وقت نکل گئے ہیں۔

ایک رات جیلا ان کے ہاں گیا۔ وہ اُسی بہرہ میں تھا۔ سیاہ داڑھی، سر پر ٹیل کی ٹوپی، چادر ڈھکے
 ہوئے تھے، فیض اور تنگ پاجامہ پہنے۔ ان دو مہینوں میں اس نے خوب ہاتھ مارا تھا۔ اسے دیکھتے ہی
 اُن کی بیوی اُٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر رونق عود کرائی تھی۔ بچے سو گئے تھے۔ جیلا خیر خیر بوجھنے لگا اور اُن
 کی بیٹی جیلا کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔

جیلا نے اُن کی بیوی کو ڈھکھڑھ ہزار روپیہ دیا اور بتایا کہ یہ رقم اُن نے لاہور سے بھیجی ہے۔ لڑکی چائے
 بنا کر لاتی تو ماں نے روپے اُس کی طرف بڑھا دیئے۔

”یہ لے بیٹی! تیرے ابا نے بھیجے ہیں۔“

”ابا کب آئیں گے؟“ لڑکی نے جیلا سے پوچھا۔

”وہ ابھی نہ آئے تو اچھا ہے۔“ جیلا نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ابھی جاتے گا۔ کاروبار کا
 معاملہ ہے۔ اگھر آمدنی خوب ہو رہی ہے۔“

”آغا آپ کا کاروبار کیا ہے؟“ اُن کی بیوی نے پوچھا۔

جیلا کو کھلا سا گیا۔ وہ اس سوال کے لیے تیار نہ تھا۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”کچھ
 سپلائی وغیرہ کا دھندا ہے۔“

”خدا آپ کے کاروبار میں برکت دے۔“ بیوی نے دعا تیر لہے میں کہا۔ ”دیکھتے نا! پیسے گھر
 آجائے سے میں اتنے بڑے روگ سے آزاد ہو گئی ہوں۔ بچے سکول پڑھنے لگ گئے ہیں اچھا
 پینشن میں سب دکھ دور ہو گئے ہیں اور سب بڑی بات تو یہ ہے کہ پولیس کی جھک جھک سے چھٹکارا
 مل گیا ہے۔“ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ ذرا سے توقف کے بعد بولی۔ ”جیلا! ایک اور ضروری بات

”ہے۔“ وہ جھجک کے بولی۔ ”کہتے بھی شرم آتی ہے۔“
 اُس کی بیٹی اٹھ لے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔
 ”کہو بہن! ضروری باتوں میں شرم نہیں کرنی چاہیے۔“
 ”زینت کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ اُن کی بیوی نے کہا۔
 ”کیا بات؟“

”وہی جس کا ڈر تھا۔ بیوی نے سر جھکا کر کہا۔ ”اُس روز وہ تمہارا بچہ چار سو روپے دینے آیا تھا۔ اُن بات تو تم جانتے ہو، پھر کیا ہوا تھا۔“ اور وہ نظریں جھکا کر چپ ہو گئی۔
 ”اوہ۔“ جیڈا نے چنک کر کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔“ ذرا سوچ کر بولا۔ ”تم فکر نہ کرو۔“
 ”فکر کیسے نہ کرو؟، کھواری بڑی ہے۔“ وہ بولی۔ ”ہم تو کہیں کے نہ رہے۔۔۔ دنیا کیا کسے گی۔“
 ”دنیا کو تیرے کیوں پلٹنے دیں گے ہم؟“
 ”اور اس کے باپ کو میں کیا منہ دکھاؤں گی؟“ اُن کی بیوی نے کہا۔ ”وہ آئے گا تو میری بیٹی پھلے ایک دگر دے گا؟“

”اُسے میں سنبھال لوں گا۔“ جیڈا نے خود اعتمادی سے کہا۔
 ”میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ اُن کی بیوی نے رک رک کر کہا۔ ”کوئی ایسا بندہ ولست ہو جاتا۔۔۔ یا کوئی ایسی ذاتی۔۔۔ ابھی تو میرا سینہ شروع ہوا ہے۔“

جیڈا کے ماتھے کے شکن کمرے ہو گئے۔ ”ہاں کوڑ۔“ ذرا دیر بعد بولا۔ ”مٹی کو باہر نہ نکلنے دیا کرو۔ نہ کوئی دیکھ نہ نکلے کوڑے۔ کوئی پوچھ بھی بیٹھے تو کہہ دو اس کا خاندان ڈھاکے چلا گیا ہے۔۔۔ بیکراچی ہے بہن! یہاں پڑوسی پڑوسی کو نہیں جانتا یہاں بسنے والوں کے ہاں مجھے برادری والی تو بات ہی نہیں ہوتی کراچی میں نفسا نفسی ہے۔ مرنے کی اپنی فکر میں گھر رہتا ہے۔“
 ”لیکن میرے گھر ناجائز سچچہم ہی کیوں لے؟“ اُن کی بیوی نے کہا۔ ”میں تو چاہتی ہوں قصہ ہی پاک ہو جائے۔“

”نہیں بہن!۔“ جیڈا نے کہا۔ ”بچہ پیدا ہوتے ہی میں اٹھالے جاؤں گا۔۔۔ کوئی بچہ ناجائز نہیں ہوتا۔ نہ سچہ قصہ دار ہے نہ تمہاری بیٹی۔ یہ میرا قصہ تھا کہ اس طرح کا آدمی تمہارے گھر پہنچ دیا تھا اس کی سزا میں جھکنا تھا۔“

”اُپ کا بھی کیا قصہ تھا غریبوں کی قیمت میں ہی لکھا تھا۔“ اُن کی بیوی نے آہ لے کر کہا۔
 ”جی نہیں!۔“ جیڈا نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”میریں غریبوں کا سوال نہیں۔ امیروں کی قیمت میں حرامی بچے زیادہ لگے ہوتے ہیں۔ انگریزوں کی اندھا دھند نقل اتار کے امیروں نے سب بندھن توڑ ڈالے ہیں کراچی کے گمراہ آؤں کرکٹ کے ڈھیر گواہ ہیں۔۔۔ بہر حال تم بچے کا فکر نہ کرو۔“ جیڈا نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں زندگی سے پہلے اور بعد کا بندہ ولست کو بول گا کسی اور مصیبت میں نہ پڑ جائے اور نہ پولیس کو بھی پتہ چل جائے گا کہ لوگ یہاں رہتے ہو۔“
 ”ہمارے نصیب!۔“ اُن کی بیوی نے لمبی آہ بھری۔

”ہوتی ہو جاتی ہے بہن!۔“ جیڈا نے اسے تسلی دی۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں کچھ جو یا غم نہ کرو۔“
 اُن آگیا تو میں اُسے بھی سنبھال لوں گا۔“
 جیڈا وہاں سے اٹھ آیا اور آتے آتے داڑھی کے بہرپ میں چھ سو کی جب کاٹ لایا۔

جیڈا، شستے اور میو کے کمرے میں داخل ہوا۔
 دونوں جاگ رہے تھے جیڈا نے داڑھی اتاری اور بڑھان ان کی طرف پھینک کر کہا۔ ”لاؤ بھی سگریٹ لو پلاؤ۔“ اور وہیں نیم دراز ہو گیا۔
 ناز اپنے کمرے میں بیٹھی جیڈا کی ڈائری پڑھ رہی تھی۔

”۲۲ ستمبر ۱۹۵۶۔“

آج دن کے پچھلے پھر چیک لائنز کے کوارٹروں سے گزر رہا تھا ایک کوارٹر میں کوئی ستار سجا رہا تھا کہ نفوس سے مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی انسانوں سے نفرت میرے قدم رک گئے اور میں بہت دیر وہاں کھڑا رہتا رہتا۔“ اُن نے ڈائری سے نظریں ہٹائیں۔ وہ وہاں کھاتی سنبھل سے جیڈا کی ڈائری پڑھ رہی تھی اس کی بعض تحریریں بے معنی اور ادب پٹانگ ہی تھیں اور بعض واضح اور باخوبی۔ ناز نے جیڈا کی تمام تحریریں چن چن کر یاد کر لی تھیں۔ آج جب اُسے ڈائری سے معلوم ہوا کہ جیڈا کو ستار سے بھی لگاؤ ہے تو وہ حلاوت میں ایک تصویر کو راستہ کرنے لگی۔ وہ سرت سے جھوم اٹھی جیسے اس نے جیڈا کو باہر نہ بھیج کر لیا ہو۔

اتنے میں جیڈا کمرے میں داخل ہوا۔
 ”اوہ! تم آگئے؟“ ناز نے چنک کر کہا اور جذبات سے بھر پور انگڑائی لی۔ پھر یہ انگڑائی زہنکس اور دعوت انگریز مسکراہٹ میں سمٹ آئی۔ جیڈا دروازے میں رکھا کھڑا رہا جانے کیا سوچ رہا تھا۔ ناز نے بازو اُس کی طرف پھیلائے ہوئے کہا۔ ”آؤ ناہم تو رک ہی گئے ہو۔“

جیڈا وہیں رکھا رہا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ چوال سال اور حین لڑکی کی اس قدر اشتعال انگریز انگڑائی اور مسکراہٹ اُسے ذرا بھر متاثر نہ کر سکی۔ وہ بے پرواہی سے پٹنگ پر بیٹھ گیا۔
 ”تم یہ دھندا چھوڑ کر آفا نہ نویسی یا شاعری کیوں نہیں شروع کر دیتے؟“ ناز نے کرسی اس کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ”ڈائری کی تحریر تو اچھے خاصے ادیب کی ہے۔“
 ”بھوکا مارنے کا ارادہ ہے کیا؟“ جیڈا نے پٹنگ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”چھ غریب بچہ لینے کی بجائے ایک جب کاٹ لینا کیا رہا ہے؟“

”کبھی کو لوٹتے تھا راول لڑنا نہیں؟“ ناز نے پوچھا۔
 ”ول کے لڑنے کو ساکن کمرے کی خاطر ہی تو میں لوٹتا ہوں۔“ جیڈا نے کہا۔

”جیڈا! ناز نے اُسے تشنہ سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کچھ بھی کو گمراہ ہم ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے۔ کیوں نہ اب۔۔۔“

”شادی کر لیں!۔“ جیڈا نے اسے گھورتے ہوئے فقرہ مکمل کر دیا۔
 ”دیکھ تو ڈرا۔“ ناز نے کہا۔ ”میں نے کس قدر خوبصورت گھر نیا لیا ہے۔ یہاں ایک ننھا کھیل رہا ہو تو اچھا نہ لگے؟“

”کیوں نہیں!“

بچہ اٹھالوں گا۔

”کون ہیں وہ؟“ — ناز نے پوچھا۔

ناز نے جید اکابر لٹا ہوا مزاج دیکھ کر موضوع کو بدل دیا چاہا۔

جیذا نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو ناز بولی۔ ”ستار سیکھنے کا

اُونہہ!.... ناناچ گانا۔ نانا نے روٹھنے کے انداز سے کہا۔ ”میرا مطلب وہ تھو“

”شوقِ بڑا نہیں“۔ جیہا نے کہا۔

”ستار آجاتے گی، استاد کا سہاں آنا ممکن نہیں؟“ — خدا نے کیا — ”سہا

تو میں استاد کے پاس علی چاہا پھروں گی۔“ ناز نے کہا۔ ”برقعے میں حاکموں کی۔ انسا کوئی آدمی اساتھ

حد از لب مسکرمدا اور لولا۔ ”بھاگ کے جاؤ گا، گا۔“ اور اندر سے وقف کر اور اس نے

۵۔ سارا اور اس کے بندہ بہت ہو جائے۔

یہی اب وہ زیادہ رسا رسا کی خور ہے جسے بعض اوقات وہ ریاض میں یوں ہوجاتی تھی اس کے

ایسے میں وہ اکثر قصود میں لھو جاتی جیسے جیسا اس کے سامنے بیٹھا جھوم رہا ہو اور اس نے جیسا

پر ہنس مرنے لگتی تھیں۔

چیدا اور اُس کا گروہ کراچی میں جبرائیم کی رفتار میں خوفناک اضافے کو کھڑا تھا۔

absitainpoint

فمسلما انما

کرو تے تھے۔

کے پیار سے ہو جاتے۔

لڑکے کا باب اپنے لگاؤ مقصد سے کی تاریخوں پر تیار نہیں مل رہی تھیں مگر سماعت نہیں ہوتی تھی، وہ جیل

گھر میں بقیہ کے لئے بھی تیار ہے کہ وہ اس کے لئے تیار ہے

میرپس پیسے کو غرضی غری۔ وہاں سی اور غور میں کام پر سی بنوی تھیں۔ وہ پچھلے عمرے میں ایسین اور پیسے سے بچ

حشمت بیج سالمہ کالی مریح میں ملا کر بیجا کرتا تھا۔

سال کے طویل عرصے میں صرف دو گواہوں کے بیان فلیمنڈ سہوتے تھے۔ وکیل تھا نہیں جو مقدمہ لڑتا پاسر

Scanned By W

تو لے آؤ، معاملہ نہیں منع دفع ہو جائے گا۔

وہ رضا مند ہو گیا تھا مگر تھاندار پور سے پانچ سو مانگ رہا تھا اور جس کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی، وہ دو سو روپوں کا مطالبہ کر رہا تھا۔ لڑکے کا باپ تو ایک سو کی بھی اسامی نہیں تھی، سات سو روپے کہاں سے لانا؟ اُس نے اپنے حریف کے آگے ہاتھ جوڑے اور تھاندار کے باؤل پر پڑے اور کہا کہ ادھر ادھر سے قرض اٹھاؤ تین سو روپیہ دے دوں گا مگر کوٹ کا چراسی اور تھاندار اسی میدان کے کھلاڑی تھے۔

”بیوی کو بچو، بھگی بیچ ڈالو۔“ تھاندار نے اس سے کہا تھا۔ ”سات سو روپے لاؤ، ورنہ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ آدمی تمہارے مانتول زخمی ہوا ہے اور عوام کے جان و مال کی حفاظت کرنا اور دیکھا دکر لے والوں کو سزا دلانا پولیس کا فرض ہے مجھے اپنا فرض عزیز ہے۔“

لڑکے کی ماں جس کے ہاں کام کرنی تھی وہ پہلے روز سے ہی اس پر ڈورے ڈالنے لگا تھا لیکن عورت خود اور بھی اُسے ٹرخاتی رہی۔ حالات کا اٹھا ڈھاکا تھا کہ وہ ہرجوٹ سستی چلی جاتے لڑکا سکول سے آتا تھا تو باپ کی طرح فٹ پاتھ پر پاؤں سگریٹ کی چھائی لگا لیتا تھا۔ ماں بیٹا بچے لیے وکیل کر کے لیے زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک شام مریچوں کے بیوی پارے باقی عورتوں کو چھٹی دے دی اور لڑکے کی ماں کو روکے رکھا۔ بولا۔
”اٹھنا، جہاد لڑنا، کروڑوں روپے خالتو دے دوں گا۔“
عورت حاجت مند تھی ماں گئی۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا اور وہ بھی تک چلی ہیں رہی تھی۔ اُس کے کندھے دھکنے لگے تھے۔ اسے وہ کھڑا دیکھ کر یاد آ رہا تھا۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں چلنے کی دیواروں پر گڑھی تھی، سلاخیں توڑ رہی تھی، علامت میں چیخ چیخ کر خاندان کی صفائی میں بول رہی تھی مگر چپکی کی گھر گھر سے قصوروں کی دنیا سے بیدری سے گھسیٹ کر مریچوں کے ڈھیر کی طرف لار رہی تھی۔

اُس کا خون کھولنے لگا، دانت غم وغصہ سے پلنے لگے اور ان دانتوں میں وہ ہراس انسان کی بوٹیاں چبانے لگی جس نے اُس کے سہاگ کو کال کوٹھڑی میں بند کر دیا اور اُسے چلی پڑھا دیا تھا۔ غصے اور احتجاج نے سینے میں آگ سی لگادی اور وہ سر پر اشعلہ بن گئی۔ چلی اور ترے گھوٹنے لگی، لیسنے کے قطرے تیزی سے بننے لگے اور اُسے معلوم ہی نہ ہوا کہ اُس کا آقا اس سے دو قدم دور کھڑا اسے بھوکے نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

”یہ بچہ معلوم نہ ہوا کہ اُس نے گودام کا دروازہ اندر سے بند کر دیا ہے۔“
”بس کرو عالتہ!۔“ جیسے چپکی کی گھر گھر سے آواز ابھری ہو۔ ”یہ دوس روپے کیوں چھوٹ گیا کھڑا سنیاس کر لیا ہے۔“

عورت نے چونک کے دیکھا۔ موٹا جیسا بیوی پارے اُس کے سر پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ عورت نے پہلے اس کے نوٹ کو پھر بیوی پارے کو دیکھا۔ بیوی پارے نے ٹیڈ کو اُسے اٹھایا اور بازوؤں میں جکڑ لیا۔

بند گودام میں بیوس اور آبرو کی جنگ شروع ہو گئی۔ ٹھکی ماری عورت کی آہ و بکا سننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ پہلے ہی جاتی تھی۔ بیوی پارے کی دست درازی پر سر پر اشعلہ بن گئی۔ اُس نے اسے ایسا دھکا دیا کہ وہ لوکھڑا کو پیچھے ہٹا۔ پیچھے ہٹتی جی جس کی ٹھوکر سے بیوی پارے اپنے چھوٹے ہونے جو کہ سنبھال نہ سکا اور چلی بگر پڑا۔ عورت کے کان میں جیسے ہی نے بک دیا ہو کہ یہ ہے وہ جس نے تیرے خاندان کو قید کر رکھا ہے۔ اُس نے

بل اٹھالی۔ بیوی پارے اپنا بچل جسم چپکی سے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھا کہ تھک کی ذنی بل جس پر بیٹھتے کے بیچ پس کولپی ہوتی کالی موزن میں ملاتے جاتے تھے، اُس کے سر پر پڑی کھوپڑی سے خون کا دھارا چھوٹا اور پھر بیوی پارے اٹھ نہ سکا۔

مرچوں کی چپکی لگتی اور قانون کی چپکی کے دو مہیب پتھر تیزی سے گھومنے لگے۔ بے بس عورت بہت روتی، بہت چیخی لیکن مقتول کے لواحقین کے ہاں بے انت پستہ تھا۔ انہوں نے درجن بھر گواہ دے دیے تھے۔ عورت کا صرف معصوم بیٹا تھا جو کبھی جیل کے باہر بھی عدالت کے راکم سے میں رو رو کر بلکان ہو رہا تھا۔ باپ پہلے ہی جیل میں بند تھا، ماں بھی جیل میں بند کر دی گئی۔

لڑکے کے باپ کو جیل میں اس حادثے کی خبر ملی تو اُس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ دن رات خلاؤں میں ٹھکارت رہتا، کڑھتا رہتا، سوتا تھا نہ کھاتا تھا۔

ان ہی دنوں ٹیڈ ایک سال کی سزا جھگڑت رہا تھا۔ لڑکے کے باپ نے اُسے جیل میں کئی بار اپنی داستان غم سنائی تھی اور اسے بتایا تھا کہ اُس کا ایک ہی بچہ ہے جو معلوم نہیں کس حال میں جی رہا ہو گا۔ جرائم پیشہ لوگ جب جیل میں جاتے ہیں تو وہ سزا سے ڈر کر جرائم سے تو بے نہیں کرتے بلکہ دن رات موزوں کو تربیت دیتے اور آرام کرتے ہیں۔ انہیں الگ نہیں رکھا جاتا بلکہ ان قیدیوں کے ساتھ کھانا اور رات کو انہی کے ساتھ بند کیا جاتا ہے جو بھولے بھٹکے کوئی جرم کر بیٹھتے ہیں یا اس لڑکے کے باپ کی طرح لڑائی جھگڑے کے جرم ہوئے ہیں۔ ان سے اتفاقاً جرم کا ارتکاب ہو جاتا ہے۔ وہ پیشہ ور نہیں ہوتے ان میں لڑکے کے باپ کی طرح کے وہ افراد بھی ہوتے ہیں جو پاس پٹے نہ ہونے کی وجہ سے بے الصافی کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ قانون اور سوسائٹی کے خلاف پھر کے مہوتے ہوتے ہیں۔ ان میں انتقامی جذبہ پھیل جاتا ہے جو عقل اور ہوش پر غالب آ جاتا ہے۔ ان کی حالت لال گرم لوہے کی سی ہوتی ہے جسے فربوں سے کسی بھی شکل میں ڈھالا جاسکتا ہے۔

جرائم پیشہ لوگ اور ان کے ساتھی ایسے ہی قیدیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ لال گرم لوہے کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ اس لڑکے کے باپ جیسے قیدیوں کو جرائم کی تربیت دے کر انہیں اپنے گرد و پیش میں شامل کر لیتے ہیں۔ اور یوں جرائم اور جرائم پیشہ مخلوق میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

جیل کے ساتھی ٹیڈ نے اُس آدمی کی پٹا بھر دی سے سنی اور جب اُسے تپہ چلا کہ اس آدمی کا ایک کھن بنایا بھی ہے تو وہ اس کا اور زیادہ بہرہ ور بن گیا۔ یہ لوگ ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے۔

ایک روز جیل ٹیڈ سے ملنے چل گیا تو ٹیڈ نے اُسے اس لڑکے کے متعلق بتایا کہ اس کا باپ بھی جیل میں ہے اور ماں بھی جیل تو ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ وہ ٹیڈ سے مل کر رسالہ لائن کی جھگڑوں میں گیا جھگی تول گئی، لڑکا نہ ملا۔ جھگڑوں والوں نے بتایا کہ لڑکا اکثر غائب رہتا ہے یا ان گلیوں میں پناہ پھرتا ہے۔ جیل نے اپنے دو آدمی اُس کی تلاش پر لگا دیے۔

ایک تو لڑکے کے باپ کا مقدمہ رہتا تھا ایک سال سے قانون میں پڑا تھا، دوسرے اُس کی ماں کا کیس جو چھٹے مہینے ہی سیشن سپر ہو گیا اور آٹھویں مہینے اُسے چودہ سال سزا سے قید سنا دی گئی۔ اُس وقت

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مکرم سے ستار کا دھماکا ہوا۔ الپ اٹھنے لگا کسی پتے راک کا الپ تھا اور تاروں پر پھرتی انگلیاں کسی استار کی تھیں۔ جیلا جیسے کچھ اٹھا مکرم کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ مکرم سے درمی پر ایک بڑھا بیٹھا ستار سجا رہا تھا۔ مکرم ویش ستر برس، واڑھی اور سر کے لانسے لانسے بال دودھ کی طرح سفید تھے اور وہ الپ میں یوں کھویا ہوا تھا جیسے زندگی کا عظیم ترین اور آخری غم غمینی کر رہا ہو۔

جیلا دروازے میں ہی کھڑا رہا۔ شاید وہ بھی ستار کے نغمے میں کھو چلا تھا اور بوڑھے کو جیسے اس کی موجودگی کا احساس ہی نہ تھا۔

بوڑھے نے بے خیالی میں جیلا کو دیکھا مگر الپ میں ہی محو رہا پھر جیسے تاروں کے مترنم ارتعاش سے ہی آواز آتی ہو۔ "آؤ بیٹا بیٹھو!"

جیلا دو قدم آگے بڑھا مگر کھڑا ہی رہا۔ بوڑھے کا چہرہ نورانی تھا سپید ریشم کے باریک اور چمکیے تاروں جیسی واڑھی چہرے کے نور میں اضافہ کرتی تھی۔ جیلا نے اس چہرے کے ایک ایک نقش، ایک ایک خط اور ایک ایک فحری کو بڑے ہی غور سے دیکھا لیکن اسے کہیں جسدِ دم و گناہ کی ملکی سی پچھا میں بھی نظر نہ آتی۔ مکرم سے میں پھیلتا ہوا تاروں کا ترنم طلسم کی طرح جیلا کو اپنے آپ میں تحلیل کرتا جا رہا تھا اور وہ بھولتا جا رہا تھا کہ یہاں کیوں آیا ہوں اور میں ہوں کیا؟

"بیٹھو بیٹا"۔ بوڑھے نے ستار سے نظریں ہٹاتے بغیر ایک بار کھٹکے کیوں ہوا "بوڑھے کی آواز میں بھی موسیقی تھی اور بیٹا" کا لفظ جیسے اس کے سینے کی کسی عقیقت سے اُبھرا تھا جیلا اس لفظ کی بے ساختگی اور خلوص کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ یوں آگے بڑھ کے درمی پر بیٹھ گیا جیسے بوڑھے نے اُسے جاو کے زور سے اٹھایا ہو۔

"ایک چپ میں کچھ گیا تھا"۔ بوڑھے نے ستار پر انگلی پھیرتے جیسے اپنے آپ سے کہا ہو۔ "انگلیاں کڑھیا گئی ہیں نا اب تو ان کا بھی چھوڑ جاتی ہیں؟"۔ اور بوڑھے نے ستار اتار دی، چپ کھل کر مسکرایا اور بولا۔

"کیسے آئے بیٹا؟"

"ستار بجتے سنی تو بنا پوچھے گھس آیا۔" جیلا نے کہا۔

"تو اچھا کیا نا جو گھس آئے؟"۔ بوڑھا ہنس پڑا۔ "کون آتا ہے بوڑھے کی گلیاں؟ وقت ان تاروں کو چھوڑتے گزر جاتا ہے... کون آتا ہے یہاں! ابھی ابھی کچھوں نے دروازوں لگائی تھی۔ کل شام تک یوں ہی تنہا میں بیٹھا رہوں گا۔"۔ بوڑھا پھر ہنس دیا۔

"بچیاں؟"۔ جیلا نے مسکرا کر کہا۔ "بوڑھے میاں! وہ تو ناچتی گاتی ہیں اور پیشہ کمانی ہیں جو تھارے پاس آتی ہیں۔ وہ تو نمٹا لیں؟"

"ہول کی؟"۔ بوڑھے نے سنجیدگی سے مسکراہٹ سے کہا۔ "لیکن میری گلیاں وہ میری بچیاں ہیں یہاں وہاں ہول کی جہاں ناچتی اور گاتی ہیں... ہم انہیں کیسے جانتے ہو بیٹا؟"

"بس جانتا ہوں۔" جیلا کے لبوں میں کچھ کھلاہٹ سی تھی۔ بولا۔ "تمہارے پاس کیوں آتی ہیں؟"

"گناہ کیسے؟"۔ بوڑھے نے کہا اور یوں ادھر ادھر دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو پھر اٹھا اور دوسرے مکرم سے میں چلا گیا۔

"ادھر ہی آ جاؤ بیٹے!۔ دوسرے مکرم سے آواز آتی۔"

جیلا دوسرے مکرم سے چلا گیا۔ اس مکرم سے دو تین ٹرانک رکھے تھے۔ ایک ٹرانک کچھ اٹھا اور ایک میز تھی جس پر چائے کے برتن، دیگی اور چندا اور برتن رکھے تھے۔ ایک کورے میں ٹبلوں کی جوڑی اور مار ڈھونڈا تھا۔ بڑھا میر پر دیگی کا ڈھکنا کھول کے دیکھ رہا تھا۔

"کیا کیا تھا ختم نے یہاں کچھوں آتے تھے؟"۔ بوڑھے نے جیلا کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"ستار کی آواز سی تھی۔" جیلا نے یوں کہا جیسے کنا کچھ اور چاہتا تھا خالی خالی سے لہجے میں بولا۔

"سوچا تمہاراں گئے تو ایک ادھر راک سنوں گا؟"

"سنوں گا ضرور سنناؤں گا۔" بڑھا دیگی اٹھاتے باہر نکل رہا تھا۔ برآمدے میں جگہ کے بولا۔ "ادھر ہی آ جاؤ بیٹے!"

جیلا باہر گیا تو دیکھا کہ بڑھا چولے میں چھوٹی چھوٹی لکڑیاں رکھ رہا تھا۔

"سہرا لکڑیاں یہاں بیٹا۔" بوڑھے نے دیاسلائی جلائی اور کہا۔ "یہ تان سن والا وہ لکڑیاں سن سے سنا ہے آگ لگ جاتی تھی... دیکھو نا چولہا جلاتے وقت بڑی دقت ہوتی ہے لکڑیاں میں کھیلنے کا نام نہیں لیتیں؟"

"تم اکیلے رہتے ہو یہاں؟"

"اکیلا؟"

"پتھے نہیں ہیں؟"

"اول بھول آ۔" بوڑھے نے چولے میں چھوٹا لکڑی کہا۔ "اپنا کوئی نہیں... ویسے جو بھی آتا ہے اپنا ہی پتھر ہوتا ہے... تم بھی میرے پتھے ہو۔"

جیلا کو بڑھے پر ترس آئے لگا۔ وہ آگے بڑھا اور آگ جلائے لگا لیکن لکڑیاں جل ہی نہیں رہی تھیں۔

چوکیوں مار مار کر اس کی ناک اور منہ سے پانی بسنے لگا۔ بوڑھے نے بڑا جاندار قہقہہ لگایا اور جیلا کو پرے ہٹا کر لکڑیوں تلے کا قدر رکھے اور آگ لگائی۔ ذرا سی دیر بعد چولہا جل اٹھا۔

جیلا آنکھیں مل رہا تھا بوڑھے نے سالن کی دیگی چولے پر رکھی اور جیلا سے کہا۔ "دوپہ کو لکڑیاں کھا۔"

بہت بچ گیا ہے۔ جو دو دنوں کے لیے کافی ہے... میں روٹیاں اٹھا لانا ہوں۔ انہیں بھی گرم کر لیتے ہیں۔ تم ذرا چھو ملا تے رہنا۔"

اور جیلا معصوم سے بنو رہا پتھے کی طرح چپ چاپ چھوٹا لکڑی چولے سے دھواں اٹھ رہا تھا اور جیلا کی آنکھوں کو لگ رہا تھا لیکن اب اُسے دھوئیں کی چھن سے ایسی لذت محسوس ہونے لگی تھی اور اُنکھی نہیں تھی۔ بہت ہی پلانی دھندلی دھندلی یاد کی طرح اُس کے ذہن میں محفوظ تھی چولے کی تپش اور دھوئیں سے جیلا کی داخلی دنیا سے وہ پردہ اٹھا دیا جو برسوں گزرنے گزر چلا تھا اور جیلا کی نظروں سے چولے چوکے کی دنیا ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گئی تھی۔ اس پردے نے جیلا کی نظروں سے رستے لے لے آئین کی روٹھیں اور باجی خانے میں بیٹھتے برتنوں کا جل کر چھپا لیا تھا۔ اُن نور یوں کی تان ہی توڑ دی تھی اس پردے نے جو آج بھی جیلا کے گھر پھیلنے دھوئیں میں منڈلا رہی تھیں۔ کبھی کبھی سی سترنم گرجن کی طرح!

ہر روز والا ضروری پن نہیں تھا۔ سر جھکا جوتا تھا جیسے ضمیر نے آج پہلی بار بوجھ اٹھایا ہو یا پہلی بار بوجھ محسوس کیا ہو۔ اُس کے دل میں کاشا سا اتر گیا تھا جس کی غلش میں بھی تھی مٹھاس بھی۔ وہ کھار اور سے گزر رہا تھا۔ پولس کا ایک کانسٹیبل پان والے کی دکان کے سامنے بیچ کر کو بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُس نے جیدا کو آتے دیکھا تو اٹھ کھڑا ہوا۔ چند ہی دن گزرے اس علاقے میں جیدا کا ایک چھوٹا جیب کاٹے موقع پر ہی پڑا گیا تھا۔ یہ کانسٹیبل ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے چھو کرے کو بڑی صفائی سے جوڑ سے غائب کر دیا تھا۔

کانسٹیبل کو قوتی قبی کو جیدا کے گار۔ دو چار باتیں کرنے کا۔ علاقے کا حال احوال پوچھنے کا اور چلتے چلتے بھی پانچ کا مڑا مڑا نوٹ تھا جانے لگا لیکن جیدا سر جھکا کر نکل گیا۔ کانسٹیبل اس کے پیچھے ہوا اور چند قدم آگے جا کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”کیوں استاد۔ کانسٹیبل نے کہا۔“ داؤہ آتے باؤتی مر گیا ہے۔ یوں سر جھکا رکھا ہے جیسے جنازے کے ساتھ جا رہے ہو۔“

جیدا چونکا اور ک گیا۔ اُس کے منہ سے نکل ہی چلا تھا۔ ”یوں لگتا ہے دوست جیسے آج میں ہی مر گیا ہوں۔“ لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ بڑی مشکل سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا چھپکا سا تاثر پیدا کر کے یوں چل پڑا جیسے کسی نے گہری نیند سے جگا دیا ہو اور وہ کروٹ بیل کر پھر سو گیا ہو۔ وہ تو جیسے نیند میں ہی چل رہا تھا۔

”سو تو نہیں گئے؟“ اُسے کسی نے جھنجھوڑا۔ ”کہاں کھو گئے؟“

جیدا چونکا اٹھا۔ دیکھا، وہ اپنے کمرے میں پانک پر بیٹھا تھا نانا اُس کے پاس بیٹھی اُسے کندھے سے آہستہ آہستہ جھنجھوڑ رہی تھی۔ جیدا کا شعور بیدار ہو گیا۔ اُسے خیال آیا کہ نانا سے تین چار بار ہلا چکی ہے لیکن اسے یہ یاد نہ آیا کہ وہ جب اور کیسے کمرے میں آئی ہے۔ اُس کے اعصاب پر ابھی تک بوڑھے موسیقار کا طلسم طاری تھا اور اُس کے ذہن میں دُگی اور چمکے کا بل ترنگ گونج رہا تھا۔

اُسے تلک محسوس ہونے لگی اور اسے یاد آئے لگا کہ وہ کراچی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پیدل چلا ہے۔ عام ذہنی کیفیت میں وہ چند قدم بھی پیدل نہ چلتا۔ اسے کوفت سی محسوس ہونے لگی کیونکہ اس نے کبھی ننگسٹ شلیم نہیں کی تھی۔ اس کی جذباتی حالت پہلے بھی کبھی بار بار گڑبادی تھی اور وہ جس کا دم لگا کر باؤ کی کی آدھی توکل پی کر کھیل گیا تھا، مگر آج کا شمار زلا تھا۔ آج اسے جس کا خیال آیا نہ شراب کا جانے کس قوت یا کس کمزوری نے اُسے بے بس کر دیا تھا۔

اُس نے نانا کو ایک بار پھر دیکھا۔ اسے نانا کی صورت بدلی ہی نظر آئی۔ نانا کے ساتھ اُس نے کبھی کھل کے بات نہیں کی تھی، حالانکہ وہ نو دس مہینوں سے اُس کے کمرے میں بند تھی۔ اس کے متعلق وہ اسی قدر جانتا تھا کہ اس لڑکی کو اُس نے غریب ہے اور کسی نہ کسی روز اسے بڑے اُونچے گاہکوں کے لیے تیار کرنے کا وہ ناز پر بے دریغ پیسہ خرچ کر رہا تھا جانتا تھا کہ یہ پیسہ کاروبار میں لگ رہا ہے جو ناز ہی کے جن و جوانی سے ایک کے بدلے پچاس کے حساب سے واپس مل جائے گا لیکن آج رات اُس کے دل میں ہلکا ہلکا احساس پیدا ہونے لگا جیسے نانا کا رو باری چیز نہیں بلکہ اس کی

جب اُس نے گچی میں چمچ بلیا تو چمچ دگچی کے کناروں سے ٹکرائے لگا اور لطیف سی ٹن ٹن جید کی ہستی میں یوں سمجھنے لگی جیسے کسی عبادت گاہ میں بجا رہی گھنٹیاں بجا رہے ہوں اور ساری کائنات عبادت گاہ کی ویلیر پر سجدہ ریز ہو گئی ہو۔ ایک تقدس سا، پیدا سا اور روحانی سا ایک خراج گاہ کو بے خود کرنے لگا۔ اور وہ بے خود ہو ہی گیا۔ گرد و پیش کو بھول ہی گیا اور اس پر وہی طلسم طاری ہونے لگا جو اُس رات طاری ہوا تھا۔ جب نانا نے اُس کے سامنے چائے کی پیالی رکھی تھی۔ اُس رات تو وہ جھکا گیا تھا اور مٹی کے ٹال جا رہا تھا۔ مگر آج وہ جھکا نہ سکا نہ بھانکنے کی کوشش کی۔ اس کی جذباتی کیفیت اُس بے بس بہری کی سی ہو گئی۔ جیسے خاندان سے بے پناہ پیار ہو اور وہ خاندان سے دل کھول کر پیار بھی رہا ہے۔ اس نے کمرے کو بیتاب ہو کر خاندان کے ساتھ بات کرنے سے بھی ہزار ہو۔ وہ جھکا جانا چاہتی ہو لیکن نہ بھانکنے میں ہی اور اسی خاندان کے قدموں میں ہی سر رکھے رہنے میں ہی اُس کی روح کو قوار ملتا ہو۔

جیدا طلسمانی دنیا میں تحلیل ہو گیا۔

سال گرم ہو گیا، روٹیاں بھی گرم ہو گئیں۔ فرشی در پر دسترخوان بھی کھینچا گیا۔ بڈھے نے جیدا کو کھانے پر بھی بلھایا اور جیدا کے گرد مڑ مڑ سی ایک بڑھیا بیٹھ گئی۔ پیار سے لبریز منہ لالنے لگی۔ ”بیٹا! بیٹا! بیٹا! کھاؤ بیٹا! آہا کرونا بیٹا!“

”تم کہیں زور جا کر ہو بیٹا؟“ بڈھے موسیقار نے پوچھا۔ ”کوئے کیا ہو؟“

”جیسں کاشا ہوں آبا جان! بے خودی کے عالم میں جیدا کے منہ سے نکل گیا۔

اور طلسم لڑ گیا۔ اُس کے اپنے منہ سے نکلے ہوئے آبا جان کے دو لفظوں نے طلسم توڑ دیا۔ بھونچال کے شدید جھٹکے آنے لگے۔ جیدا کو جیسے کسی نے جبین خواب سے جھنجھوڑ دیا ہو۔ اُس نے چونک کر گرد و پیش کو دیکھا۔ سامنے دسترخوان تھا جس پر روٹیوں کے ٹکڑے اور چائیں پلیٹیں رکھی تھیں۔ پرے سے سار پڑی تھی۔ سامنے بوڑھا بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

جیدا نے پھٹی پھٹی نظروں سے ہر چیز کو دیکھا اور اُسے یوں لگا جیسے ہر چیز اُس پر طنز کر رہی ہو۔

”کے کاشا آبا جان؟... کہاں میں تیرے آبا جان؟... باپ کہاں ہے تمھارا؟... جیدا... جیب کھڑا... اٹھائی کچر... دیکھت!“

خمار بھیگا اور گریا۔ سیاہ پردہ گر پڑا اور جیدا نے جس کسی کو بے خودی میں آبا جان کہا تھا، وہ پردے کے عقب میں روپوش ہو گیا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا بڈھے کو دیکھا اور دوسرے لمحے میں وہ ایک ہی جیت میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ بڈھے نے آواز دی۔ ”کہاں چلے بیٹا! سنو تو۔“ لیکن جیدا صبح بھی پھلانگ گیا تھا۔ بڈھے نے پھر پکارا لیکن باہر کا دروازہ دھماکے سے بند ہوا اور جیدا کراچی کی پراسرار رات میں جذب ہو گیا۔

بڈھے موسیقار کے گھر سے تو جیدا بہت تیزی سے نکلا تھا لیکن ٹکڑا کر جا کر اُس کے قدم رکھنے لگے چہرہ دکھائی گیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ وہ بندر روڈ کے فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ بسیں، وکٹوریہ ٹیکسیاں اور رکشا گزرتے جا رہے تھے لیکن اُس نے کسی کو نہ دیکھا۔ پیدل ہی چل پڑا۔ اُس کے قدموں میں ہر روز والی تیزی اور چال میں

اپنی ملکیت ہے اور بھٹکی ہوئی اس لڑکی کا تعلق کچھ نہ کچھ اس کے جذبات کے ساتھ ضرور ہے۔

”میرا پاس بیٹھنا برا لگتا ہے تو اٹھ جاؤ؟“ ناز نے اسے گم گم دیکھ کر بے چارگی سے کہا۔

جیہا نے یوں چونک کر ناز کو دیکھا جیسے کنا چاہتا ہو۔ ”نہیں تو تم اچھے نہیں تو میں کس کے پاس بیٹھوں گا؟“ لیکن وہ نہ نہ سکا نہ بھل گیا پھر بھی اُس نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ ناز کے ساتھ

باہر کرنا چاہتا ہے لیکن یہ احساس بھی بیدار ہو گیا کہ وہ اس لڑکی سے روحانی سہارے کی بھیک مانگنے چلا ہے جسے اُس نے باج سوراہوں پر خرید کر اپنی دنیا میں قید کر رکھا ہے۔

انوکھے سے اس خمار میں اب بھی سی پیدا ہوئے گی۔ دل پر بوجھ سا اڑا۔ جیہا کی اظہارِ ریت کے ذریعے یہی تھے جرم، مجا، شراب اور جرس۔ مگر آج وہ دور ہے پرکھنا تھا۔ اُسے نہ جرم کا خیال آیا نہ جوئے کا نہ شراب کا نہ جرس کا۔ اُس کا سر پھجھک گیا۔ ناز نے دونوں ہاتھوں سے تمام کر پڑے پہلے سے اُس کا سر اٹھایا۔

”کیا بات ہے آج؟“ ناز نے شکستہ سی سنجیدگی سے پوچھا۔ ”تمہارے منہ سے بونیس آ رہی

شراب نہ جرس نہ بھنگ نہ افیم آ کر کیا انوکھی بات ہوئی جو اس قدر کھوتے کھوتے سے ہو؟“

”کیا یہ بات انوکھی نہیں کو میرے منہ سے کوئی بونیس آ رہی۔ جیہا نے کھل کر کہا۔

نازا اچھی اور دوسرے کمرے سے دسکی کی بوتل اٹھا لائی اور جیہا کے ہاتھ میں دے دی جیہا نے بغیر توقف کار کھالا اور بوتل منہ سے لگا کر کھتی گھونٹ پی گیا۔

”تھیں تار سیکھتے ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ جیہا نے منہ سے تولی ہٹا کر کہا۔ ”کچھ کچھ بھی ہے؟“

نازا اُس روز سے بیتاب بھی ہو گیا۔ اسی اس کے پاس بیٹھے اور اس سے ستارے جس دن اُس

نے ستار کا پہلا سبق لیا تھا جیہا کے شوق کے پیش نظر ہی اُس نے تار سیکھنے کا تہیہ کیا تھا لیکن مہینوں

گزر گئے، جیہا نے کبھی پوچھا بھی نہ تھا کہ ناز تم نے تار سیکھ لی ہے؟ آج جیہا نے ستار کا نام ہی لیا تو ناز

نے باجھیں کھلا کر پوچھا۔ ”سنو کے ہلندہ کرو گے؟“

”لاؤ تو سی!“

ناز دوسرے کمرے سے ستار لے کر آئی تو جیہا ہلکے پلٹ چکا تھا۔ ناز اُس کی پائی بیٹھی گئی اور

دوسرے لمحے نازی انگلیاں تاروں پر ریتنے لگیں۔ ناز کے استاد نے اس کی پتلی پتلی لایبی لایبی انگلیوں میں

استاد کی کے انگ سمو دیتے تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ جیہا استاد کی چیز ہے۔

ناز نے شام کلیان کا الپ چھڑوایا تھا لیکن وہ جاں نہ سکی کہ اُس نے جیہا کی مٹی کے اُس تار کو

چھڑوایا ہے جسے پہلے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور جس پر جیہا نے جرم و گناہ کے تار کی تہ سے

ڈال رکھے تھے۔

کمرے میں تاروں کی ملکی ملکی گونج تیرنے لگی جیسے جل پڑیوں کا غول شب کی غاشی میں سمندر کی

سطح پر دھیرے دھیرے گنگنا تا جا رہا ہو۔ جیہا کی مٹی میں بوڑھے موبدقار کا سحر جاگ اٹھا۔ اس نے لنگھوں

سے ناز کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہا کہ اُس کی آنکھیں بند ہوئے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد ناز نے دیکھا جیہا لگہری نیند سوراٹتا تھا اور اس کی پلکوں نے دو آنسو تمام رکھے تھے۔

جیہا کی آنکھ کھلی صبح کا اجالہ پھیل رہا تھا۔ جیہا نے اس اجالے کو یوں دیکھا جیسے زندگی کی پہلی صبح

کو دیکھ رہا ہو۔ اُس نے آنکھ لائی پھر جھانکی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اپنی آنکھ لائی اور جانی کو محسوس کیا۔

اُسے خیال آیا شاید وہ صبح اسی طرح آنکھ لائیاں لے کر اٹھتا ہے وہ اٹھ بیٹھا اور کھڑکیں سے صبح کی

سپیدی کو دیکھنے لگا۔ اُسے ماحول میں تبدیلی سی محسوس ہو رہی تھی جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

وہ صبح کو دیکھ رہا تھا کہ ناز گئی۔ اُس کے ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے تھی۔ جیہا ناز کو یوں دیکھنے لگا

جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس سے پہلے ناز کا محل، پوڑا اور لب شک سے آراستہ ہو کر اُس کے سامنے بیٹھی رہتی تھی

لیکن جیہا نے اس میں کبھی کوئی کشش، کوئی انوکھیاں یا کوئی مذرت نہیں دیکھی تھی اور آج صبح ناز نے ابھی تک

منہ نہ دیکھا بھی نہیں دھویا تھا، نیند کا خمرا ابھی تک پلکوں پر اڑکھ رہا تھا۔ چہرے پر شراب بیداری کے آثار بھی

تھے، پھر بھی جیہا نے اُس میں حاوی بیت محسوس کی۔ وہ جیسے اپنے آپ سے بڑا اٹھا ہو۔ ”یہ لڑکی میرے

پاس بیٹھتی کیوں نہیں؟“ جیہا نے پھر پھر کمرے میں پانی کے چھینٹے کیوں نہیں مارتی؟

نازا اُس کے سامنے بیٹھی جاتے بنا رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جیہا کی آنکھیں اس

کے کچھلے پھرے بالوں سے پھیلنے لگیں۔ وہ اپنے آپ میں ایک کشش میں اچھک گیا۔ وہ ایک

کوشش میں مصروف ہو گیا، صرف اتنا کہنے یا اتنا نہ کہنے کی کوشش میں کہ ناز آج تم مجھے بہت اچھی

لگ رہی ہو۔

اُس نے بہت باندھی لیکن ابھی کسی قوت یا اپنی ہی کسی کمزوری نے اس کی جہت پست کر

دی۔ وہ پٹٹا اٹھا۔ ادھر ناز نے اسے گم سم دیکھ کر کہہ دیا۔ ”جیہا کیا سوچ رہے ہو؟ نیند پوری نہیں ہوئی

تو ناشتہ کمرے کو سو جانا۔“

جیہا کا انگ انگ بیدار ہو گیا۔ وہ اپنے آپ میں جھنجھلایا۔ ایک کڑ جاتے کی پیالی اٹھائی اور حلق میں

اٹیل دی۔ ایک ٹرسٹ اٹھایا، اٹھا۔ ٹرسٹ کا ایک ہی ٹوالا بنا کر منہ میں پھید کا اور کمرے سے باہر نکلا گیا۔

نازا اُسے دیکھتی رہی پشیمز اس کے کہ وہ اُسے روکتی وہ جا چکا تھا۔ وہ سمجھی شاید وہ روزمرہ کے چکر

میں نکل گیا ہو گا لیکن جیہا کمرے سے نکلا تھا، مکان سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہ بلکہ دلوں میں سے ہوتا ہوا

منہ اوٹھنے کے کمرے میں چلا گیا جہاں وہ شام تک نہ جا گئے کے ارادے سے گہری نیند سوئے ہوئے

تھے۔ یہ جیہا کی اپنی دنیا تھی جہاں اُس کی حکمرانی تھی۔ جہاں کوئی دسکی کش نہیں تھی جہاں کوئی جذبات نہیں

تھے، کوئی بڑھا موسیقار نہیں تھا، جہاں بستے گھر کے چلنے کا ڈھول اور ترنوں کا بل ترنگ نہیں تھا۔

اُس کی دنیا میں کوئی نعمت نہیں کوئی ساز نہیں تھا، اور اس زمین دو ز دنیا میں کوئی دورا مانیں تھا۔ اُس نے

گرد آلود فرش پر کھل بچھا یا، لٹ لٹتے ہی سو گیا اور ایک نائیسے میں پیا اور لغو کی دنیا سے نکل چکا۔

ناز کو معلوم نہ ہو سکا کہ جیہا ساتھ دالے کمرے میں گم ہو گیا ہے۔ وہ اس کمرے میں بہت گم

جایا کرتی تھی۔

رات جب ناز لڑکے کو ساتھ لے کر استاد کے ہاں تار کی مشق کرنے چلی گئی تو جیہا کی آنکھ کھلی۔

”اب کی سیوی نے بلا بھیجا ہے۔“ منہ نے اُسے بتایا۔ ”ٹیپو وہاں چلا گیا ہے اور میں

بلا گیا ہے۔

جیوا بھائی سے اٹھا۔ چہرے پر نقلی سیاہ داڑھی لگائی، سر پیل کی ٹوپی رکھی، پاجامہ سنابلون اناکر تنگ پاجامہ پہنا، اوپر چادر اوڑھی، پستول ناف میں اڑسا اور بائرنل گیا۔ وہ اہن کے ہاں پہنچا تو میو کو ہاں سر جھکا تے بیٹھے دکھا، اہن کے پیچھے سوتے ہوئے تھے سپد کے کمرے کا دروازہ بند تھا جس کے عقب سے گھٹی گھٹی جھپٹ سنائی دے رہی تھیں، بجبار کی ہولناکی آہ و بکا بلند ہوئی، جیوا اور میو بند دروازے پر نظرین گاڑے ہوئے تھے۔ دونوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔

تھوڑی دیر بعد آہ و بکا تھم گئی اور نوازیتہہ پیچھے کے رونے کی آواز سنائی دی، جیوا اور میو سر پلٹا بیٹھا بنے بند دروازے کو دیکھ رہے تھے۔

دروازہ کھلا اور اہن کی بیوی پریشان حال اور اُداس بائرنل۔

”لاڑکا پیدا ہوا ہے۔“ اُس نے بیاری سے کہا۔

”اور زینت؟“ جیوا نے پوچھا۔

”وہ ٹھیک ہے۔“ اہن کی بیوی نے جواب دیا۔

”بچہ ابھی لے جاؤں؟“ جیوا نے ذرا سوچ کر پوچھا۔

”ابھی؟“ اہن کی بیوی نے پوچھا۔ ”لے کہاں جاؤ گے؟ کہیں... وہ کہتے کہتے رک گئی اور اُس کے آنسو نکل آتے۔

”ہاں ابھی!“ جیوا نے کہا۔ ”میں بچے کو کہیں پھینکوں گا نہیں۔ یہ بچہ زندہ رہے گا میرے ہاں، تمہارے ہاں نہیں، تمہاری اور زینت کی پریشانی آج ختم ہوگئی ہے۔ اب میں آرام سے رہوں۔ بچہ مجھے لادو، میو یہاں رہے گا، کوئی ضرورت ہو تو اسے کہنا... بچہ لادو۔“

اہن کی بیوی سر جھکا تے چلی گئی اور بچہ لاکر جیوا کی چھولی میں ڈال دیا، جیوا نوازیتہہ بچے کو اٹھاتے اندھیرے میں گم ہو گیا اور اہن کی بیوی آنسو پونچھتے ہوئے اپنی بیٹی کے پاس چلی گئی۔

لطیف سے جھجکوں نے ناز کو گہری نیند سے جگا دیا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ اُس کی آنکھ کھلی تو آنکھیں چند ہی گائیں۔ لائٹن حل رہی تھی۔ اُس نے دیکھا۔ جیوا ایک نوازیتہہ بچے کو بازوؤں پر اٹھاتے پلنگ کے پاس کھڑا تھا، ناز کھڑا کے اٹھ بیٹھی۔

”نازیو بچہ!“ جیوا نے کہا۔

”کہاں سے اٹھا لاتے ہو یہ بچہ؟“ ناز نے گھبراہٹ اور استعجاب سے پوچھا۔

”بچہ کس کا ہے؟“

”تم نے کہا نہیں تھا کہ اس گھر میں ایک ننھا کھیلے تو...“

”وہ جیوا ہے!“ ناز نے جیسے سر سہٹ لیا ہو، بولی۔ ”خدا نے تجھے کیا ظالم بنادیا ہے کہیں مانتا کی ماری کی کو کچھ اجاڑی ہے تم نے؟“

”جسے ابھی بچے کی ضرورت نہیں تھی۔“ جیوا نے بچہ نازی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ

بچہ تمہارا ہے۔“

نازی نے جھجکے ہوئے بچے کو ہاتھوں میں لے لیا اور جیوا نے اُسے پیچھے سے متعلق نہایت بات سنا دی۔

”اوہ.... مجھے یاد آگیا۔“ نازی نے کہا۔ ”یہ اُس رات کی بات ہے۔ بادل اُسی رات غائب ہوئے۔ وہ ہے کہاں؟“

”اپنے کیمے کی سزا پا گیا ہے۔“ جیوا نے کہا۔ ”وہ زندہ نہیں۔“

”تم نے اُسے؟...“

”ہاں! میں نے اُسے مرادیا تھا۔“ جیوا نے یوں کہا جیسے اُس نے کوئی خاش زودہ یا دلاکتا مڑا دیا ہو۔ اُس کے لمحے میں تاسف نہیں تھا، اور نہیں تھا جیسے اُسے معلوم ہی نہ ہو کہ قتل کی سزا موت ہے یا عمر قید۔

”تم نے اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر رکھا ہے۔“ نازی نے کہا۔ ”پولیس نے بادل کے قتل کی تفتیش تو کی ہوگی۔“

”کس پولیس کی بات کر رہی ہو؟“ جیوا نے پوچھا۔ ”انگلینڈ کے سکاٹ لینڈ یا ڈوکی؟ میں پاکستان کی پولیس کی بات کر رہا ہوں۔ بادل کی لاش پولیس کو ملی تھی تو پولیس نے سب سے پہلے مجھے بلایا تھا، تھانیدار کو معلوم تھا کہ بادل میرا آدمی تھا، میں نے اُسے کہا تھا۔“ ”جاؤ،“ اور پولیس نے لاش لاوارث قرار دے کر دفن کر دی یا کسی میڈیکل کالج کو دے دی ہوگی۔“

”تھانیدار تم سے اتنا ڈرتا ہے کہ...“

”اُس کا ایک بیٹا کالج میں داخل ہوا تو باپ سے کہنے لگا کہ کالج بہت دور ہے، سکوڑ لے دو۔“ جیوا نے کہا۔ ”تھانیدار نے مجھے بتایا.... میں نے اُس کے بیٹے کو سیکڑ میں بند سکوڑ لے دیا تھا.... ان باتوں کے ساتھ تھا کہ کوئی تعین نہیں ہے نازی اس بچے کو اپنے پیچھے کی طرح پالنا ہے۔“

”میں اسے اپنے ہی پیچھے کی طرح پالوں گی جیوا!“ نازی کے جذبات متعش ہو گئے تھے۔ بولی۔ ”یہ میرا بچہ ہے۔“ اور اُس نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔

”نازی! جیوا نے کہا۔“ اس بچے کی پرورش اور تربیت ایسی ہو، ایسی ہو... ایسی ہو...“

”جیسی؟“

”جیسی میری نہیں ہوئی تھی۔“ جیوا نے دکھ زدہ لہجے میں کہا۔

”ولسی ہی ہوگی جیوا!“ نازی نے کہا۔ ”لیکن ایک وعدہ تم بھی کرو۔“

”کیا؟“

”کہ اب اس کمرے کی فضا اس معصوم کی طرح پاک رہے گی۔“ نازی نے کہا۔ ”یہاں کوئی گناہ نہیں ہوگا، کوئی جرم نہیں ہوگا، یہاں شراب نہیں آئے گی اور نہ تم یہاں شراب اور چرس پی کر آؤ گے۔“ ”نہیں!“ جیوا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں نے کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ وہی کہوں گا جو کر سکتا ہوں.... ہاں یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ میں اس کمرے میں نہیں آیا کروں گا۔“

”یہ مجھے منظور نہیں“

”اور وہ مجھے منظور نہیں“۔ جیدانے کہا۔

ناز چپ ہو گئی۔ اُس نے دو میں گھبلاتے پٹھے کو دیکھا۔ پھر جید کو دیکھا۔ وہ جانے کس تصویر میں کھو چلی تھی کہ جید اٹھ کے چل پڑا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ ناز نے پوچھا۔

”دوسرے کمرے میں!“۔ جیدانے جواب دیا۔

”نہیں!“۔ ناز نے کہا۔ ”ہیں سوؤ، اسی کمرے میں“

جید لوٹ آیا۔ دوسرے فلنگ پر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔

”اس کے لیے جو کچھ ضرورت ہو صبح لڑکے سے منگو لینا“۔ جیدانے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ دوہکی بول وغیرہ!“

ناز نے جب روئی جیسے ملائم پتے کو اپنے سینے سے لگا یا تو اُس کے رگ وریش میں سترت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ بے خود سی ہونے لگی۔ اس نے پتے کی بند بٹھی کو اپنے ہونٹوں سے لگایا تو ناز کے سینے میں جیسے مال کی مامتا بول اٹھی ہو۔ ”نئے تیری پرورش ویسی نہیں ہوگی جیسی جید کی ہوئی تھی“۔ جیدانے ناز کو اور پتے کو کٹکھنوں دیکھا اور محروٹ بدل کے سو گیا۔

جیداندر روڈ پر تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ٹیپر روڈ سے نزار سے کی ٹکیسی لے کر آگے جاسے گا۔ صبح اُسے پیغام ملا تھا کہ ایک سابق سفیر نے بلایا ہے جو کسی ملک میں پاکستان کا سفیر تھا اور ملک کے بدلے ہوئے حالات کو دیکھ کر سفارت سے متعفی ہو گیا تھا۔ بدلتے حالات کو سدھارنے نہیں بلکہ ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے۔

وزارتیں دھڑا دھڑا لوٹ رہی تھیں۔ سب سے اونچی کرسی پر جرم کے بیٹھا ایک شخص ملک کے تمام سیاست دانوں کو شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ ان چالوں کے بغیر اس کی کرسی ڈوٹی تھی۔ بساط پر اسی کا قبضہ تھا۔ وہ سیاست دانوں سے بھی نہیں دس کر وٹا انسانوں سے کھیل رہا تھا۔ جیت ہر حال میں اسی کی تھی دس فرورژندہ لاشوں کی سسکیاں اور پکے ایوانوں تک پہنچ نہ پاتی تھیں۔

عوام ان بٹی ٹوٹی وزارتوں کو بول دیکھ رہے تھے جیسے کہاں پیاسے کھیتوں کے کنارے کھڑا آسمان پڑاؤ لٹے بادلوں کو کچھ رہا ہوا اور بادل کے سر سے ٹپکتے کو دیکھ کر پکارا اٹھے۔ ”یہ تو ضرور ہرے گاتے کچھ بادل کر جتے جوتے آئے اور گر جتے ہوئے چلے گئے، پھر بھی لوگ اخباروں کی کوئی سوٹی سرخیوں اور وعدوں سے بچے ہوئے بیانات اور تقریریں پڑھ کر اپنے آپ کو فریب دے رہے ہیں لیکن تھے۔ دن دن ہارے لٹے ہوئے گھروں اور بارش کے پانی میں ڈوٹی تیری تھگیوں کو دیکھ کر بھی لوگ امید کو سینے سے لگاتے ہی رہے۔ امید دم توڑنے لگتی تھی تو وزارت لوٹ جاتی تھی اور ایک اور وزیر ظلم نئے وعدے لیے وزارت عظمیٰ کی کرسی پر بیٹھتا تھا۔

بدلی اور خود فریبی کے مارے ہوئے عوام کو غالباً معلوم نہ تھا کہ ملکی سیاست، معاشرت اور معاشیات میں وزیروں اور وزیراعظموں کا نہیں جید اور اس کی فاش کے چند راستا دول کا عمل دخل ہے۔

جیداندر روڈ پر جا رہا تھا اور فٹ پاتھ پر تھک چوم کو معلوم ہی نہیں تھا کہ کل صبح جب وہ اخباروں میں کسی سیاسی جلسے میں کسی لیڈر کی تقریر کے دوران ہل بازی کی خبریں پڑھیں گے تو اس کے پس منظر میں اسی جید اور اس کے گرد وہ کاتھ ہو گا۔ جوم میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ جو کارپوریشن کے آئے والے انتخابات کا ہنگامہ سن رہے ہیں وہ اسی عام سے لوفر انسان کے بل بوتے پر لڑاے جاتے ہیں جسے دن کی روشنی نہیں رات کے اندھیرے پہانتے ہیں یا پولیس پہنچتی ہے اور پولیس ایسے بہت سے جیدوں کو پہنچاتی ہے جو ہر سیاسی پارٹی میں پردوں کے پیچھے موجود ہیں اور وہ لعل میں چھری کا کام دیتے ہیں۔ اور یہ عام سا قلم سا انسان اُس سفیر کے بلاوے پر جا رہا تھا جو سیاست کے اکھاڑے میں اترنے کے لیے سفارت کو لڑتا تھا۔ جید کی مدد کے بغیر اس کی جیت ممکن نہیں تھی۔ وہ جید کا پڑا ہوا تھا۔ اس آستادِ حرامِ پیشہ نے پہلے بھی اس سیاست دان کی حرلیت پارٹیوں کے جلسے جلسوں میں دیکھا فادیا کیا تھا۔ مردِ باد کے نعرے لگواتے تھے اور کوئی جلسہ کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا۔ جید کا گروہ ان کامیوں میں ماہر تھا اور منہ مانگے دام لیتا تھا۔ اس لحاظ سے جید پاکستان کا کامیاب ترین سیاست دان تھا۔

وہ ہند روڈ پر بہت تیز چلا جا رہا تھا۔ ہند روڈ کے فٹ پاتھ پر تیز کون چلنے دیتا ہے۔ وہاں صرف سیل چلنے والے لوگ ہی نہیں ہوتے۔ اس دوگر چوڑے راستے پر برترم کی دکانیں سب سوئی ہوئی ہیں کیبن برترم چھاڑیاں، دوکانوں کے آگے بڑھے ہوئے تختے، بوٹ پالش والے سفری ونگل سارکیموں کے مجھے آکس کو کم اور شربت پیچنے والے، گتے کا س نکالنے والے، سیلنے جرم و جاسوسی کے ناول پیچنے والوں کے ناول پھیلاتے ہوئے ہوئے ہیں اور پڑاؤ فروشوں نے کپڑے کے تھان کھول کر راہ میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ذرا آگے جوتیوں اور بوتیوں کی قطار بھی ہوئی ہے۔ ان فٹ پاتھوں پر کھوٹے ملائی سے لے کر کھوٹی ہوئی جانی تک سب کچھ مل جاتا ہے۔ صرف ایک چیز ناپید ہے۔ چلنے کا راستہ! جید کپڑے کے تھانوں اور نادلوں کو پھلانگتا، دھکے دیتا اور دھکے کھاتا اپنا راستہ بناتا جا رہا تھا کہ اس کا پاؤں فٹ پاتھ پر پکھے ہوئے کھل میں الجھ گیا۔ اس نے رگ کے نیچے دیکھا۔ ایک جوتی نے کھل پھیلا کر اس پر اپنا سا زو سامان سجا رکھا تھا۔ سامنے ایک تختی تھی جس پر پاتھ کا خاکہ تھا اور لکھا تھا۔ ”آپ کی قیمت آپ کے ہاتھ میں ہے“

”جری ظہ جاسیٹھ!“۔ جوتی نے جید کو روکتے ہوئے کہا۔ ”تیرے ماتھے پر ایک لکیر ہے جو کسی ماتھے پر نہیں ہوتی تو پڑا بھگاواں ہے۔ پڑا نیک ہے“

جید کو غصہ آ گیا۔ اُس نے سوچا یہ لوگ کس قدر بے ایمان اور بزدل ہیں کہ لوگوں کو فریب دے کر پیسے طوری لیتے ہیں۔ کیوں نہیں یہ اٹھ کے جیس کاٹتے اور تالے توڑتے؟ اُس نے کھل میں الجھا ہوا پاؤں نکالا تو دیکھا کہ جوتی کی پونجی کے نیچے سے پانچ کے نوٹ کا نوٹ نظر آ رہا تھا۔ جید ابٹھ گیا۔

جوتی نے پونجی اٹھائی تو نوٹ سامنے کھل پر پڑا نظر آیا۔ جوتی نے پونجی کھول کر جید سے کہا کہ پانچ آئے پونجی پر رکھ کر کسی خانے میں انگلی رکھ دے۔ جیدانے آگے جھک کر ایک ہاتھ اس کے پانچ کے نوٹ پر اور دوسرے ہاتھ کی انگلی پونجی کے ایک خانے میں رکھ دی۔

”تیری قسمت بڑی تیر سیٹھ۔“ جوشی نے کہا۔ ”پانچ آنے دھڑے تیرے کو اندر بار کچال بنادیں۔“
جیدانے لکنا سہتے کہا۔ ”پھر آؤں گا جوشی بابا! ابھی بہت جلدی میں ہوں۔ اٹھا اور بند روٹی پھیر میں گم ہو گیا۔
جوشی پوچھی کھل پر رکھنے لگا تو اسے پانچ کے نوٹ کا خیال آیا لیکن نوٹ غائب تھا۔ نوٹ اس بیٹھ کے
ساتھ چلا گیا تھا جسے اس نے کہا تھا کہ نوٹ بھاگوان ہے، ٹرانیک بس اور تیری قیمت بڑی تیز ہے۔
جیدانے جب بند روٹی کے ٹرام چکشن پر پہنچا تو علاقے کے کانسٹیبل نے اسے دیکھ لیا۔ وہ زور سے کھانا
تو جیدانے اسے دیکھا کانسٹیبل بھکاریوں کی سکرابٹ سکرایا۔ جیدانے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جیب کے اندر ہی
پانچ کے نوٹ کو موڑ توڑ دیا اور کانسٹیبل کے قریب گزرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں دیکھ گئے نکل گیا۔
کانسٹیبل کی سکرابٹ اور زیادہ پھیل گئی اور اس نے کہا۔ ”جیتو بھاگوان، جیتو۔“

جیدانے ٹیکسی سٹینڈ سے ٹیکسی لی اور سابق سفیر کے ماں بیٹیا اور بیٹی جی دیر بعد وہ اس کی محل نما کوٹھی
کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا وہاں کی توہلی اور گلاس سامنے رکھے سیاست دان کا پیش کیا میٹھا میٹھی سکرابی کا
تھا۔ سیاست دان جیدانے کو بتا چکا تھا کہ وہ پھر سیاست کے میدان میں آگیا ہے اور اس کے عراہم کیا ہیں اور
کہ وہ حریف پارٹی کے باؤل اکھاٹنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنے پروگرام جیدانے کو سن ڈالے۔

سیاست دان سندھ کے ڈیڑوں کا ڈیرا تھا۔ زمین اتنی کو اپنے آپ کو مخلوق خدا کا روزی رسال سمجھتا
تھا۔ دولت کے دیرا بہتے تھے ضرورت پیش آئے تو وہ پارٹی بدل لیا کرتا تھا۔ اکثر برسرِ اقتدار پارٹی میں
رہتا تھا۔ اب جس پارٹی میں تھا، اس نے اسے کوئی وزارت دینے کی بجائے سفیر بنا کر ملک سے
باہر بھیج دیا تھا۔ اس نے وہاں اپنے ملک کے روپے پیسے سے عیش و عشرت تو بہت کی لیکن اسے
وزارت والا مزہ نہ آیا۔ اسے سفارتی فرائض کا زعم تھا نہ کچھ جس ملک میں وہ سفیر بن کے گیا تھا وہاں
کے لوگ پاکستان سے صرف اتنی سی واقفیت رکھتے تھے کہ یہ کوئی تمام سامک ہے اور اس کا ایک
سفارت خانہ بھی ہے۔

اس دوران پاکستان کا ایک مرکزی وزیر اس ملک کے دورے پر گیا۔ دورے کا مقصد یہ تھا کہ
اس وزیر نے ابھی یہ ملک نہیں دیکھا تھا۔ لہذا اس نے سفیر یا حاکم کو سرکاری دورے کا نام دے کر تمام
انرجات حکومت پاکستان سے وصول کیے۔ اس کی ملاقات اس سفیر سے ہوئی تو وزیر نے اسے بتایا:
”آپ میں تو بڑے پرانے سیاسی لیڈر لیکن آپ جھانے میں آگئے۔ آپ دیکھتے رہتے ہیں کہ
پاکستان کی حکومت ان سیاسی لیڈروں کو سفیر بنا کر دوسرے ملکوں میں بھیجتی ہے جن سے اسے خطرہ ہوتا
ہے۔ یا ان لیڈروں کو جنہیں برسرِ اقتدار پارٹی انعام دینا چاہتی ہے۔ آپ کو اس پارٹی نے دراصل ملک سے
نکالا ہے کیونکہ وزیر اعظم آپ کی جگہ ایک اور لیڈر کو ایک وزارت دینا چاہتا تھا۔ آپ کے خلاف پارٹی
کے اندر سازش ہوئی ہے۔ آپ سفارت کی عیاشیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ملک میں آپ کی محبوبیت
ختم ہو رہی ہے۔ وہاں آسے دن وزارتیں ٹوٹی اور جیتی ہیں۔ آپ سفارت سے استعفیٰ دیں اور پاکستان
میں جا کر اپنی مقبولیت بحال کریں۔“

بات سفیر کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے اسی روز استعفیٰ بھیج دیا جو فوراً ہی منظور ہو گیا۔ سفیر پاکستان میں آ
گیا اور جس وزیر نے اسے استعفیٰ دینے کا مشورہ دیا تھا وہ سفیر بن کر اس ملک میں چلا گیا۔ اسے سفیر بننے
کا بہت شوق تھا۔ اس نے وزیر اعظم کی بہت خدمت کی تھی۔ وزیر اعظم نے اسے کہا تھا کہ کسی سفیر سے
استعفیٰ والا دور اس کی حکمت چنے جاوے چنانچہ جس وقت سابق سفیر کراچی میں انکر سیاست کے میدان میں
اُترا اور اس نے جیدانے کو اپنے ماں بلا یا اس وقت سابق وزیر سمندر پار کے ایک ملک میں سفیر بن کر عیش کر
رہا تھا شراب پی رہا تھا اور اس نے اس ملک کی بڑی جیمن سوسائٹی کو لڑا اپنے خود جمع کر لی تھیں۔

سابق سفیر پاکستان ہیں ان کو سیاسی اکھاڑے میں اتر چکا تھا۔ کامیاب سیاسی لیڈر کی تمام خوبیاں اس میں موجود تھیں۔ اس کے پاس پانی کی طرح بہانے کے لیے وسیع تھا۔ دوسری خوبی یہ کہ جیسا جیسے جراتور پیشہ لوگ اور غنڈے اس کے ہاتھ میں تھے۔ نائی گرامی استاد تو برسرِ اقتدار پارٹی کے پاس تھے لیکن زیادہ اجرت پیش کرو تو فی الحالف پارٹی کا کام بھی کر دیتے تھے۔ سیاسی لیڈران کے نمونے رہتے تھے۔ ان کے بغیر کوئی سیاسی پارٹی کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔

اس سابق سفیر کی حریت پارٹی کا جلسہ دوسرے دن آرام باغ میں ہو رہا تھا۔ دو اخباروں نے اس کا خوب پروپیگنڈہ کیا تھا جس طرح سیاسی پارٹیوں کو جیسا جیسے استاد مل جاتے تھے، اسی طرح سودا گے محکمے اخباروں کی حمایت بھی خریدی جاتی تھی۔

”تو جیسا بھائی! یہ جلسہ کامیاب نہ ہونے پائے۔“ سابق سفیر نے کہا۔ ”میں تو معلوم ہی ہے کہ میں کیا کرتا ہوں۔“ اس نے اٹھ کر کہا۔ ”اگر یہ پارٹی کامیاب ہو گئی تو ملک کا طرہ و عرق ہو جائے گا۔ عوام بھوکے مر رہے ہیں۔ منگانی دیکھو کہ ان ملک جاکر پہنچے ہیں۔“ اس نے دیکھی کہ بھائی اور تین چار پیگ گلاس میں انڈیلے اور دو تین گھونٹ پی کر اس نے بلند آواز سے سانس چھوڑی اور بولا۔ ”اُدھی قوم ہر رات بھوکے سو جاتی ہے میں جب اپنے عوام کی یہ حالت دیکھتا ہوں تو رات کی نیند اڑ جاتی ہے میں صبح محبتوں میں جمہوریت بحال کرنا چاہتا ہوں، اور میں....“

جیسا نے اس کی رائے پر ہاتھ رکھ کر دیا اور بولا۔ ”ساتیس! آپ جلسے میں تقریر نہیں کر رہے ہیں جیسے جیب کمرے سے بات کر رہے ہیں۔ قوم جس طرح پہلے بھوکے سو جاتی ہے اسی طرح آپ کی حکومت میں بھی بھوکے سو جاتا کرے گی۔ آپ فکر نہ کریں میرے ساتھ معاملے کی بات کریں۔“

سیاسی لیڈر نے کھسکا سا سہو کے کہا۔ ”میں جمہوریت کی بات کر رہا ہوں۔ اس ملک میں جمہوریت کے نام پر عوام کی قسمت....“ جیسا نے ہنس کر اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔ ”ساتیس میرے آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس ملک میں میری جمہوریت چل رہی ہے۔ جیب کمرے والے اور اٹھائی گیارہ کی جمہوریت۔“

سیاسی لیڈر اپنے آپ میں اٹھ کر دھڑک بولا۔ ”مختار سے اس آدمیوں کی کچی تو نہیں؟“

”نہی۔ جیسا نے کہا۔“ آدمیوں کی کوئی کمی نہیں۔ آپ گندم امریکہ سے لیتے رہیں، غنڈے بدعاش سمجھے ہیں۔ ہمارا ملک صرف اناج پیدا نہیں کر سکتا۔ غنڈے بدعاش اتنے ہیں کہ آپ دوسرے ملکوں کو بھی بلانی کر سکتے ہیں یہ سیاست اور آپ جیسے لیڈروں کی جمہوریت چلتی رہی تو ملک میں مجرموں کی اور باغی کی صفائی سے روزی کمانے والوں کی اور کرائے کے غنڈوں کی کمی نہیں رہے گی.... آپ فکر نہ کریں۔ میرے پاس اتنے جیب کمرے اور اٹھائی گیارہ ہیں جو ایک سو تیس وں جلسوں کا ستیاناس کر سکتے ہیں۔“

”میرے دوست! سیاسی لیڈر نے جیسا کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”منہ مانگے نام و دول کا کل کا جلسہ تباہ کر دو۔ اور تباہ اس طرح کر دو کہ دیکھنے والے سمجھیں کہ یہ منہ مانگے لوگوں نے کیا ہے۔ یہ کام میری مرضی کے مطابق کرو چہرہ سدا کر چلیں میں تالے توڑے پھر دو، ڈاکے ڈالو، جوجی میں آئے کرو تو تھا راکو ایک بھی آدمی پکڑا لیا تو اپنا آدمی مجھ سے لے جانا۔“

”میں جب کمرے پر آتا ہوں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں کیا کچھ کر رہا ہوں۔ جیسا نے کہا۔ ”آپ کو یاد ہوگا۔ دسمبر ۱۹۵۲ء میں سکولوں کا بھول کے لوگوں نے اپنے مطالبے منوانے کے لیے لکھا تھا؟.... ہر روز جلوس نکالتے اور مظاہرے کرتے تھے مگر منہ نہیں کرتے تھے۔ ان کے مظاہرے اور جلوس پڑاں ہوتے تھے۔ اُس وقت بھی آپ کی حکومت تھی۔ آپ کی حکومت کو لڑاؤوں پر قہر ڈالنے کا کوئی جواز نہیں ملتا تھا۔ آپ کے اشارے پر میرے لوگوں نے جلوس میں طالب علموں کے روپ میں شامل ہو کر پھوٹا پھوٹا مارا اور منہ مار کر دیتے تھے۔ پڑاں جلوس فساد بن گیا اور پولیس نے لڑاؤوں پر آئیں بھی چھوڑی اور گولی بھی چلائی تھی۔ آپ جھوٹے تو نہیں ہوں گے کہ سینکڑوں لڑکوں کو آپ کی حکومت نے ایک دیر کی کار کو آگ لگانے کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا۔ یہ تو کسی کو بھی پتہ چل سکتا تھا کہ کار کو آگ لگانے والے میرے آدمی تھے اور کار کو آگ لگانے کا اشارہ کار والے وزیر نے کیا تھا۔“

”وہ کار سرکاری تھی۔“ سیاسی لیڈر نے کہا۔ ”اگر تم لوگ لڑکوں کے جلوس اور مظاہروں کو دیکھا؟ کی شکل نہ دیتے تو لوگ کے ہمارے لیے مصیبت بنے رہتے.... وہ تھا راکھال تھا جیسا بھائی! اسی لیے میری پارٹی نے کبھی کسی اور استاد کا سہارا نہیں لیا.... اچھا! اپنی کسوٹی پر پارٹی کا کیا حال ہے؟ کوئی پکڑ کر تو نہیں بٹوتی؟“

”میری پارٹی مڑے میں ہے۔ جیسا نے بول میں بھی بٹوتی دیکھی اپنے گلاس میں انڈیلے ہوئے جواب دیا۔ ”اگلا کچھ کرنا چاہتا ہے جس کی میں پروا نہیں کیا کرتا۔ ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ چھوڑ کر چل میں جا کر تیرا ہوا کرتے ہیں۔ انھیں ذرا آرام بھی مل جاتا ہے.... اور کبھی کبھی ایک دو چھوڑ کرے میں خود چل دیا کرتا ہوں تاکہ تمھارے والوں کی کار کو لاری پوری ہوتی رہے۔ اخباروں میں خبریں شائع کوئی جاتی ہیں کہ کراچی کے ایک بدنام چور پولیس نے ڈرامائی انداز میں بڑی دلیری سے پکڑا ہے۔ دو تین کانٹیلین کو آئی جی پانچ پانچ سو روپیہ العالم دیتا ہے اور لوگ خوش ہو جاتے ہیں کہ ہماری پولیس بڑی ہوشیار ہے۔“

”ہاں بھائی!۔“ سیاسی لیڈر نے کہا۔ ”ہیں پولیس کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے ہم اپنے مخالفین کو مختار سے ہاتھوں پاؤں کے ہاتھوں ختم کر لیا کرتے ہیں ہم تو اپنے آدمیوں کو پولیس کو پکب کا بھی سامنا کرنا ہوتا ہے۔“

”جس طرح آپ پولیس کو استعمال کرتے ہیں اس سے پکب سمجھ گئی ہے کہ پاکستان پولیس سٹریٹ بن چکا ہے۔ جیسا نے کہا۔ ”جب آپ کی مخالفت پارٹی کی حکومت ہوگی تو وہ پولیس کو آپ کے خلاف استعمال کرے گی۔“

”یہ ہماری سیاست ہے جیسا بھائی!۔“ سیاسی لیڈر نے کہا۔ ”پکب کا اس سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ہم اپنی بات کر رہے ہیں۔ مجھے ایک وزارت ملنے والی ہے میں وزیر اعظم اور پرنسپل کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔ پھر سارے کراچی کو اپنا سمجھو.... پیسے ابھی لینا چاہو تو لے جاؤ۔ جب کاٹ دوں؟ ہمیشہ سے دوں؟“

”پیسے تو سب سے لیں گے۔ جیسا نے کہا۔ ”سال بھر ہونے کو آپا ہے میرے دو آدمی دیکھتے ہیں کہ میں گرفتار نہیں آئی بڑے کام کے میں۔ کورٹ رکیں چلائی ہے نہ ضمانت لیتی ہے۔“

”وہ لیں میں جانتا ہوں۔“ سیاست دان نے کہا۔ ”مختار سے آدمیوں نے ٹاکر اس آدمی کی کٹھی میں ڈالا ہے جو سرکاری پکب میلر ہے۔ حاکم اور وزیر اس کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ پرنسپل کا خاص آدمی ہے۔“

”تو بھوک کس مرض کی دوا ہیں؟“

”مجھے بھوک نہ ملے گا، نام تباہ“

جیہا نے نام بتایا تو سیاست دان نے ٹوٹ کر لیا اور بولا۔ ”میں آج ہی بندوبست کو تیار ہوں، تمہیں دونوں آدمی واپس مل جائیں گے۔“

جیہا جانے کے لیے اٹھا تو سیاست دان سکڑ کر بولا۔ ”اور جیہا بھائی کوئی تازہ مال؟“

”ہے تو سی۔“ جیہا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مگر ابھی سوچ رہا ہوں۔“

”ایسے کاموں میں بھی بھلا سوچا کرتے ہیں؟“ سیاست دان نے کہا۔

”میرا ذرا کچھ اوقسم کا ہے۔“ جیہا نے کہا۔ ”خیر بندوبست ہو جائے گا، میں جانتا ہوں کہ آپ کی سیاست سے مال کے بغیر نہیں چلا کرئی۔“

اور جیہا اس کے ہونٹوں پر رال آؤد مسکراہٹ چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

شام تک جیہا سارے کراچی میں اپنے آدمیوں کو تلاش کرتا پھرا، دن بھر کی بھگ دوڑ کے بعد اس

نے پچاس کے لگ بھگ آدمی ڈھونڈ لیے اور انہیں دوسرے دن چار بجے آرام باغ سپینے کو لکھا باقی کام انہیں معلوم تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا جب جیہا صدر کے علاقے میں داخل ہوا اور ایمریس مارکیٹ کے سامنے ٹیکسی سے اتر کر کسی چھوڑ دی۔ ایک ہونٹ کے سامنے سے گزرا تو اسے خیال آیا کہ وہ صبح سے بھوکا ہے۔ وہ ہونٹ میں جا بیٹھا تین چار بیرے اس کا آؤر لینے کو پکے۔ انہیں معلوم تھا کہ جیہا پانی پینے آئے تو بھی دو چار آنے ٹپ فے جاتا ہے۔

”آج تو کوئی خاص چیز لاؤ بھئی؟“ اس نے ایک بیرے سے کہا اور مینر سے اخبار اٹھا کے دیکھنے لگا۔

پہلے صفحے پر ایک سیاسی پارٹی کے جلسے کا اعلان تھا جیہا کے ہونٹوں پر طنز آؤد مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے اخبار رکھ دیا۔

”آج تیر کھاؤ آؤد؟“ بیرے نے کہا۔ ”روست تیر۔“

”تیر؟“ جیہا نے مسکرا کر کہا۔ ”میرے رمضان ماہ کے پڑے ہوئے کوٹے تو نہیں؟“

”تو بھوکا آؤد؟“ بیرے نے کہا۔ ”کوٹے نہیں کھلائیں گے؟ اور تھوڑے گاگ آتے ہیں؟“

”شامی کباب اور مرغ ملاؤ لے آؤد؟“

”لے آؤد جو جی میں آتا ہے، لے آؤد۔“

وہ نماز کے آدمیوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کے تھک گیا تھا۔ اس نے سر سرسی کی بیڑ پر کھڑا کر رکھیں بند کر دیں۔ ہونٹ کے ریلو میں ستارچ رہی تھی جس کا نغمہ جیہا کے تھکے ہوئے اعصاب کو سملائے لگا اور ایک لذت آگیاں اس کی رگ رگ میں سرایت کرتا چلا گیا۔ ذہن میں ایک تصویر نے انکڑائی لی جب یہ تصویر کچھ آؤد ناز کا تھا۔ وہ ستارچ پر سوز نغمہ بجا رہی تھی اور جیہا اس کے سامنے لیٹا بے خودی میں آؤد کھڑا تھا۔ اس نے ناز سے نظریں ہٹا کر گھٹنے میں ڈوب جانا چاہا لیکن نغمے نے بھی ناز کا روپ دھار لیا۔

اس کا ذہن ناز کے قصور کو قبول کرنے سے گریز کرتا تھا اور اسی ذہن کے کونے سے ایک خیال اٹھا۔ ”ناز شاید کھانے پر انتظار کر رہی ہوگی۔“ اور اس خیال نے ایک پتھے کو جنم دیا۔ جیہا نے اپنے آپ میں لگدگی کی محسوس کی۔ وہ اس لگدگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ہرے نے سر پر پلیٹیں کھیں جیہا بیدار ہو گیا۔ اس نے سر کے ایک ہی جھٹکے سے ذہن سے ہر خیال جھٹک ڈالا لیکن اس نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ کوئی بات بھول رہا ہے یا کوئی چیز کہیں رکھ کے بھول گیا ہے اور یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ چیز کیا تھی اور کہاں رکھ گئی تھی۔ وہ کسی چیز کی محسوس کر رہا تھا۔

اس نے سوچا شاید بھوک زیادہ لگ رہی ہے یا شاید بھوک زیادہ ہو گئی ہے یا شاید وہ سابق سفیر کے

ہاں وہ سب زیادہ لگی گیا ہے۔ اس نے پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھا یا تو ریڈیو پر ستار کا نغمہ اور زیادہ پُر سوز ہو گیا اور ناز اود پکے کا تصور کھڑا آیا۔ جیہا نے بھٹے ہوئے تیر کو ہاتھ لگایا تو اسے پتھے کا لمس یاد آ گیا۔ رات کی سب تو بات تھی جب اس نے نواز تیرہ پتھے کو اٹھایا تھا۔ پتھے کا لمس اس کے ہاتھوں پر اور سینے میں جیسے ابھی تک ترو تازہ تھا۔ اس نے تیر پلیٹ میں رکھ دیا۔

پھر اسے ناز اود پر سوتے ہوئے نظر آئے۔ جیہا نے اس تصویر کو جھٹکنے کی کوشش نہ کی اور لا شعوری سے انداز سے ہلاؤ پلیٹ میں پھینکنے لگا۔ کھاتے پرے کوئل لائے کو کھانا کھڑا ہوا۔

برال لایا تو جیہا نے ہاتھ دھوئے بغیر جیسے دو تین ٹوٹ نکالے، بیرے کو دیتے اور بھاگنے کی رفتار سے ہونٹ سے نکل گیا۔

وہ اندھا دھند چلا جا رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ نہیں رہا تھا لیکن اس کا ذہن خالی بھی نہیں تھا۔ اس کی رفتار تیز ہوتی جاتی گئی مگر شعوری طور پر اسے معلوم نہ تھا کہ وہ جا کہاں رہا ہے۔ اس کے گھومتار کے نغمے کی گونج یوں مٹلا رہی تھی جیسے شہر کی ہزاروں کھیاں اس کے سر پر اڑتی جا رہی ہوں۔ اور اس گونج میں ایک پھر ورا تھا۔ ایک پھر نہیں رہا تھا۔

اس نے چلتے چلتے جیسے ناز کی آواز سنی ہو۔ ”جیہا! جیہا! آگے دیکھ میں نے تیرے لیے کتنا خوبصورت گھر بنایا ہے۔ دیکھ تیرے آگے میں ننھا کھیل رہا ہے۔“

ستار کی ترم گونج بلند ہوتی چلی گئی اور جیہا جیسے اس کے تعاقب میں بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بغیر دستک دیتے ایک دروازے میں داخل ہوا تو وہ چونک اٹھا اور گھبرا کر کھڑک گیا۔

”آؤ بیٹا! بابا کی باتیں سمجھتی ہی لائی۔“ بوڑھا موسیٰ غار اس سے مہلک تھا۔

”میں.... میں کہیں اور جا رہا تھا۔“ جیہا کو کھلا گیا۔ بولا۔ ”جانے یہاں کیسے پہنچا؟“ اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”چلو کسی طرح ہی آئیے، آؤ گتے؟“ بابا کمرے کے وسط میں دری پر بیٹھا تھا بولا۔ ”آؤ بیٹھو تو سی اجلدی میں ہو؟“

جیہا آگے بڑھ کے بیٹھ گیا۔ بولا۔ ”بابا کوئی الپ ہی سادو؟“

بوڑھا ہنس دیا۔ ایسی ہنسی جو اس باپ کے ہونٹوں پر ہی اسکتی ہے جس کا ننھا پیاری سی عندر بیٹھا ہو۔ بوڑھے نے اسے سنبھال لی۔

ناز چہیں گھٹنے کی عمر کے بچے کو ہاتھوں پر اٹھائے بہلا رہی تھی اور بچہ روئے جارہا تھا۔ دواسا تو تھڑا ناز سے سنبھل ہی نہیں رہا تھا۔ وہ بڑا دھمک کر کہہ نہاں ہو گیا تھا چہرہ متما رہا تھا۔ وہ دروازے کی طرف پیٹھ کئے ہوئے تھی۔ جمیل کو نہ دیکھ سکی۔

”روئے دے نازا بچکے کو رونے دے۔“ جیدانے انوکھی سی آواز سے کہا۔ ”میں نے تمام عمر کسی بچے کو قریب سے روئے نہیں سنا۔ ذرا سی دیر اور رونے دے“

جیہا نے خود محسوس کیا کہ جو کچھ وہ کہہ بیٹھا ہے اس نے خود نہیں کہا۔ وہ جھینپ سا گیا۔

”میں کیا جانوں!“ — ناز نے کہا۔ ”بتانا تھوڑے ہی ہے۔ شاید بھوکا ہوگا۔“

”ہاں! لڑکا دودھ پینا رہا ہے۔“

”بہنو پر ہے!۔ ناز نے روٹھنے کے انداز سے کہا۔ ”بہنو! اس گندی انگلی کو“

ناز نے جیلا کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے کے بدلے بڑے تہذات میں اس طرح کھو گئی جس طرح جیلا بچے کی ننھی سی ذات میں جذب ہو رہا تھا۔

بچہ دودھ پی کے سو گیا۔ جیسا نے اپنی ڈائری کی ورق گردانی کی تھوڑی دیر بعد اس میں لکھوا۔ کچھ لکھا اور باز کے ہلکے کے ساتھ دوسرے ہلکے پر سو گیا۔

Scanned By Wagdar Azeem Pakistanipoint

”جو سنا دو۔ جیہا نے کہا۔“ جس میں تمہارے من کی سنگت ہو۔“

جیداموسیقار کے چہرے پر چھاتی سُہوئی گہری لکیروں میں کھو گیا تھا۔

”تم نے اس روز کہا تھا کہ تم حبیبیں کاٹتے ہو؟“ بڑھے نے کہا۔ ”سچ کہتے تھے تم؟“

”میں چہرہ ہوں، ڈاکو ہوں۔“ جیدانے تم کو آدمی کہہا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس نے بڑھ کر موبیڈاک کی کلائی پر کلائی اور بولا۔ ”میں اٹھائی گھر ہوں! اس وقت باندہ دلا تے تو تھرا را گیا بھٹا جاتا ہا۔“ میرے منہ پر تھوک دیا ہونا کالی دے لی ہوئی۔ دوسری دیر تو مجھے بھول جانے دیا ہوتا کہ میں عجیب کترا ہوں۔“ وہ بولنے لگے۔ بولنے چپ ہو گیا۔ اس کی جذباتی افراتفری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

”اے بابا کو تو غلط نہ سمجھو بٹیا!“

جیدانے فحش کنا چاہا مگر کہ نہ سکا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بائیں نکل گیا۔

بوترہا حیران و ششدر بیٹھا اس غلام میں گھورتا رہا جہاں تھوڑی دیر پہلے جیسا بیٹھا تھا۔

جیسا کہ پہنچا تو اس نے لڑکے سے منٹے اور مٹی کے متعلق پوچھا لڑکے نے بتایا کہ وہ رات دیر سے
 آہیں گئے۔ اس کمرے میں فرش پر کپڑا بچھا تھا۔ جیسا اسی پلٹ کر گیا اور اسے اٹھکے آنے کی مگر ایک نوزائیدہ بچے
 کے رونے کی آواز آنے لگی اسے حیران کیا وہ اٹھ کھڑا ہوا اور خراب خراب اپنے کمرے کے دروازے میں جا

بیرے کا جگر

۱۱۳

کافرہ لگانے والوں کو لگا رہا ہو۔

حاضرین کی آغوش صفت سے چالیس سچاس آدمی اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے یہ دوا دلا باکرتے ہوئے۔ ”پچھلے پچاس لاکھ چار سو تیس ہوتے۔ آگے بیٹھے لوگوں کو دھکے دینے شروع کر دیتے۔ آگے والے گھبرا کر اٹھ کر آگے ہی دھکے دے لگے۔ پھر ان سے آگے بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ اور دوا سنی دیر میں تمام جھوم دھکلا جوا سیلاب کی موج میں کڑیٹھ کو بھی روندنے لگا۔ ایک بڑا بنگ تھا قیامت تھی کڑا آسمان کے پردے پھٹنے لگے۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکیل اور روند رہے تھے اور جلنے کے منتظرین میدان چھوڑ گئے تھے مقرر جھگ کے کار میں جا بیٹھا اور میدان جہاد کے ہاتھ رہا۔

جہاد اپنے مخصوص بہروپ میں تھا۔ سیاہ نقل وادھی، آنکھوں پر چاندی کے فیم والی عینک، تنگ پاجامہ اور قمیض اور چادر اوڑھے ہوئے۔

رات جب شکست خوردہ لیڈر سیکرٹری کو اخباروں کے لیے یہ بیان لکھوا رہا تھا کہ اس کی تقریر کے دوران ہلارڈی کی ذمہ دار برسرِ اقتدار پارٹی ہے اور یہ عوام نہیں تھے بلکہ اس پارٹی کے غنڈے تھے تو اس وقت اس کی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں کراچی کے چھ اداغنڈے بیٹھے اس کی ہدایات کا انتظار کر رہے تھے۔

رات نو بج رہے تھے جب جہاد سابق سفیر کی کوٹھی سے پانچ ہزار روپے وصول کرنے کے نکلا۔ رشتہ اور پیسہ بکر پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جہاد نے تمام رقم ٹیپوڈے کر کہا۔ ”ایک ہزار ان کی بیوی کو دے، آما اور باقی چار ہزار اپنے چھ بکروں میں بانٹ دینا۔ دیکھنا کوئی رہ نہ جائے کسی کو ناراض نہ کرنا۔ ان سب کی نہیں بہت ضرورت ہے۔ تھوڑے دنوں بعد کارپوریشن کے ایکشن شروع ہونے والے ہیں۔ دوسری پارٹیوں کے آدمیوں کو بھی پھینچنے کی کوشش کرو“

”اُدھر کا کیا ارادہ ہے؟“ سنے نے کہا۔ ”چھو کر اتیار ہے، کہتا ہے کسی رات آجاؤ۔“

جہاد کے ماتھے کے شکن گہرے ہو گئے۔ دواسو چکر لولا۔ ”آج ہی.... گاڈی کا بندوبست کر لو رات دو بجے میں لال کوٹھی کے شاپ پر ملوں گا.... اور.... تم دونوں آجانا۔ ہم تینوں ہوں گے۔ چھو کرے کو اطلاع کر دینا۔“

عاجی عمر دین چراغ دین نے ایک غیر ملکی فرم کے اشتراک سے معمار کی کمپنی کھولی تھی اور خوب کام لے رہے تھے۔ جہاد کا ایک لکھا پڑھا چھوکر ان کی کوٹھی میں ملازم تھا اور کوٹھی کا چکیہ راجھی جہاد کا ہی آدمی تھا۔ بونگ سوسائٹی کی یہ کوٹھی محل سے کم نہ تھی۔ ہزاروں روپے سیف میں رکھے تھے۔ چند روز ہوئے چھو کرے نے بتایا تھا کہ ان دنوں سیف میں پندرہ بیس ہزار روپیہ ڈال رہا ہے اور ستر ستر ہزار کی مالیت کے زیورات بھی ہیں۔

آج رات دو بجے کا پروگرام طے ہو گیا۔ مٹا اور ٹیپو چھو کرے کو اطلاع دینے اور گاڈی کا انتظام کرنے چلے گئے اور جہاد بیٹھے بیٹھے فریئر گارڈن جا پہنچا۔

ابھی رات کے نو بجے تھے۔ جہاد باغ میں گھاس پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ رات دو بجے تک وقت کیسے گزارا جائے۔ بیسوں بگلیں تھیں جہاں وہ وقت گزار سکتا تھا۔ جوئے بازی کے کسی اڈے پر چلا جاتا۔ رات کے وقت تو بارڈے پر خوب رونق ہوتی تھی لیکن اس کی طبیعت شراب اور جوئے پر کاماؤ

وہ ایک چوری چورے پُزل گیا۔ دواسی چوری لیکن ڈاکے ڈالنے والا خفیہ کمیت ذراسی چوری کرتے جھجک رہا تھا۔ ڈور ہاتھ تھا۔ وہ چوری اس انداز سے کرنا چاہتا تھا کہ خود بھی اپنے آپ کو چوری کرتے دیکھ نہ سکے۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر تپاتی سے تپس اٹھائی، جلائی اور چٹائی جوئی دیا سلائی نازکے پنگ کی طرف کی۔ زرد لوں اسے نازا اور پوچھ گچھری نیند سوتے ہوئے نظر آتے۔ ناز بھی اسے بچنے کی طرح محسوس اور بھولی بھالی دکھائی دے رہی تھی۔ سچا اس کے سینے سے لگا اطمینان اور سکون کا دھڑلہ سب مرقع بنا ہوا تھا۔ جہاد دونوں کو دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور اس نے آہستہ آہستہ ماتھے آگے بڑھایا۔ دیا سلائی کچھ گئی اور اندھیرے میں وہ خیال بکھر کے سامنے آگیا جوتھوڑی ہی دیر پہلے اس کے ذہن میں دھندلے سے ساتے کی طرح رنگ رہا تھا۔

بہت دیر بعد پوچھو کر سے رونا تو ناز نے اٹھ کر تپ جلائی۔ دیکھا کہ جہاد ساتھ والے پنگ پر گھری نیند سو رہا تھا۔ اس کا بازو نازکے پنگ پر تھا اور اس کی انگلی بچے کے ٹٹھکی میں پکڑ رکھی تھی۔ ناز نے بچے کے ہاتھ سے جہاد کی انگلی چھڑانے بغیر دو دھکی بول بچے کے منہ سے لگادی۔ جہاد گھری نیند سو رہا تھا۔

دوسری صبح جب جہاد گھر سے نکلا اور ایک اڈے پر جا کر چرس کے دوکش لگائے تو وہ اپنے اہلی روپ میں آگیا۔ جہاد جیب کھڑا، استاد غنڈہ۔

آج تو اسے خاص طور پر اہلی روپ میں رہنا تھا کیونکہ اسے ملکی سیاست کے ناکام میں اہم پارٹ ادا کرنا تھا۔ اُدھر آرام باغ میں ایک عظیم الشان جلسے کے انتظامات مکمل ہو رہے تھے۔ اُدھر جہاد اپنے آؤپل کو جمع کر رہا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے دو جاسوس یہ معلومات فراہم کرنے کو بھیجے کہ جلسہ کرنے والی پارٹی کسے ساتھ کون کون سے اور کتنے غنڈے ہیں اور کراتے کے نعرہ باز کون کون سے ہیں۔

شام تین بجے تک جہاد اپنے انتظامات مکمل کر چکا تھا اور آرام باغ انسائول سے بھرتا رہا تھا۔ یہ وہ انسان تھے جو فٹ پاتھوں پر بھاگ رہے ہوتے ہیں، یا بسول اور ٹراول میں مٹھوئے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کی دھکم پل اور اغرافری سے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ بہت جلدی میں ہیں اور انہیں سانس لینے کی بھی ضرورت نہیں لیکن جہاں کسی حکیم کا مجمع دیکھتے ہیں یا بدامنی کا نشانہ یاد آؤ آدمیوں کو اونچی اونچی باتیں کرتے دیکھتے ہیں تو وہیں جم کے رہ جاتے ہیں اور کہیں جلسہ ہو تو یہ لوگ جلسہ گاہ میں ڈھیر ہو کر خدایان اسلام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سائڈ بن جاتے ہیں۔

چار بجے سے پہلے یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں جلسہ گاہ میں جمع ہو گئے تھے۔ کچھ اس خیال سے کہ قوت ان سڑکوں پر بھگتا ہوا آگے نکل جاتے اور وہ جلسہ گاہ میں ہی بیٹھے ہیں اور زیادہ تر اس لیے کہ شایدا ان کی سسکتی ہوئی امیدوں کی کسی لیڈر کی تقریر تھوڑی سی جان ڈال دے۔ جیسے کا بہانہ تھا۔ غریب خوردہ جویم ایک اور غریب کی تلاش میں جلسہ گاہ میں شروع ہوا تھا۔

تلاوت قرآن ختم ہوئی تو پارٹی کا لیڈر تقریر کرنے اٹھا۔ شیخ سے ”زندہ باد“ کے نعرے بلند ہوئے۔ جوں ہی تقریر شروع ہوئی حاضرین میں سے مردہ باد کا نعرہ بلند ہوا۔ تقریر جاری رہی۔ ”زندہ باد اور مردہ باد“ کے نعروں کا تبادلہ ہونے لگا۔ شیخ کے قریب بیٹھے جوئے جہاد ایک آدمی اٹھے اور حاضرین پر رنگہ ڈالی ان کی آنکھوں میں چیلنج کیا۔ چیلنج کرنے والی پارٹی کے محافظ تھے۔ انہوں نے مل کر ”زندہ باد“ کا نعرہ یوں لگایا جیسے مردہ باد

نہ جوتی۔ اسے گلنار کا خیال آیا۔ سوچا کیوں نہ اسی کو پاس لے جائے لیکن گلنار کا خیال آتے ہی اسے ناز یاد آگئی پھر بھی یاد آگیا۔ اس نے غم کو لب تھکا گھر پر چلا جاتے لیکن اس نے جو پتال کا سا جھکا ہوا کیا اور اس کی داخلی دنیا وہ حصول میں کھٹ گئی۔

ایک طرف گلنار کی بات کی جھکا رہی تھی۔ دوسری طرف ناز کے گلابی پیڑوں کی پاجوال سی جال۔ اُدھر قص کی ادائیں تھیں جو بل و سارنگ کے مترنم ہنگامے میں گناہوں کی دعوت دیتی تھیں، اُدھر ناز کی بیانتہ مسکراہٹ تھی جس میں تشنہ سی التجا تھی جیسے کبڑی ہو۔ ”جیدا! گھر آ جا یا کو دنا! میں راہ دیکھا کرتی ہوں!“ اُدھر عریاں جسم کی نمائش تھی جو جموں کو گرمائی تھی اُدھر سٹورجن کا سحر تھا جو روح پر وجد طاری کرتا تھا۔ اُدھر سارنگی کے بکاؤ نغمے تھے اُدھر ناز کی تپتی پتلی سی دل کش انگلیاں ستار پر یوں چلتی تھیں جیسے انگلیں اور ارمان رومانوں کی توس فرج پر خراماں خراماں چلے جا رہے ہوں۔

جیدا کے ذہن میں سارنگی بجنے لگی جو بچنے کی ”اغبول اغبول“ میں بدل گئی گھنگھڑول کی جھکا کر میں پینالیاں اوپٹھیں بجنے لگیں جیدا اٹھ کھڑا اور گھر کا رخ کیا کیڑا لگا گیا۔ لاشعر کے اندھیرے سے ایک خیال ابھر آیا۔ گلنار کی دنیا میں ہری بادشاہی ہے لیکن ناز کی لسانی ہوئی دنیا میں شاید وہ بات نہیں۔

ناز، بچے اُدھر گھر کے خیال نے جیسے اُسے ڈھک مار دیا ہو شکست کا تلخ سا احساس بیدار ہو گیا جیسے اسے ناز کے سامنے پادہ بنجیہ لے جایا جا رہا ہو۔ اُس کی رگ رگ بیدار ہو گئی۔ اسے یاد آگیا کہ وہ کراچی کا نامی محبت اور مہتی کا گھنگھار استاد ہے اور ناز بھی سی چڑیا ہے جسے وہ کسی بھی وقت پتھر سے نکال کر ٹھکی میں با کے مار سکتا ہے۔

جیدا کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا اور وہ لمبے بائے ڈک بھر چل پڑا۔ الیسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ جیدا خیالوں کے دوراں پر آ کر کہو۔ وہ تو ایک ثانیے میں فیصلہ کر لیا کرتا تھا جس آئے توجہ سے پرچا بیٹھے طبیعت اُن کی تو انہی کسی طوافت یا رفاقت کے دل پہنچ گئے لیکن آج رات وہ اتنا سا فیصلہ نہ کر سکا کہ رات کی چند گزیراں کھال گھڑا رہے۔ وہ جرات کی دنیا کا بادشاہ تھا اور ملک کی سیاسی دنیا میں بھی اب عملہ اُنسی کی بادشاہی تھی۔ آج وہ حزب مخالف کی پارٹی کا جلسہ تباہ نہ کرنا نہ ملکان پارٹی کی کمر لوٹ جاتی۔

جیدا کے دل و دماغ پر فتح کا لٹھ طاری ہونے لگا۔ حکمران پارٹی کے لیڈر جو رازنوں کے اسیدوار تھے، جیدا اور اس کے ساتھیوں کے کس قدر محتاج تھے۔

اسے یاد آگیا کہ وہ آج رات ڈاکٹر ڈالنے جا رہا ہے۔ ڈاکٹر کے خیال نے اسے شرب کی نصف بوتل جتنا سرد و یاد اور دھوم دھوم کے چلنے لگا۔ ذہن لاشعور میں تھوڑی سی دیر پہلے جو کچھور پیچھے لگے تھے سب مر گئے۔ غلش رہی نہ بے کلی۔

وہ چلتا ہی چلا گیا۔ اس کا روال روال سردار و مطمئن ہو گیا تھا۔ اس کا دل کسی تفریح کو چمکنے لگا۔ وہ رک گیا۔ اُدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی ٹیکسی یا رکشا نظر نہ آئی۔ شڑک بڑکس ایک دوسری سے آگے نکل چلنے کو بھانگی جارہی تھیں رات کے تونج چکے تھے۔ ٹریفک پولیس کی ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی اور سڑکوں کا قانون ڈرائیروں کے ہاتھ میں تھا۔ جیدانے بسوں میں ٹھونسنے ہوئے انسانوں کے انہوہ کو دیکھا تو اسے ہنسی بھی آئی۔ ترس بھی — ”فریب خوردہ انسان“ — اس نے سوچا۔ ”اس مردہ مخلوق کی قسمت میں اب زندہ باد کے نعرے ہی رہ گئے ہیں۔“

اسے ایک ٹیکسی آتی دکھائی دی اور خیالوں کا سلسل ٹوٹ گیا۔ اس نے ٹیکسی روک لی ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے پوچھا ”کون سا؟“ وہ لو کھلا گیا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ بغیر سوچے بولا۔ ”جیکب لائن“۔ بوڑھا مسیخار آج پھر سرد و کبھی راک میں اُجھا ہوا تھا۔ جیدا غم کے میں داخل ہوا تو بوڑھے نے سردو الگ رک دی اور غصہ لگا کر بازو پھیلا دیتے جیدا اس کے پاس بیٹھ گیا تو بوڑھے نے اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر اس کا ہاتھ چوم لیا۔ اُس کے مینا خندہ اور جاندار قفقے میں جو دالما زین، مسرت اور اپنا سرت تھی وہ جیدا کی روح تک اتر گئی جیدا نے اپنے آپ سے کہا۔ ”اچھا ہوا میں گلنار کے ہاں نہ چلا گیا“

”کچھ کھاؤ گے مینا؟“ بوڑھے نے دوستانہ بے تکلفی سے پوچھا۔
”اول ہوں!“ جیدا نے سر ہلا کے کہا۔ ”میں تو ستر سننے آیا ہوں۔“

”کچھ پیو“۔
”کیا پلاؤ گے بڑے میاں؟“ جیدا نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے پوچھا۔

”اس وقت شاید ڈرائی جن کی ایک اُدھ بوتل رکھی ہوگی۔“ بوڑھے نے متانت سے کہا۔

”ڈرائی جن؟“ جیدا نے حیران ہو کے پوچھا۔ ”تم پیتے بھی ہو بڑے میاں؟“

”نہ پتوں تو طبیعت جمی نہیں۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”بس آتی سی پیتا ہوں کہ تشنہ نہ ہو، مسرت آجائے۔“

بوڑھا بوتل اور گلاس لے آیا۔ شرب نے ستاروں اور جیدا کی اجنبیت دور کر دی۔

”اُس روز تم روٹھ کے چلے گئے تھے!“ بوڑھے نے پوچھا۔ ”کیوں؟“

”اُس روز کی بات کچھ اور تھی۔“ جیدا نے مسرور سے لہجے میں کہا۔ ”آج جو جی میں آئے کہہ دو۔“

”میں نے پوچھا تھا تم کون سے کیا ہو اور تم نے کہا تھا میںیں کاٹا ہوں۔“

”صرف میںیں نہیں۔“ جیدا نے مسکرا کر کہا۔ ”تا لے بھی توڑتا ہوں، ڈاک بھی ڈالتا ہوں یہ میرا پیشہ ہے بڑے میاں! میں غنڈوں کا سردار ہوں۔ ہمارے پاس نیو سٹروڈ کی جو عورتیں گانا بجانا سیکھنے آتی ہیں ان سے پوچھنا وہ نہیں میرے متعلق بہت کچھ بتائیں گی میرا نام جیدا جب کترا ہے۔“ اس کا لہو سر سے بھر پور تھا۔ ”پہلے روز میں یہاں غنڈے کے روپ میں ہی آیا تھا پتہ چلا تھا تمہارے دل زنبیلاں آتی ہیں میں سمجھا شاید یہاں بھی دھند چلتا ہے۔“

بوڑھا حیران ہوا نہ اسے غصہ آیا وہ کھل کر ہنسنا اور بولا۔ ”آج کس روپ میں آتے ہو؟“
”بیٹے کے روپ میں۔“ جیدا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”لیکن بڑے میاں! دعوئے شروع کروینا۔“
بول نہ کر بٹھنا کہ بیٹا اجڑی چکاری تو بڑی بات ہے۔“

”میں کچھ کموں کا بیٹا!“ بوڑھے نے اُنس بھر سے لہجے میں کہا۔ ”اتنا سرد و کموں کا کہ آتے ہو کہو میرا دنیا میں کوئی نہیں غم لیں ہی اکیلے گزار دی ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی آتا ہی رہا رہے۔ گھر میں رونق سی لگی رہتی ہے۔ تنہائی میں دل ڈوبنے لگتا ہے۔“

جیدا تو قلعین ہوئی چکا تھا کہ ناچنے گانے والیوں کے ساتھ بڑھے کا تعلق اس کے سوا کچھ ہی نہیں کہ وہ اس سے گانا بجانا سیکھنے آتی ہیں اور یہ بھی کہ وہ انہیں بچوں کی طرح عزیز سمجھتا ہے لیکن اس نے آج پھر محسوس کیا کہ بوڑھا سراپا بیدار و نرم ہے۔ اس کی آواز میں بھی بیدار بھری لہجی ہے اور وہ بالآخر دھک دھک کا ہوا ہے یا جھٹکے ہوؤں کی بناہ گاہ ہے۔

جیو ایسا لائی سمجھنے تک دونوں کو دیکھتا رہا اور اس ذرا سے عرصے میں اس کی سہتی کاٹا کو اور چہرہ اچکا گئی رہی نہ سو گیا۔

اُس نے حملہ سے ایک اور دیاسلافی جلاتی جیسے وہ کوئی خاص چیز دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے دیکھا نازکی پشانی پر پسینے کی ٹہنی تھی جیسا کہ خدیا ل ایک مسکان کی بجلی نہیں درجہ بجلی کا بیٹھا ہے آنا لکین وہ وہاں بجلی لکھوانے کی سوجھ بوجھ نہیں سکتا تھا کہ بکرہ مسکان جوں جوں زمین پر تھا جراتم یہ لکھوانے کی ملکیت کی وجہ سے زمین وہ وز تھا۔ وہاں بجلی لکھوانے کا مطلب تھا کہ یہ ٹرپڑھنے والے مینے میں کئی بار ایک کریں گے اور بجلی والے مسکان کا نام بھی جڑوں میں لکھ لیں گے۔ جیسا مسکان کو سرکاری کاغذوں میں لاسے سے تحریر کیا جاتا تھا۔

وہ بے اختیار ہوئے آگے جھکا۔ وہ نازکے دوپٹے سے اس کا پسینہ پونچھنے کو آگے سے جھکا تھا لیکن دیاسلانی کی لو اس کی انگلیوں تک پہنچ نہ سکتی اور وہ چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ بلیک پرلیٹا اور سوگدا جیلا اگے دن دوپہر کو جاگا۔ وہ شاید نہ ہی جانتا لیکن پھر یہی طرح رونما ہوا اور نازغر سے میں نہیں بچتی۔ جیلاروں اچھل کے اٹھا جیسے کچرے نعل سے میں ہو چوخی سیچے کے قریب بڑی تھی جیلا نے اٹھا کے اس کے منہ میں دے دی اور پھر چپ ہو گیا۔ جیلا تیزی سے باورچی خانے تک گیا، ناز بول میں دوڑھال ہی بچتی ”جلدی کرونا“۔ جیلا نے بے نمانی سے کہا ”اپنی دیر سے رورہا ہے بھوکا تو زرخا کر لو ستے با“ لیکن وہ اپنی سی آواز پھینچتے گیا اور جھینپ کو چھپا لے کر خوشش میں قدر سے رعب دار آواز میں بولا ”سوئے بھی نہیں دیا، صبح چرخ کے جھکا دیا“ اور وہ باورچی خانے سے نکل آیا۔

اس نے چھتیس سینتیس برس کی عمر میں پہلی بار محسوس کیا کہ وہ ڈاکو اور چور اچکا جا نہیں کچھ اور بھی ہے اور اسے ایک حد تک افسوس سا بھی ہوا کہ وہ ڈاکو اور چور اچکا ہے۔ یوں تو وہ چند دنوں سے اپنے اندر ایک مہل چل سی محسوس کرنے لگا تھا لیکن کبھی توجہ نہ دی تھی۔ آج یہ مہل ایک انکشاف بن کے سامنے آگئی۔

آج تک وہ اپنے آپ کو ایک ہمیت نال انسان سمجھتا رہا تھا جس سے لوگ ڈرتے تھے اور جس سے کسی کا گھر اور کوئی سالن محفوظ نہیں تھا۔ اس احساس سے اس پر لٹھاری ہو گیا یا تو تھا مگر آج اسے بول لگا جیسے کوئی ازہدیت ناک قوت بھی ہے جو اس کے گھر میں پرورش پاتے پتے پر چھیننے کو بر تول رہی ہے اور پھر محفوظ نہیں۔ جیسا اندر ہی اندر یوں چمکا ہو گیا جیسے وہ نہ بنو اور نہ ایک دل بھی زندہ نہ رہ سکے۔ ایلے

نہیں است اپنا باپ یاد کیا۔ اس نے منہ کھیں اور پشانی سکیر کو باپ کے خدو خال کو قصور میں آراستہ کرنا چاہا لیکن اسے اس کا ایک بھی نقش، چہرے کا ایک بھی خط یاد نہ آیا۔ اس نے ذہن پر اور زیادہ زور دیا تو اس کے باپ کے خدو خال ابھرنے لگے لیکن خدو خال بکھرے تویر حید کے اپنے چہرے کے تھے۔ بہر ایک خط اس کا اپنا تھا۔ اس کے سینے میں باپ بیدار ہو گیا اور سہ اس کے احصاء پر جھج گیا۔

بولڑہ: 'بوسقار کچھ بھی تھا لیکن جیڈا کا کردار جن خامیوں اور محرومیوں سے عبارت تھا وہ ایسے فحرم نگار تھے جن پر پدھے کی پُر خلوص باتیں اور انیت مہم کا اثر کھتی تھی اور جیڈا کی لاشعری غلش اور بے حد عینی سکون بڑے ہونے لگتی تھی۔ آج رات تو بولڑہا اس کے دل کی تنہوں میں اتر گیا تھا اور جیڈا کو فینڈا آنے لگی تھی لیکن بولڑہے نے وقت بوجھ لیا اور تینچے کے نیچے سے گھڑی نکال کر دیکھی۔ بولڑہا ایک منج رہا ہے اور جیڈا جاگا اٹھا۔

بولڑہے کا سحر ٹھہل گیا اور جیڈا کا نہر اُبھر آیا۔

”ایک جج گیا ہے؟۔ جیہا نے حیرت سے پوچھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ہللا۔ ”سوجاؤ بڑے میاں! سو جاویں نے نہیں اتنی دیر جگاتے رکھا! بہت برا کیا۔“ اور وہ باہر نکل پڑا۔

”کل آؤ گے بیٹا؟“

”اگر آسکا تو۔“

”وہ بچے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ ہاتھ سگ سوسا لی کی شانہ زلیتی پر سکوت طاری تھا حاجی عمر دین چاغدین کی کوٹھی میں گھب اندھا تھا گھر والے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ کوٹھی کا چکریدار چھانک میں کھڑا بے تابی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا تمام ملازم اپنے کارڈ وال میں سو رہے تھے۔ صرف ایک ملازم اپنے کارڈ میں نہیں تھا۔ وہ بالائی منزل کے رآمد میں سے کھڑا تھا۔ کوٹھی کا کچھوڑا سے ایک ٹیکسی کھڑی تھی جس کی کرسی پر تیس غائب تھیں، مٹیا، ٹیڈا اور جیٹا ٹیکسی میں بیٹھے تھے۔

جس کی ہر برکتیں غائب ہیں، سنا، چوادر پھینک دی گئی ہے۔
 بالائی منزل کے برآمدے کی قبی علی اور بچہ جی چوکیدار نے منہ سے دل بھائی تو لیر تریس کا خونخوار گناہ
 جو کھوٹھی کی رکھوالی کی خاطر ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا، جھاک کے چوکیدار کے پاس آیا۔ چوکیدار کے ماتھ میں جینس
 کا سینک تھا جس میں اُس نے گُشت بھر رکھا تھا۔ اس نے سینک کھتے کتے آگے کیا۔ ایسا سینک پر
 لپکا تو چوکیدار پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ رہتا بھی گُشت کی بو پرملا تا اس کے پیچھے چل پڑا۔ چوکیدار نے سینک
 دُور سے چھینک دیا اور قہقہا جھاک کے سینک پر ٹوٹ پڑا۔

”چکر دیا تو کی طرح بولا۔ اوپر کے برآمدے کی تہی ایک بار چھلی اور سمجھ گئی۔ پانچ سات منٹ بعد کھٹی کے ایک کمرے کی تہی چلی اور گھبرائی ہوئی، غور سے آواز سنانی دی۔ ”کان ہو؟“ اور مابعد گھٹی ہوئی آواز۔ ”چرچور۔“ اُچھری اور کمرے میں ہی گھٹ گئی۔

ملازم نے راہ صاف کر رکھی تھی۔ جبکہ اور اس کے ساتھیوں کو سولہ سترہ ہزار روپے نقد اور ہزار کی مالیت کے زیورات سمیت سے نکال کر اکریب اٹھائی کمپن میں ڈالنے کی دس منٹ لگے۔

ہیکابک کو کھٹی سے شورا اٹھا۔ ملازم جاگ اٹھے۔ حاجی چراغ دین نے دونی بندوق نکال کر داغ دی حاجی عمر بن طاہر کو تیسرے پکارنے لگا لیکن کتا سچو کو کھٹی سے دور سینک سے گوشت نکالنے میں مصروف تھا جبکہ

مناد اور بیٹکی میں بیٹھے گرینڈ اہول سے بھی آگے نکل گئے تھے۔
 ابھی رات کے تین نہیں بجے تھے جب جیلا اپنے گھر میں داخل ہوا مناد اور بیٹکی کس اٹھائے مکان
 کے ایک بندو دیوان کمرے میں چلے گئے جیلا دبلے پاؤں نازکے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے
 اندھیرے میں ہی اپنے پلنگ پر لیٹ جانا چاہا لیکن اس کا ہاتھ غیر شعوری طور پر جیب میں چلا گیا اور دوسرے
 لمحے اس کے ہاتھ میں علقی ہوئی دیاسلانی تھی۔ اس نے دیکھا ناز اور کچھ گری نیند سوئے ہوئے تھے۔

ان چھ میمنوں کے دوران جب تین چار مرتبہ لوٹے ہوئے سوار کے ہاں کیا جب سب معمول ستارسی باتیں کہیں باتیں سنیں اور ایک رات وہ وہیں سو گیا لیکن پوچھنے ہی ٹھہرا کر اٹھا اور لوٹے کو سوتا چھوڑ کر لوں اپنے گھر کی طرف بھاگ بھاگ اٹھا جیسے اس سے کسی نے خبر دیا ہو تو خیر اسے مکان کو الگ گئی ہے۔ اتنی سویرے اسے کیسی ملی نہ کوئی اور سواری۔ وہ بہت قدم چلتی کیا اور صبح کا آجلا نکھرنے سے دراپٹے گھر پہنچ گیا۔ لڑکے نے دروازہ کھولا تو وہ اسی تیزی سے اپنے گھر سے میں کیا نماز اور پھر سوتے ہوئے تھے۔

جبار لگ گیا اور اس کا دل میٹھنے لگا۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ہند میں چلا رہا ہے اور کچھ کھل گئی ہے۔ اسے وقت سی ہوئی کہ وہ کیوں بھاگ آیا تھا اس کی خاطر اس نے اتنا طویل راستہ سیدل طے کیا تھا.... نازی خاطر پہنچنے کی خاطر.... وہ بے چین سا ہونے لگا اور سر جھکاتے پلنگ تک گیا لیٹا اور سو گیا۔

پتہ اب بٹھتا بھی تھا، ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا بھی تھا اور سہارا لے کے کھڑا بھی ہو جاتا تھا۔ گھر میں اب کوئی چیز اس کی دسترس سے محفوظ نہیں تھی۔ رہیں گے سر کتے صحن اور برآمدے میں گھوم پھرتا تھا۔ اندازاً اسے کچھ گھنٹے تو وہ دستار پر جھپٹے بارے لگتا تھا۔ وہ دستار کس اوچی جگہ جارہی تھی تو وہ چیخ چیخ کر زبالہ کر لیتا تھا۔ وہاں اس نے تار توڑے تھے اور ایک بار تار سے اپنی انگلی کاٹ لی تھی۔

جبارا شہر کا ایک نازک نر جانا لیکن وہ جوانک کے جاگ اٹھا۔ دیکھا، پھر اس کے منہ پر ننھے ننھے پٹہ مار رہا تھا اور چیخ چیخ کے کہیں رہا تھا۔ نازک مرے میں نہیں تھی جبارا نے لپک کر پٹے کو اٹھایا اور اپنے سینے پر پٹا لیا لیکن پھر لیٹنے کے کوڑ میں نہیں تھا۔ اس نے جبارا کے سینے پر کوڑ مارا شروع کر دیا۔ ننھے کی بندرول جیسی حرکتوں پر جبارا پہلے مسکرایا پھر کھل کر ہنس لیا لیکن یہی جیسی کی جیسی کی آواز پر چونک اٹھا۔ پھر یوں ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے وہ خود نہیں کوئی اور ہنس تھا۔ اس کی نگاہیں ہنسی کی کھٹکتی گورج کا تعاقب کر رہی تھیں۔

وہ جھنجھلایا، لیٹے لیٹے پیچھے کو فرش پر ٹھپا کر اٹھا اور باہر چل پڑا۔ اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اس سے پہلے اس کا دل کبھی یوں نہیں دھڑکا تھا۔ قتل اور ڈاکے کے وقت بھی اس کا دل یوں نہیں دھڑکا کرتا تھا۔ اس نے تو کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا کہ اس کے سینے میں دل ہے جو دھڑکتا ہے۔

”ناشتہ نہیں کرو گے؟“

اس نے گھوم کے دیکھا۔ نانا تھ میں ٹرے اٹھاے برآمدے میں کھڑی تھی۔

”نہیں! جبارا نے کہا۔“ میں باہر جا رہا ہوں۔“ اور وہ دروازے کی طرف چل پڑا۔

اسے پیچھے کی چیخ سنائی دی۔ اس نے گھوم کے دیکھا۔ پتہ پتہ اور گھٹنوں کے بل اس کی طرف بھاگا آ رہا تھا اور دروازہ جبارا لوٹا اور ایک لپک کر پیچھے کو اٹھایا۔ پتہ چپ ہو گیا اور ایک ڈھٹ سے اس کا ایک کان اور دوسرے ڈھٹ سے اس کی ناک پھٹلی جبارا کے سر سے وجود میں مسرت اور پیار کی لہر دوڑ گئی۔

اتنے میں ٹیپو گھر سے میں آیا۔ بولا۔ ”اُستاد! وقت ہو رہا ہے۔“ اور چلنا ہے۔

جبارا کو یاد آ گیا کہ انیس ایک خاص پروگرام پر جانا تھا جس کی موجودگی لازمی تھی لیکن پتہ اس کی گود میں بیٹھا تھا اور وہ پتہ سے پیچھے کو چلے پلا رہا تھا۔ ٹیپو نے جب اسے کہا کہ وقت ہو رہا ہے تو جبارا کو صدمہ سا ہوا جیسے اسے جین جواب سے جگا دیا گیا ہو۔

”مجھے ضرور ملے چلو گے؟“ جبارا نے ایسی آواز میں کہا جس میں بے بسی اور مایوسی تھی۔ ”تم ہی چلے

برسر اقتدار پارٹی نے جبارا کے گروہ سے حزب اختلاف کا اپنا بڑا جلسہ تباہ کرا کے سیاسی میدان میں بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی جس سابق سفیر نے جبارا کے ذریعے یہ کامیابی حاصل کی تھی اسے صد ہمت کے لئے ایک وزارت بطور انعام دے دی اور جبارا کو انعام کے طور پر دن دہائے تالے توڑنے، راتوں کو ٹوٹ مار اور جوجی میں اسے کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ پولیس برسر اقتدار پارٹی کے حکم کی پابندی تھی۔ صرف کراچی میں نہیں سارے ملک میں جرائم کی ایسی بھر مار ہو گئی جیسے ملک سے قانون اٹھ گیا ہو۔

جی کے گھر لگتے تھے اور جی کی جیسے کتنی جتنیں وہ تھا توں کوڈڑے جاتے اور سر جھکاتے ہوئے واپس آ جاتے تھے۔ تھانیداران کی روٹیں درج کرنے کی بجائے ان سے ایسی جرح کرتے تھے جیسے ان لوگوں نے خود ہی اپنے گھر میں جوری کی ہو کر کوئی رپورٹ درج نہیں ہوئی تھی، کوئی پرچہ چاک نہیں ہوتا تھا۔ راہ جاتے لوگوں کے قتل تک کے کس گول ہو جاتے تھے۔

حزب اختلاف کے جلسے کی ناکامی اس وجہ سے بہت بڑی شکست تھی کہ کارپوریشن کے انتخابات ہوئے والے تھے۔ کما تو رہا تھا کہ کارپوریشن کے انتخابات غیر سیاسی ہوں گے اور سیاسی پارٹیوں کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو گا لیکن میرے کر سیاسی پارٹیوں کا ہی تھا۔ عام انتخابات کا تو کوئی ذخیرہ نہیں کرتا تھا، نہ صدر مملکت عام انتخابات کے حق میں تھا۔ چنانچہ پارٹیاں بلدیاتی انتخابات کے ذریعے عنان حکومت نبھانے کے تین حربے کر رہی تھیں۔

جبارا کے گروہ نے حزب اختلاف کا جلسہ درج کر کے کیا تو حزب اختلاف کی سب سے بڑی پارٹی کے لیڈر صرف کراچی کے نہیں بلکہ پاکستان بھر کے نامی گرامی غنڈے میدان میں لانے کی خوشش کر رہی تھی۔ ملک کی سیاست جو دراصل اقتدار کی جنگ تھی بڑی تیزی سے رنگ بدل رہی تھی اور وزیر قلم کے فیصلوں کے تحت میں داخل ہو رہی تھی۔ میدان میں براؤچا ہتھیار استعمال ہو رہا تھا۔ پہلے تو جلسوں میں لغو باز کو اسے پر پولٹے جاتے تھے اب حاضرین بھی معاوضے پر آنے لگے۔ یہ درگاہوں اور آوارہ گروہوں کو دروغ معاش بل گیا اور شیریں دل کے دارے نیارے ہو گئے۔

چند میمنوں بعد کارپوریشن کا ایکشن لڑا گیا جو صحیح معنوں میں لڑا گیا۔ پولنگ ٹیشنوں پر ان کی کامیابی بالآخر ان کے پاس لپٹول اور چاقو تھے۔ پر جبارا روپوں سے بھی اور دھمکیوں سے بھی لی گئیں اور بیشتر ووٹر گھروں میں دیکھے بیٹھے رہے لیکن ان کی پر جبارا بکسوں میں پہنچ گئیں۔ کراچی کے حوالہ اس سمرزم پر بہت پٹاٹے لیکن پتہ پتہ رہے۔ وقت عام کی منادوں اور آوازوں کو کچھ تیزی سے گزرتا چلا گیا شہر میں جرائم اور زیادہ بڑھ گئے۔ بلدیاتی انتخابات میں جبارا کامیاب ہوئے تھے وہ جبارا میں اضافے کے ذریعے پیدا کر رہے تھے جرائم کا انسداد ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ لڑائی مار لگائی اور غنڈہ گردی کے ذریعے کامیاب ہوئے تھے۔ اب کارپوریشن کے اجلاسوں میں بھی غنڈہ گردی جاری رکھے ہوئے تھے۔

چھ مہینے گزر گئے۔

جیدہ کا دل تو بھگا دوڑیں کھڑ جاتا تھا لیکن شام نہ ہوتے ہی وہ ایسی بے کلی محسوس کرنے لگتا تھا جس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ایک شام وہ تھکا ماندہ بوڑھے موسیقار کے ہاں چلا گیا سر دہریں نغمے سنے اور وہیں لیٹ گیا۔ کچھ کھلی آوازیں سونے والی تھیں۔ وہ یوں ٹپ کے اٹھ بیٹھا جیسے کسی بار سے بھولے جھٹکے یا غم غشی کی کیفیت میں کوئی غماہ سرزد ہو گیا ہو۔ وہ بوڑھے سے بات کیے بغیر باہر نکل گیا اور اپنے زمین دور گراں میں بیٹھا۔

دن گزر گیا اور شام کو اس نے وہی بے قراری محسوس کی جو کل کی تھی جس پر تین سگریٹ پی ڈالے مگر بے قراری بڑھتی ہی گئی۔ ایک اڑے پر جا کے دوبارہ تلاش کھیلی، آدھی بوتل دسکری پی کر مڑی کیفیت پر زور بھرا نہ بھرا۔

رات کا دوسرا سہر تھا جیدہ اڑے سے نکلا۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ رات بھر سو نہ سکے گا۔ وہ بالی کے ہاں رات گزارنے کی خاطر نیپروڈ کی طرف چل پڑا۔ چند ہی قدم چلا تھا کہ اس کے قریب ایک سیڑھی اڑکی

”اُستاد! ٹیکسی سے آواز آئی۔“ کچھ ٹانگیں گھسیٹ رہے ہو، بیچا دوں“

”اُکون پہنچتی؟“ جیدہ نے جھک کر ڈرائیور کو دیکھا اور بولا۔ ”اوہ تم ہو... چلو بھتی“

ٹیکسی چلتی رہی۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ بائیں کنارہ اور نیپروڈ بالی کے پاس جانے کی بجائے اپنے گھر پہنچ گیا۔ اندھیرے میں ہی پلنگ پر بیٹھا، لیٹ بھی گیا لیکن دل اور زیادہ بے چین ہو گیا۔ ڈرائیور کو ٹیس بدلیں آخر اٹھ کے لالین چلائی۔ دیکھا نازا دیکھ سوتے ہوئے تھے جیدہ کے رگ و ریشے میں ٹھنڈا سکون سراتت کرنے لگا جیسے بھاری کوشش خوشگوار مکان بن گئی ہو۔ وہ دونوں کو کھٹکی باندھے دیکھا نہ۔

دو لمباں دیوار سے گھر صحن میں آگئیں اور مکان کا ماحول لمبوں کی لڑائی کی پُربل آوازوں سے لڑا تھا۔ جیدہ چونک کر باہر کو دوڑ پڑا جیسے لمباں بچے پر جھپٹنے کو آ رہی ہوں۔ لمباں گھر سے دو صحن میں لڑ رہی تھیں جو پہلے بھی یہاں آکے لڑا کرتی تھیں لیکن جیدہ نے آج پہلی بار محسوس کیا کہ لمبوں کی آواز کس قدر ڈراؤنی ہوتی ہے اور اس سے بچھوڑ جاتے ہوں گے۔

وہ صحن میں ان کی طرف دوڑا تو لمباں دیوار پر چڑھ کر اندھیرے میں گم ہو گئیں جیدہ گھر سے واپس آیا تو اُس پر تھا نہ کسی کیفیت طاری تھی جیسے کسی دشمن کو قتل کر آیا ہو۔ وہ مسرر تھا۔ اُس کی کوئی ایسی حس کوں پذیر ہو گئی تھی جس کی موجودگی کا اسے علم نہ تھا۔ اس نے لالین کی تہی مہم کر دی۔ لکشا اور لیتے ہی سو گیا۔ سورج بہت چڑھا تھا جب اُس کی آنکھ کھلی۔ دیکھا بچہ صحن میں کھیل رہا تھا۔ اُٹھو صبح سویرے سے اُس کے منظر تھے۔ ان کے منظر نے اطلاع دی تھی کہ گھر و شیش چالیس سزار روپیہ ایک کار میں جیدہ راباد جا رہا ہے۔ ان کا ارادہ تھا کہ جیدہ راباد سے چند میل اس طرف رہنری کی جائے۔

جیدہ کو دیکھ کر مٹنا باہر آیا اور اسے تمام تر تفصیلات بتائیں اور یہ بھی کہ انہیں فوراً روانہ ہو جانا چاہتے ہیں۔ کار نکل جانے لگی۔ جیدہ کے چہرے پر رونق آ گئی۔

”تم دونوں تیار ہو جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”میں چلوں گا“

مٹنا بھاگ کر اندر چلا گیا۔ جیدہ گھر کے طرف چلا تو پتے نے دیکھ لیا اور چوڑو کھتا اس کی طرف بھاگا۔ جیدہ نے اسے ڈال دیا جانا لیکن بچہ اُس کی ٹانگوں سے لپٹ چکا تھا جیدہ نے اسے گود میں نہ اٹھایا۔ بچے نے

جاؤ، بہنیں معلوم ہی ہے کیا فرما ہے“
ٹیپو کے ماتھے کے شکنجے گھر سے ہو گئے اور اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس نے جیدہ کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جس میں احتجاج بھی تھا، شکوک بھی۔ اس کی سحری ہوئی نگاہیں اور ماتھے کے شکنجے زبان غمش کی جڑ سے تھے۔ ”تم نے کبھی یوں تو نہیں کہا تھا استاد یا شاید وہ اپنے استاد سے کہنا چاہتا تھا کہ تم کبھی یوں بے بس اور مایوس تو نہیں ہوتے تھے۔“

ٹیپو کچھ لمحے بغیر گھر سے نکل گیا۔ ٹیپو کے تئیر بھانپ گئی۔
”چلے جاؤ نا۔“ ناز نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ابا تو چھوڑو اس دھندے کو اور شرفیوں کی زندگی بسر کرو۔“
ممکن نہیں تو دوستوں سے یوں تو نہ گناہو۔ وہ بلائے آیا اور تم نے ٹال دیا“
جیدہ نے ناز کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر حسرت سی متانت تھی۔ اُسے یوں لگا جیسے اس کا ہر فیصلہ نازی کیا کرتی ہے اور وہی اس کے لیے سوچا کرتی ہے۔ ایسے میں اُسے ناز کے حُسن میں تقدس کی سی جھمک نظر آتی اس نے بچے کو ٹپک پڑھایا۔ جاسے کی پیالی پی اور لیضرات کیے باہر نکل گیا۔

مٹنا اور ٹیپو ابھی دو نہیں گئے تھے جیدہ نے انہیں جالیا اور ٹیپو کے کندھے پر بھر پور چھوڑا کر بولا۔ ”کیلین پٹھے ہم نہ سو کر کے چلے آتے تھے انہیں تو ذرا مذاق کے موڈ میں تھا“
”استاد! ٹیپو نے غصیلی سی سنجیدگی سے کہا۔ ”اس چھوڑی کو چلتا کرو ورنہ گراچی میں پٹ جادگے۔ تمہارے ہاتھ تھمارے سر پر چڑھ گویں گے۔“

جیدہ نے کھل کر قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”تم پہل سوتیپو!“
اب کے وہ اپنے تقسیم پر نہ نکلا۔ یہ اس کی اپنی دنیا کا قہقہہ تھا جس میں ہر دم کا بھار تھا، گناہ کی لذت تھی اور جس میں انسانی جذبات کا وہ بھر پور حمل نہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے گھر سے اس کی وہ اپنی حسرتی پریشانی نکلتی تھی، وہ دوسری دنیا کی ملتی تھی۔ اس دنیا کی ہنسی جس میں اس کی روح تشنہ اور دل پیاسا ہوتا تھا۔
جیدہ کی سرگرمیوں میں سیاسی جراثیم روز بروز زبردست رہے تھے۔ اخلاقی جراثیم کی رفتار تو پہلے ہی بہت تیز تھی۔ اُس کا گروہ اور سر وہ گروہ جسے پشت پناہی حاصل تھی دن و رات کے ڈال رہا تھا۔ چلتی بسوں میں جیسے کٹ رہی تھیں۔ گروہ زباں بھی ہوتی تھیں اور عدالتوں میں مقدموں کے انبار لگتے جا رہے تھے جیدہ کو ابھی کوچ دینی ہوتی تھی۔ سیاسی اگھاڑے کی بھگا، ڈر الگ بھی عرفیت پارٹیوں کی بھی جاسوسی کرتی ہوتی تھی چنانچہ اُس نے رات کے پروگرام مٹے اور ٹیپو کے سر پر کڑ دیتے تھے۔

وہ دونوں بھی کم استاد نہیں تھے۔ بچپن کے جراثیم پیشے تھے۔ ٹیپو نے سولہ سترہ برس کی عمر میں حیدر آباد کے گروہ نواح میں ایک سال تنہا رہنری کی تھی اور مٹنے کو تو مہدی کے استادوں نے پالا پوسا تھا۔ جیدہ کو ان پر مکمل بھروسہ تھا۔

سیاسی اور اخلاقی جراثیم میں وقت اڑا جا رہا تھا۔ نئی سیاسی بائیاں جنم لے رہی تھیں۔ نئے محاذ قائم ہو رہے تھے۔ نئے حربے استعمال ہو رہے تھے۔ پانی شراب نئی بوتلوں میں پیش کی جا رہی تھی عوام کی آنکھوں میں نئی سنی دھول چھوٹی جا رہی تھی اور بلسوں، ہنگاموں، بیابانوں اور کراٹے کے نعروں کے غل غبار میں عوام کی سسکیاں اور فریادیں دہکے رہ گئیں۔

اس کی انگیختگی اور صحن کی طرف پھینکنے لگا۔ وہ اب جھوٹا ڈول تیل بھی لیتا تھا۔ جیڑا کو پیچھے نے صحن کے وسط میں ٹھالیا جہاں تین چمچ پڑے تھے۔ پیچھے کے پاس کھلونہ تو کوئی تھا نہیں۔ وہ باورچی خانے سے بیچ اٹھا لیا تھا اور ان سے مٹی کھود رہا تھا۔

پیچھے نے ایک بیچ جیڑا کے ہاتھ میں دے دیا اور بندہ کرنے لگا کہ پتہ بھی مٹی کھودے۔ جیڑا پیچھے کے ساتھ بچوں جیڑا تھا۔
”چلو استاد! ٹیپو کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

”جلدی اٹھو استاد!۔“ مٹنے لگا۔

جیڑا نے دونوں کو یوں دیکھا جیسے پھانسی کا قیدی آخری صبح اُن وارڈوں کو دیکھ رہا ہو جسے پھانسی کے تختے کی طرف لے جانے آئے ہوں۔

”ٹیپو!۔“ جیڑا نے کہا۔ ”میرا خیال ہے جانے دو؟“

”استاد!۔“ ٹیپو نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”کیا کہا؟۔“ جانے دو؟“

”اتنی دودھ جانا اچھا نہیں۔“ جیڑا بول رہا تھا لیکن زبان جیسے بھلا رہی تھی۔ اکھڑی اکھڑی سی آواز میں بولا۔
”ہوسکتا ہے کارواںوں کے پاس ایسٹول یا بندوق ہو۔۔۔ دیکھو نا اتنی دور۔۔۔“
لیکن وہ فقرہ پورا نہ کر سکا کیونکہ مٹا اور ٹیپو اُس کی بات ادھوری چھوڑ کر جا چکے تھے۔

مٹا اور ٹیپو تو اپنے کمرے میں چلے گئے لیکن جیڑا ان کے ردعمل کو نظر انداز نہ کر سکا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُسے اپنا سلوک اچھا نہ لگا۔ اُس نے شکار کی خبر پا کر بھی سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی بندوق اور پستول ایسے سامنے آجائے گا۔ وہ تو ہر لمحہ مارنے پر تیار رہتا تھا مگر آج اس نے ساتھیوں کو بندوق اور پستول سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔

جیڑا اپنے کمرے سے الفاظ پر ٹپٹا اٹھا۔ وہ اٹھا اور پیچھے کو یکسر نظر انداز کر کے کمرے میں چلا گیا اور لیٹ گیا۔ نازے جاسے لاسے کبھی اور اُس نے جانے کیا کیا لیکن جیڑا نے نہ چاہے کو دیکھا نہ ناز کو نہ اس کی بات۔ وہ فحش سوچ میں گویا ٹپٹا اٹھا اور اپنے آپ میں بڑی ہنفت اور جھینپ محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے کوشش کی کہ ایک ہی جھپٹا لگے اس فحش فحش کش سے نکل آئے اور اپنی دنیا میں جا پہنچے لیکن اس کی اپنی ہی ذات میں کوئی عظیم قوت جاگ اٹھی تھی جو اسے پاگل لالہ کرتے ہوئے تھی۔

جیڑا اُڑا رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں مارنے لگا لیکن خیال ابھرتے ہی گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی داخلی دنیا میں ہنگامہ مچا ہو گیا۔ وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا۔

ڈراسی دیر کمرے میں ٹپٹا، بے خیالی میں ٹھنڈی جاسے کی ایک پیالی پی اور میز پر چھایا۔ دراز کھولی اور ڈاڑھی نکال کر درق لٹے لگا اور برسوں پہلے لکھے ہوئے ایک صفحے پر رک گیا۔ ایک ایک لفظ سے خون ٹپک رہا تھا۔ سناہت خوفناک واردات کچھ دیکھ رہی تھی۔ جیڑا بڑھنے لگا اور برسوں پرانی وہ واردات اُس کے تصوروں میں ابھرتی جیڑا تصوروں کی دنیا میں دوڑنا لگا۔ اس کے جسم نے جھجھکی مٹی اور دلوں ایک کے اٹھ بیٹھا جیسے زنجیریں ٹوٹ گئی ہوں۔ ڈاڑھی کے ایک ہی درق نے پیار و محبت کی زنجیریں توڑ دیں اور وہ اپنی دنیا میں پھینک گیا۔

دوسرے لمحے وہ مٹے اور ٹیپو کے کمرے میں کھڑا تھا۔ نازا اپنے کمرے میں کھڑی رہی۔ کھوئی کھوئی سی! سنبھلتی۔ جیڑا نے کہا۔ ”میں نے حیدر آباد جانے سے متیں روکا تھا۔ تم نہ بد غلط سمجھ بیٹھے ہو۔“

آج بہت ضروری کام ہے۔۔۔ دونوں متوجہ ہوئے۔ جیڑا نے کہا۔ ”وہ جرنیل ایڈر ہے نا۔۔۔ کیا نام ہے اُس کا۔۔۔ آغا۔۔۔“ وہ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والا۔۔۔ آج اُس کا ستیاناس کر دو۔ تمام چوکوں سے کہ دو۔ آج ہی ایرانی بٹولوں میں جا بیٹھیں بس شاہوں پر جم کے کھڑے ہو جائیں مسجدوں میں پنہاں اور جگہ جگہ مومنوں کی صورت بنا کر جیڑا دس کھانے ایک لڑکی کو اپنی کوٹھی میں ملازمت دینے کے بہانے بے آبرو کیا ہے۔ لڑکی نے شور مچا دیا تو اگلے اُسے قتل کر دیا۔ بے اور لاش کا کچھ پتہ نہیں۔۔۔ باقی تم خانے ہی ہو کہ افواہ اس طرح پھیلائی جاتی ہے پیسے لیتے جاؤ۔ یہ چھ بڑا رکاسو ہے میں کل پارٹی سے پیسے وصول کر لوں گا۔

صرف مٹا اور ٹیپو ہی نہیں۔ ان کا سارا گروہ کسی کے خلاف جھوٹی خبریں گھڑ کر نفرت پھیلانے میں ماہر تھا۔ کراچی میں ایک نئی سیاسی پارٹی بنی تھی جس کا بانی اور لیڈر کوئی آغا تھا۔ نئے لیڈروں کو میدان سے ہٹانے کا بہترین ذریعہ یہ تھا کہ ان کے خلاف کوئی سائنڈل گھڑو اور اس کی تشریح کرو۔ دوسرا ذریعہ بلیک میلنگ کا تھا۔ یہ کام اچھی لکھی اور بڑی ہوشیار طلا آفوں سے کرایا جاتا تھا۔

تیسرا ذریعہ پولیس تھی۔ پولیس حکومت کی تھی اور حکومت جس پارٹی کی تھی وہ حزب اختلاف کے جس لیڈر کو چاہے کسی نہ کسی جرم میں گرفتار کر دیتی تھی پولیس اس کے خلاف مقدمہ تیار کر دیتی تھی اور جیڑا اور اس کے گروہ کے آدمی استغاثہ کے گواہ ہوتے تھے۔ عدالت میں جیڑا کسی زفاہی ادارے کا صدر اور اُس کے ہاتھ معزز اور مظلوم شہری ہوتے تھے۔

اب ایک لیڈر کو عوام کی نظروں میں گرانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو جیڑا کی خدمات حاصل کی گئیں جیڑا نے مٹے اور ٹیپو کو ہدایات جاری کر دیں۔ وہ دونوں جا بھی ابھی ابھی اپنے استاد سے باہر ہو گئے تھے اس ہم پروانہ ہو گئے۔ انیس خوشی اس پر ہوئی کہ ان کا استاد اپنی دنیا میں واپس آ گیا تھا۔ جیڑا ناز کے کمرے میں نہ گیا۔ وہ پیچھے کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے پیچھے کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ لمبے لمبے دُک بھرتا باہر نکل گیا جیسے پیچھے سے بھاگ نکلا ہو۔

میرزا فیرٹا درتے بسوں کی قطار کھڑی مسافروں کے جھوم ٹھنگ رہی تھی اور ایک طرف پندرہ بیس آدمی کسی کو زینے میں لیے کھڑے تھے۔ جیڑا نے آگے بڑھ کے دیکھا مٹا جہرے پر غرور، پارسی اور مظلومیت کے تاثرات پیدا کیے لوگوں کو ایک سیاسی لیڈر کے خلاف سائنڈل بنا رہا تھا جیڑا نے دیکھا کہ سننے والوں کا مجمع بڑھتا جا رہا تھا اور ان کے چہروں پر غم و غصے کے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے۔ مٹا اس لیڈر اور اُس کی یاری کے خلاف جو نفرت پھیلا رہا تھا وہ سننے والوں کے دلوں میں گڑھا نکھول میں ظاہر ہونے لگی تھی۔ مٹے نے جبکہ نہایت موزوں ٹھنڈی تھی۔ ٹاڈا وہ مقام ہے جہاں کراچی کی تمام لیس آ رہی ہیں اور کراچی کے کوئلوں کھدروں کے مسافر یہاں سے بسوں میں سوار ہوتے ہیں۔ آج ان بسوں کے مسافر غلے والوں کوٹنے کے لیے انتہائی سنسنی خیز اور در دہکری خبر ساتھ لیے جا رہے تھے۔ ٹاڈا سے جوں نکلتی تھی غم غم اور اس سیاسی لیڈر کے خلاف نفرت و حقارت کے شعلے لے کے نکلتی تھی۔

جیدانور سے پیدل ہی چل پڑا اور اڑم پٹے کے شاپ پر پہنچ گیا۔ وہاں اس کے گروہ کا ایک آدمی اُسے سے بھی زیادہ دندانک لہجے میں ہی سکینڈل ایک محفل میں بیٹھا سنا رہا تھا اور شاپ پر کھڑے مسافر نفرت سے دانت پیس رہے تھے۔

جیدانور لفتیات نہیں تھا۔ وہ تو خود نفسیاتی مریض تھا لیکن وہ اپنے ملک کے لوگوں کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ لوگ فریب خوردہ ہیں اور فریب پر فریب کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی کشتی کے مسافر ہیں جس کے ملاح کشتی میں سوار کر رہے ہیں۔ ہر ملاح دوسروں سے مختلف سمت کو چھوڑتا رہتا ہے اور کشتی ڈول رہی ہے۔

جیدانور جانتا تھا کہ مسکنانی، بے انصافی، رشوت خوری اور جرائم پیشہ لوگوں کی دہشت کے مارے ہوئے لوگ ایسی افواہوں کو فوراً مان لیتے ہیں جو کسی لیڈر کو رسوا کرنے کے لیے پھیلائی جاتی ہیں۔ ان افواہوں میں عوام کی تسکین کا سامان ہے اور وہ ان افواہوں کو اور زیادہ دل پسند بنا کر آگے پھیلاتے ہیں۔

جیدانور غامان صدر تک پہنچ گیا اور رینگل کے شاپ پر جا رہا۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ ایک آدمی نے اسے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ”بھائی صاحب! اس آپ نے بھی؟“

”کیا؟“
اس آدمی نے جیدانور کو ہی سکینڈل سنا دیا جس کا خالق جیدانور ہی تھا۔
”اے اس ملک کا حشر کیا ہوگا بھائی صاحب!۔۔۔ اس آدمی نے احتجاج سے بھرپور آواز میں کہا۔
”خدا کا تھرنازل نہ ہوگا اس ملک پر؟“ الشربیزہ غرقِ بحر ہے اس لیڈر کا بھائی صاحب! غریبوں کی بہو بیٹوں کی عزت بھی محفوظ نہیں اس ملک میں!“

جیدانور سکینڈل میں رنگ آمیزی شروع کی تو اس آدمی کے آنسو نکل آئے اور تھوڑی دیر بعد جیدانور کے گرد ایک جرم جمع ہو گیا جو دیکھتے ہی دیکھتے احتجاج اور غم و غصے کا مندر بن گیا۔ جیدانور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اس مندر میں طوفان برپا کر رہے تھے اور اُس کے چہرے پر وہی رونق آ رہی تھی اور گول میں وہی لذت سرایت کر رہی تھی جو وہ ڈاکو ڈالتے، جیب کاٹتے یا ٹالوڑتے محسوس کیا کرتا تھا۔
وہ پہرے لے رہا تھا غم و غصے کے بحر جتنے بادل کراچی کے کوئے کوئے میں گھل آتے۔

جیدانور بی بازار سے گزر رہا تھا۔ اُس نے ایک ریڑھے کے گروہ کو آدھی کھڑے دیکھے جن میں سے ایک نے ریڑھے والے سے کچھ خریدنا تو لوگوں کا بندل بٹلون کی جیب سے نکال کر دس کا ایک نوٹ ریڑھے والے کو دیا اور باقی نوٹ جیب میں ڈال لیے۔

جیدانور کو دیکھ کر اُسے بٹلون جیسی آسان ترین جیب میں دس کے اتنے نوٹ جیدانور کو اپنی طرف کیوں نہ کھینچے؟ جب وہ اس آدمی کے عقب میں ساتھ لاک کے کھڑا ہوا تو اُس نے دیکھا کہ ریڑھے پر طرح طرح کے ٹھولے سجے ہوئے تھے اور وہ آدمی ٹھولے غریب رہا تھا۔

جیدانور نے ہاتھ اُس کی جیب کی طرف بڑھایا تو اس آدمی نے ایک جھنجھٹا اٹھا کے سجایا اور ریڑھے والے سے کہا: ”یہ بھی دے دو۔“

جھنجھٹے کا محسوس سا چھنا کا جیدانور کے ذہن میں بجلی کی طرح لگا ادا اس کے ساتھ ذہن میں ایسی جھک جیسے

اُس کی آنکھیں خیرہ ہو گئی ہوں۔ اُس نے شکار کی طرف بڑھایا مگر اٹھ ریڑھے کی طرف بڑھا کر ایک جھنجھٹا اٹھا اور بولا: ”ایک مجھ دے دو اور وہ چابی والی موٹر بھی۔“

جب اس کا شکار وہاں سے چلنے لگا تو جیدانور نے اسے روک کر کہا: ”مسٹر! جس جیب میں آپ نے نوٹ رکھے ہوئے ہیں وہاں سے کبھی بھی وقت اڑ جائے گا۔ ذرا سنبھال کے رکھو یہ کراچی ہے۔“

اس آدمی نے چونک کر نوٹ بٹلون کی جیب سے نکال کر نوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیے اور چلا گیا۔ جیدانور کے ہاتھ میں جھنجھٹا تھا۔ اُس نے اسے بلایا تو اس کے چھنا کے نے اُسے دو کہیں ہاتھی میں پھینک دیا۔ اس نے آنکھیں یوں سکیا لیں جیسے شام کے چند لمحوں میں دو کس چکر دو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُسے یاد آئے لگا کہ ایسی آواز اُس نے برسوں پہلے بھی کہیں نہ سنی تھی اور جھنجھٹا اس کے اپنے ہاتھوں نے سجایا تھا۔ شاید کوئی اس کے لیے جھنجھٹا لایا تھا۔

وہ جھنجھٹا اٹھا اور چل ڈاکو اسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی چال میں تبدیلی سی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ تو جیسے اپنی چال ڈھال ہی بھول چلا تھا۔

جیدانور آٹا تو ناز پکھے کو دو دھ پلا رہی تھی۔ جیدانور نے جھنجھٹا اور سونار کی طرف بڑھائی تو وہ خود ہی جیسے جھک اٹھا۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ سا اُنے لگا اور وہ پٹشٹا اٹھا۔ کچھ اس لیے کہ وہ جن زنجیروں سے بھانگا چاہتا تھا انہیں اپنے ہاتھوں اپنے گروہ پٹشٹا جا رہا تھا اور زیادہ تر اس لیے کہ وہ جذبات کے کھیلوں میں کچھ کرنا چاہتا تھا شکار کا تھ سے نکال آتا تھا۔

اُس نے ٹھولے ناز کی طرف پھینک دیئے۔ ناز کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ پھیل گئی جو جیدانور نے اس کے ہونٹوں پر پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

ناز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی اس قسم کی مسکراہٹ تھی جیدانور نے اپنے آپ میں لطیف سا رزق محسوس کیا۔ وہ ان نظروں کا سامنا نہ کر سکا اور اپنے گھر سے میں چلا گیا۔

جیدانور سی پٹشٹا، ہانگیں میز پر رکھیں اور پٹشٹا پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا جیسے دماغ میں کوئی جھونکا سا خیال

لگا گیا ہو جس کی جھپٹ سے دل اٹھا جا رہا ہو۔

ناز کا اس مکان میں آئے سال بھر سے زیادہ عرصہ بیت چلا تھا۔ اس عرصے میں جیدانور نے ناز سے بے تکلف ہونے کی کھل کر بات کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ اُس نے جیسے تم کھار کھی تھی مگر حسین اور دل کش ہی سی وہ ناز کے جسم کو چھوئے گا بھی نہیں۔ وہ ناز کو ذرا براہِ امتیاز نہیں دینا چاہتا تھا لیکن ناز جب اُسے نظر بھر کر یا شہ سنی نگاہوں سے دیکھتی تھی تو جیدانور کی نگاہوں کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگتا تھا اور وہ شدت سے محسوس کرنے لگتا تھا کہ اس گھر میں یا اس کی اپنی زندگی میں ناز کی کچھ کچھ اہمیت ضرور ہے جس سے وہ انکار نہیں کر سکتا۔

ناز اس قید اور تنہائی کا جزو بن چکی تھی۔ وہ جرم و گناہ کی اس زمیں دوز دنیا کا حسین اور پراسرار ذریعہ بن گئی تھی۔ اُس کے دل میں ایک خشنہ گھر لگتا تھا کہ وہ جب بھی اس قید سے نکلی تو اس کی ذات ہی فنا ہو جائے گی اور اس کی انفرادیت ہی تم ہو جائے گی۔ یہ ایک گھر بن رہا تھا اور لا شعوری فرار۔ وہ دنیا کی گناہی میں لوٹ جانے سے گھبراتی تھی۔ وہ غلامِ گھر اور جرم زیادہ تھی۔ گناہ گار و پناہ ملی تو گناہوں کی بستی میں ملی اور اس نے اس بستی سے سمجھو تو کر لیا۔

اُسے صرف ایک دکھ تھا کہ جیلا اس کے ساتھ کھل کر بات نہیں کرتا تھا نہ اُس کے پاس بیٹھتا تھا۔ دل بدلنے کو اس کے پاس سنا بھی تھی اور بچہ بھی لیکن ستار اُس نے جیلا کی خاطر کچھ بھی تھی اور بچہ کو بھی اسی کی خاطر کوئی لیا تھا۔ اس کے باوجود جیلا اس سے دور رہتا تھا۔

مذہب دنیا کے تمدن نے اسے جو جھٹکے دیئے تھے اور آخر میں اسلام نے اسے جس طرح اسمان سے ٹپکا تھا اس کے سبب بل نکل گئے تھے اور وہ جیلا کے قدموں میں گر پڑی تھی۔ اس نے جیلا سے اسلام کے متعلق کچھ بات نہیں کی تھی نہ جیلا نے کبھی اس کا نام لیا تھا۔ ناز کو کھول ہی جانا چاہتی تھی، لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ چھ مہینے ہوئے اسلام اس دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ اسلام خود کشتی کو چکا تھا۔

جیلا کے ایک میلروں نے نین بار اسلام کو بلیک میل کیا تھا اور ناز کا اغوا بھوت کی طرح اس کے دل و مانع پر سوار ہو گیا تھا۔ اُس نے جانے کیسے کیسے جتنوں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ جیلا کے ایک میلروں کو دیا اور ان کے قدموں میں سر رکھ کے رویا تھا کہ ناز کو عدالت میں پیش نہ ہونے دیں۔ آخری بار وہ چند دنوں کے لیے کلرچی کا تھا جیلا کے آدمیوں نے اُسے دیکھ لیا اور رات کے وقت اس کے دل جا دھکے تھے۔ وہ ایک فلیٹ کی تیسری منزل میں ٹھہرا اٹھا تھا جیلا کے آدمیوں نے اسے کہا کہ ہم ناز کو کورٹ میں پیش کرنے والے ہیں اور وہ بیان دے گی کہ مجھے اسلام نے زبردستی اغوا کیا اور بیچ ڈالا تھا اور ہم کو اسے خلاف فطرت شہادت اور ثبوت پیش کریں گے۔

اسلم ہندیہ یا فتح جہانم پیشہ تھا۔ اُسے زمیں دوز دنیا کے بایسول سے کبھی پالائیں پڑا تھا۔ البتہ اس حقیقت سے خوب واقف تھا کہ جیلا جیسے استاد تھانیداروں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اور وہ پولیس کو اپنے دھبہ پر چلا جاتے ہیں۔

اسلم نے یہ دھمکی نئی تو کھڑی کھولی اور سر کے بل تیسری منزل سے کود گیا۔ جیلا کے آدمی بھاگ آئے اور قتل میں پڑے جاتے۔

آج جیلا نے پڑائیں پھیلانے سے سوچ رہا تھا کہ وہ کیسی منحوس گھڑی تھی جب اس نے ناز کو اسلام سے خریدا تھا۔ آخر یہی لیا تھا تو اس کے چلا دیتا۔

اُس کے چلانے کا خیال آتا تو اس کی سوچ کا رخ بدلنے لگا۔ اُس نے سوچا ناز کو تو اب بھی چلایا جاسکتا ہے۔ فٹ کلاس چیز ہے تین سال سے تین ہزار کا کاپک آسانی سے مل سکتا ہے۔ اُس نے سر کو جھٹک کر فیصلہ کر لیا کہ ناز کو بیچ دے گا۔ اس فیصلے سے اس کی ذہنی خلفشار یکساں کی گئی تھی جیسے وہ بچپن میں ٹوٹ گئی ہوں جن میں وہ گرفتار تھا۔ دل پر جو بوجھ آڑا تھا اتر گیا اور وہ اپنے اصلی روپ میں آگیا۔ ڈاکو، بدوہ فروش، جیلا حبیب کو! اور دوسرے کمرے سے جھنجھنے کے چھنا کے اور بچے کے قہقہے سنائی دینے لگے۔ معصوم سی یادیں جیلا کے دماغ میں جھٹکوں کی طرح پڑنے لگیں جیسے اُس کا اپنا ضمیر اسے جھٹکوں سے پیٹ رہا ہو جیلا دیک کے طبع گیا اور اس کی جتنی بھی ابھی جو بدوہ فروش جاگ اٹھا تھا اُس کی سستی کے دیرانے میں ہی کہیں چھپ گیا۔

”دو چار لوگوں کو بچوڑا اٹھا ہے اس کے پاس لگیا۔ پیچھے پیچھے ناز تھی بچے نے موٹر جیلا کے ہاتھ میں دے دی جیلا نے بے خیالی ہی میں موٹر کو جانی دے کر فرش پر چھوڑ دیا اور کمرہ موٹر کی آواز اور نیچے کی تالیوں اور قدموں

سے گونجنے لگا۔ جیلا عرصی سے اٹھا اور فرش پر بیٹھ گیا اور بچے کے معصوم قدموں میں تحلیل ہو گیا۔ اس نے بیتاب ہو کر بچے کو گودی اٹھالیا اور اُس سے اس قدر زور سے بھینچا کہ بچہ بے اختیار زہنیں پڑا اور گال جیلا کے گال سے لگا لیے۔

ناز گنگ پڑی دو دنوں کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے بچے کی رگوں میں اس کا اپنا اور جیلا کا خون ہو۔ اس نے پیار بھرے لہجے میں کہہ دیا۔ ”بچے کو باپ کے ساتھ لے کر پارہوتا ہے!“ جیلا اس طرح چونک اٹھا جیسے اُسے کانٹا چھو دیا گیا ہو۔ وہ اپنے آپ میں آگیا اور بچے کو ناز کے حوالے کر کے باہر چلا گیا۔

اُس کا سر اپنا کانپ رہا تھا۔ اُس نے ٹپو اور منے کے کمرے میں جا کر چرس کے کئی بے بے کش لیے لیکن بے قراری جیسے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ناز بچے کے ساتھ باہر صحن میں چلی گئی تھی۔ جیلا تنہا ہی محسوس کرنے لگا۔ اس نے کسی اڈے پر چلے جانے کا بھی ارادہ کیا۔ پھر ہی، گنگار اور بالی باری باری اس کے ذہن میں آئیں اور گزر گئیں۔ وہ کمرے میں واپس آگیا۔ وہ اس گھر بیٹھے ذرا سی ڈیڑھ کے لیے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن فیصلہ نہ کر سکا کہ کہاں جائے۔ وہ جھنجھلا اٹھا اور اس کے منہ سے نکل گیا۔ ناز۔ ناز اتنی تو وہ جیسے بولکھا گیا ہو۔

”کہو کیا بات ہے؟“

”ویسے ہی ملا لیا تھا۔“ جیلا نے اُٹھ کر بے لہجے میں کہا ”ایسی کوئی بات تو نہیں تھی۔“ ناز نے اُس کی پٹٹی پیچھے کھڑے ہو کے ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیئے۔

جیلا عرصی پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ ناز کو ملا تو لیا ہے، اب بات کیا کی جائے۔ ناز ہاتھ سرکار اس کے سینے تک لے گئی اور جھک کر اپنا گال جیلا کے گال کے ساتھ لگا دیا۔

جیلا نے سر گھمایا تو وہ دنوں کی سانسیں ٹھکانے لگیں۔ جیلا نے پیچھے ہٹنے کی کوشش نہ کی اور اُس نے اپنے آپ کو ناز کے سرور کے سپرد کر دیا۔ اُسے یوں قرار آئے لگا جیسے ناز کے جسم کا اُس کی سیکی اور بے پنی چوس رہا ہو۔ ناز کی گرفت تنگ تر ہوئی چلی گئی اور جیلا پر بے خودی طاری ہونے لگی۔

”چرس کی بو سے متنی آئے لگتی ہے۔“ ناز نے کہا۔

جیلا سیدر ہو گیا۔ وہ ایک ہی جھٹکے سے ناز کی گرفت سے نکل کر عرصی سے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔ ناز کو کھٹک جھٹک جھٹک کسی طوائف کے پاس چلا گیا ہے۔ اس نے آہ لی اور بڑے تلخ خیالوں میں کھونگی۔ جیلا کس کا ہے؟... یہ تو کس کا ہے؟... جیلا سزا بگناہ پچھرا لیسے ہی گناہ گار باپ اور ایک پن بیانی ظلم ماں کا بیٹا... میں کیوں ان میں کھونگی ہوں؟ یہ خیال یہ سوال اسے پریشان کرنے لگے۔ اس نے خیالوں میں اپنے آپ کو جیلا سے اور بچے سے لائق کو لیا سگرا اُس پر بھول سا طاری ہونے لگا۔ الگ تھا گلس کی کوئی ذات نہیں تھی۔ اُسے ساتھ کی اور محبت کی ضرورت تھی۔ وہ عورت تھی۔ اُسے مال نہ تھا۔ وہ خیالوں میں جھٹکے لگی اور اُس نے غیر ارادی طور پر بچے کو اٹھا کر سینے سے لگالیا اور اس کی کھچوں میں اُس کو آگے۔

جیلا ناز کی دنیا سے بھاگ کر فٹ پاچہ پر تیز قدم چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں درد کی ٹپس محسوس کر رہا تھا جیسے ناز نے اُسے دس لیا ہو۔ اس درد میں ایک گونہ لذت بھی تھی جس سے وہ زندگی میں پہلی بار روشناس

دو سال بڑا چچا کے ساتھ طے پاماتھا کہ ہمارے مکان کا کرایہ وصول کر لیا کرے اور اس میں سے میرے تمام اخراجات ادا ہوتے ہیں۔ کرایہ تیس روپے تھا۔ اُس دور تیس روپے آج کے تین سو کے برابر تھے۔۔۔۔۔
 ”میں چچا کے بچوں کے ساتھ سکول جانے لگا۔ چچی ہر صبح اپنے بچوں کو دو روپے دیاجاتی تھی لیکن مجھے کچھ نہ دی جاتی تھی۔ بچوں کے ہر بدیتی تھی کہ کچھ لوگے تھوڑا سا اسے بھی دے دینا اور جس انداز سے وہ یہ فقرہ کہہ کر جاتی تھی، وہ مجھے کانٹے کی طرح چبھاتا تھا۔ اور یہ کانٹا میری ذات میں اتنا جا لگا جس کی خلش مجھے آج بھی تڑپا رہی ہے۔ ایسے میں مجھے مال باب یاد آتے رہے اور میں کئی بار مال کی قبر پر جا کے رو بچا چا زاد بھائی مجھے اپنا نہیں سمجھتے تھے۔ میں ان کے ساتھ رہ کے اپنے آپ کو تنہا سمجھتا تھا۔ اس گھر کے پیار میں میرا کوئی حصہ نہ تھا۔۔۔۔۔

”الفرنج کے وقت دو دو پیسے کے بسکٹ لے کے کھاتے تھے۔ شرف شرف میں وہ آدھا آدھا بسکٹ مجھے دیتے تھے مگر جب یہی روز بعد ان کا یہ رویہ بدل گیا۔ وہ کھاتے رہتے میں کھڑا ان کا منہ دیکھتا رہتا۔ ان سے مانگ کے کھالے پر میری طبیعت آمادہ نہ ہوتی تھی۔ میں مال باب کا کھانا بچھتا۔ اپنی دنیا کا شہزادہ میں نے گھر میں من مانیال کی تھیں۔ اب بھکاریوں کی طرح کھڑا بسکٹ کے ذرا سے ٹکڑے کو ترس رہا تھا۔۔۔۔۔

”چچا اور چچی کا رویہ بدتر تھا۔ وہ مجھ سے اس قدر بیگانہ تھے کہ میں ان سے بھی کچھ مانگنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ ہمارے مکان کے کرائے ہی سے مجھے دو پیسے دے دیا کرو۔ فقرے کے وقت بھوک لگتی تھی۔ آخر میں بھکاری بن ہی گیا اور چچا زاد بھائیوں سے بھیک مانگنے لگا۔ جیڈا نے بے چین ہو کر کہا۔ ”لیکن بابا! میں بھکاری رہ نہ سکا میں کوئی دو پیسے ان بچوں سے بھیک مانگتا رہا بابا! ایسا کیا کہ لوٹ کے نہ آیا اور چچا چارے مکان کا کرایہ وصول کرتا رہا۔۔۔۔۔

”پھر چچا زاد بھائیوں نے مجھے بسکٹ کی جگہ دھکے دیے۔ ایک روز انہوں نے مجھے مارا بھی۔ گھر میں میری پولیٹیشن نوکر کی سرگئی تھی میرے چھوٹے سے سینے میں بھلکان کو نہ لگیں۔ میں مجبور ہو گیا تھا۔ بڑے میال! تنہا میری چھوٹی سی کائنات پر گھنٹاؤں کی طرح چھانے لگیں۔ میں جل اٹھا۔ بچہ ہی تو تھا میں! ”ایک روز وہ دونوں لالچ کے وقت بسکٹ کھا رہے تھے۔ میں ان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور انہیں لٹکا کر انھیں بسکٹ دیتے ہوئے نہیں!۔ بڑے نے کہا۔ ”میرے باپ کے میں بسکٹ کھاؤں گا؟“ دیتے!۔ میں تو تیار ہو کر گیا تھا۔ میں نے جھپٹا مار کر اُس کے ہاتھ سے بسکٹ چھین لینے اور زمین پر پھینک کر پاؤں تلے سل ڈالے۔ پھر دوسرے سے بھی چھین لیے۔ دونوں میری طرف بڑے تو میں نے جیسے چھوٹا سا چاقو نکال لیا جو میں نے ایک جم جماعت سے اسی مقصد کے لیے مانگا تھا۔۔۔۔۔

”چاقو دیکھ کے دونوں رگ گتے میں نے پھر لٹکا مارا۔ آؤ سمیت بنے تو آگے گر پڑو۔ دیکھتا ہوں میرے سامنے میٹھ کر اس طرح کھاتے ہو۔ اس کانٹہ جیڑی ہر سے بابا! گھر آیا تو چچی نے مجھے مارا مار کر آدھا کر دیا شام کو چچا آیا تو باقی کسر اُس نے پوری کر دی۔۔۔۔۔

”پھر یہ روزمرہ کا معمول بن گیا کہ میں چچا زاد بھائیوں سے بسکٹ یا پیسے چھین کر کھینک دیتا تھا اور انہیں خوب پٹیا کرتا تھا اور گھر آکر ان کے مال باب سے مار کھاتا تھا۔ ان کے سامنے تو میرا نہیں جلتا تھا۔ میں

بڑا تھا۔ سینے میں ایسا غبار تھا۔ رہا تھا جو پہلے کبھی نہیں اٹھا تھا۔ یہ غبار زہر بنتا جا رہا تھا۔ جیڈا اور تیز چلنے لگا۔ وہ بار بار سر کو جھٹکاتا جیسے ناز کا گان اچھی ناک اُس کے گال کے ساتھ لگا ہوا۔

پُر لطف اور تلخ خیال کے ریلے میں رہتا ہوا وہ بڑے موسیقار کے ہاں جا پہنچا اور چند لمحوں بعد وہ سار کے ہجروں میں بے خود ہوا تھا۔

”کچھ دیر بعد بڑے نے سارا تار دی گرجا ابھی تک بے خود ہی بیٹھا تھا۔

”تم کئی بار یہاں آتے۔ بڑے نے کہا۔ ”مگر ہر بار ایک آدھ الاپ سن کر چلے گئے۔“
 ”اسی لیے تو میں آتا ہوں۔“

”سوا آؤ لیکن میں ہر بار سے آنے اور جانے کے انداز میں ابھی تک بیگانگی سی دیکھ رہا ہوں۔“
 بڑے نے کہا۔ ”کئی بار خال آباتم سے دو باتیں کروں، کچھ پوچھوں، کچھ سنوں مگر تم تو جیسے مجھ سے اپنا آپ چھپاتے ہی رکھنا چاہتے ہو۔“

”ایسا تو میں بابا۔۔۔۔۔ جیڈا نے کہا۔ ”تم پہلے انسان ہو جس نے میری ذات میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔۔۔۔۔ میری ہی تو تم کو گھٹے بابا! میں نے کبھی نہیں جانا کوئی اس میں جھانکے۔“ اُس نے آہ لی اور کہا۔ ”لیکن تمہارے پاس آرمیں نے ہر بار چاہا ہے کہ تم مجھ سے پوچھو کہ میں کون ہوں اور میں تمہیں تیس برس پہلے کی ہوئی داستان سنا دوں۔ معلوم نہیں میں نے ایسا کیوں چاہا؟ شاید اس لیے کہ تم پہلے انسان ہو جس نے مجھے دیکھا ہے اور میں نے تمہاری سکرانٹ میں باپ کو مسکراتے دیکھا ہے۔“ جیڈا نے چپ ہو کر سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں بول بے چین ہو گئیں جیسے گزرتے ہوئے وقت کی ریت لمحات کو کچن ہی ہوں۔
 ”کہو بیٹا!۔ بابا نے پیار سے کہا۔“ اپنے بابا کو سب کچھ سنا دو بعض دیکھ کر لینے سے ہی کم ہو جاتے ہیں۔“

”تیس برسوں کی کہانی سنانے کے لیے تیس برس ہی چاہئیں بڑے میال!۔ جیڈا نے کہا۔ ”مختصر کر کے سنا دیتا ہوں۔“ اس نے طویل آہ لی اور بولا۔ ”میرے روگ کا آغاز ایک جاں کا منظر سے ہوتا ہے۔ اُس وقت میری عمر سات برس تھی میری ماں بستر پر گر پڑی تھی۔ میں اُس کے پاس بیٹھا تھا۔ میرا باپ اُس پر چھکا اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ ماں نے مجھے اپنے سینے پر لٹا لیا پھر زور سے بھینچا، میرے سر کو چوما اور ایسے ہی میں اُس کی گرفت ڈھیلی پڑی۔۔۔۔۔

”باپ نے مجھے اٹھا ہا۔ وہ رو رہا تھا۔ باپ نے ماں کی پیشانی کا ہوسہ لیا اور مجھے سینے سے لگا کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں پٹی پٹی نظروں سے کبھی ماں کو دیکھ رہا تھا کبھی باپ کو۔۔۔۔۔

”شام کے وقت لوگ بری ماں کو اٹھا کے میرے سامنے مٹی میں دبا آتے میں رویا اور روتا ہی رہا۔“
 جیڈا نے آہ لے کر کہا۔ ”بل گتا ہے جیسے میں تیس برس سے رو رہا ہوں۔۔۔۔۔ ہم اُس وقت یہی مٹی تھے۔

”دو برس تک باپ نے مجھے ہاں پالا ہوسا جیسے وہ میرے دل سے ماں کی یاد کو دھو دینا چاہتا ہو۔ وہ بہت حد تک کامیاب تھا میں اُس کا کھانا بچھتا۔ اُس نے شاید میری ہی خاطر دوسری شادی نہ کی۔۔۔۔۔

”پڑھنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ اپنے جم جماعتوں سے میں ہمیشہ آگے رہتا تھا۔ باپ کی تبدیلی مانگو ہو گئی معلوم نہیں اُس کی خدمت کیسی تھی یا کیا مجبور تھی کہ وہ مجھے ساتھ نہ لے جاسکا۔ مجھے میرے چچا کے حوالے کر دیا اور مکان بڑے پر دے کر چلا گیا۔۔۔۔۔ چچا کے دو بچے تھے۔ ایک میرا عمر دو سال

ان کے بچوں سے انتقام لے لیا کرتا تھا۔ اس مار پٹائی میں اور پیسے بھی نہیں کھینک دینے میں مجھے لگتا سی محسوس ہونے لگی۔ جیسا نے قہر آلود آواز میں کہا۔ ”بابا! میں آج بھی وہی پہننے والی حرکت کرتا ہوں۔ جس گھر میں جب میں پیسے دیکھتا ہوں اس پر لوٹ پڑتا ہوں۔ پیسے بھی لیتا ہوں اور بھینک دیتا ہوں اور جو میری راہ میں آتا ہے اس کا خون کر دیتا ہوں....“

”اُسی عمر میں ہی مجھ میں اس قدر اذیت پرستی اور تشدد پسندی پیدا ہو گئی تھی کہ میں چچا زاد بھائیوں کے علاوہ دوسرے بچوں کو بھی سپیٹ دیا کرتا تھا میں جس سے دست و گریبان ہوتا اس سے لہو لہان کر کے دم لیتا تھا۔“

”مہتار بابا لوٹ کے نہیں آتا۔“ بڑے موسیٰ فارے پوچھا۔
”آیا تھا، اور بس بعد۔“ جیسا نے تنک ٹنک کے کہا۔ ”چچا اور چچی نے میرے خلاف خوب زہر افکار۔“ انہوں نے میرے متعلق جو کچھ کہا سچ کہا مگر اپنے متعلق جو کچھ کہا جھوٹ تھا۔ انہوں نے میرے باپ سے کہا کہ وہ مجھے مردود ایک آند دیتے ہیں اور یہ بھی کہ مجھے اپنے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ مجھے زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ جھوٹ بھی بولا جاسکتا ہے۔ مجھے جھوٹ سے نفرت تھی۔ اس وقت بھی، اب بھی۔ چچا اور چچی نے جی بھر کے جھوٹ بولا مگر میں سچ کہنے کی بھی جرأت نہ کر سکا میں انسانی جی نہ بتا سکا کہ میں مال کی قبر پر جا کر رو یا کرتا ہوں اور اس مکان کے دروازے پر جا کے بھی رو یا کرتا ہوں جہاں اب لڑکیاں دار بستہ ہیں۔“

”بابا نے تمہیں مارا ہو گا؟“
”نہیں۔“ جیسا نے کہا۔ ”اُس نے مجھ سے پیار کیا اور کہا۔ ”بیٹا تم تو اتنے پیارے بیٹے تھے پیارے بیٹے یوں نہیں کیا کرتے۔“ میں اُسے کہنا چاہتا تھا کہ یہاں مجھے کوئی بیٹا نہیں لگتا میں اس پیار بھری آواز کو ترس گیا ہوں مگر میں کہہ نہ سکا اور میں اس کے ساتھ لپٹ کے رو یا اور ضد کی گھر مجھے وہ ساتھ لے جاتے۔ بابا نے کہا کہ وہ دروازے پر آ رہا ہے اور اُسے ساتھ لے جاتے گا۔ وہ چلا گیا مگر یہ دروازہ بہت طویل ہو گئے....“

”چچا کا گھر اب میرے لیے جہنم بن گیا میں نے آوارہ لڑکوں کے ساتھ دوستانہ لگا لیا۔ ان کے ساتھ مل بیٹھنے اور ہنسنے کھیلنے میں مجھے بہت لطف آتا تھا۔ گھر میں تو میرے لیے سوائے ڈانٹ ڈپٹ اور گھر کیوں کے کچھ نہ تھا۔ چچا زاد بھائیوں کے ساتھ میرا وہ یہودی رہا۔ پھر میں نے گھر میں چوری شروع کر دی۔ ایک بار چچا نے پھلایا اور ستون کے ساتھ باندھ کر اس قدر پیٹا میں بے ہوش ہو گیا اس کا بدلہ میں نے دوسرے ہی دن اُس کے دونوں بچوں سے لے لیا....“

”چھ ماہ بعد بابا گھر آیا۔ اب تک میں بہت ہوشیار ہو چکا تھا جو بی چچی نے میرے خلاف زہر افکار شروع کیا میں نے اپنی شروع کردی اور تفصیلاً بتایا کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا سکول کیا ہے میں نے یہ بھی بتایا کہ سردیوں کی راتیں انہوں نے مجھے نوخورد سے بدتر حالت میں رکھا میں شیلیں اور کاپیاں لوگوں سے چڑا چڑا کر استعمال کر رہا ہوں اور یہ بھی کہ انہوں نے عید کے روز میرے لیے نئے کپڑے بھی نہ بنوائے....“

”میرا بابا زارہ قطار رو یا لیکن وہ بے بس تھا جانے مجھے کیوں ساتھ نہ لے جاسکتا تھا۔ مجھے بازار لے گیا۔ میرے نئے کپڑے خریدے۔ جوت لیں لے جاکے کھانا کھلایا۔ ٹھٹھیاں بھی کھلائیں اور مجھے ایک سکول ماسٹر کے گھر لے گیا....“

”یہ سکول ماسٹر جانے غیر شادی تھا یا کیا تھا۔ اکیلا رہتا تھا۔ بابا نے مجھے اس کے حوالے کر دیا اور کہا کہ

آئندہ مکان کا کرایہ وصول کر لیا کرے اور اس میں سے میرے اخراجات پورے کر لیا کرے۔ بابا نے اسے خاص طور پر کہا کہ مجھے ایک آندہ روز باقاعدہ ملنا پڑا کرے۔ دوسرے روز میرے بابا نے میرے سر پر پتھر پھرا اور کہا بیٹا میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی.... بابا!۔ جیسا نے دیکھی ہوئی آواز سے کہا۔ ”وہ آج ہی انسان تھا جس نے مجھے بیٹا کہا تھا اور آج تم نے اسی پیار سے بیٹا کہا ہے....“

”سکول ماسٹر نے مجھے پیار سے گھر رکھا۔ مجھے کھانا پیارا دلپس ملنے لگا تو میں راہ پر آنے لگا سکول میں لڑائیاں جھگڑائے بند ہو گئے چوری چکاری ختم ہو گئی اور میں پھر دل لگا کے پڑھنے لگا۔ ماسٹر مجھے ہر روز ایک آندہ دیتا تھا اور میرا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا.... ایک روز مجھے کہنے لگا، جادوئل کے پاس جو سردار والا مکان ہے وہاں سے میرے لیے روٹی مانگ لاؤ۔ وہ اپنی ماڈی روٹی خود ہی کیا کرتا تھا میں مجھے تیار تے چلا گیا اور اُس گھر سے اس کے لیے روٹی مانگ لایا۔ دوسرے روز اُس نے پھر ایک اور گھر سے روٹی لانے کو کہا تو میں نے انکار کر دیا میں نے کہا مجھ سے یوں بھیک نہیں مانگی جاتی اس نے بہت کہا لیکن میں نہ ہی گیا آخر اُس نے مجھے پیسے دیتے اور میں جوت لے کر کھانا لے آیا....“

”چند روز بعد وہ جلدی جلدی میں گھر آیا اور کاغذ کے پرزے کچھ لکھا پھر تہ کر کے چڑھ مجھے دیا اور دروازے میں آکر مجھے کہنے لگا۔ ”وہ دیکھو میں جی عورت کھڑی ہے نا اب یہ رقعہ اس کے پاس بھینک کے آگے نکل جانا۔“ میں کاغذ لے کر مل پڑا معلوم نہیں ماسٹر کچھ رہتا تھا یا نہیں میں نے راستے میں رقعہ کھول کر پڑھا لکھا تھا۔ آج رات دروازہ کھٹکھٹانا۔ میں سب سمجھتا تھا میں وہیں سے لوٹ آیا اور رقعہ ماسٹر کو دے کر کہا کہ میں ایسے رقعے نہیں لے جایا کرتا۔ اس نے میرے منہ پر زور سے پھڑپھڑا کر میں نے رقعہ کھول کر پڑھا اور یہ بھی کہ میں نے اس کا حکم کیوں نہیں مانا تھا اس نے مجھے یہ سننا بھی دی کہ دوسرے روز ایک آندہ نہ لایا۔ بولا۔ ”جب تک میری ساری باتیں نہیں مانو گے آندہ نہیں ملے گا۔“ لیکن میں نے اس کی باتیں ماننے سے انکار کر دیا....“

”اگلی رات میں گھر میں نیند سو یا جھوٹا تھا ماسٹر نے مجھے جگا دیا ہم دونوں ایک کمرے میں سو یا کرتے تھے۔“

اُس نے مجھے دوسرے کمرے میں سونے کو کہا تو میں نے کہا کہ اکیلے ڈر لگتا ہے اس نے مجھے گھسیٹ گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں دھکیل دیا اور میرا بستر ڈال لایا۔ مجھے مارا بھی اور دھمکا بھی کہ میں چپ چاپ سو جاؤں اُس نے باہر سے چٹنی چلھادی....“

”میں رونے لگا۔ کچھ روز بعد ماسٹر کے کمرے میں کبھی عورت کے ہنس ہنس کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دیں۔ میری نیند اچاٹ ہو چکی تھی....“

”گھٹنہ دو گھٹنہ بعد ماسٹر نے دروازہ کھولا اور مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ دیکھا وہ اکیلا تھا عورت جا چکی تھی۔ وہ بفریہوی کے رہتا تھا میری عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ اُس نے مجھ سے اٹلی سیدھی باتیں شروع کر دیں اور اسی مطالبہ کر لیا جو میں جان کے بدلے بھی پورا کرنے کو تیار نہ تھا۔ اُس نے پیوں کالاج دیا۔ سینا دکھانے کا وعدہ کیا آخر رکھائی پڑا آیا اور اس نے ایک رات مجھے بہت پیٹا....“

”ایک آندہ ملنا تو نہ ہو سکی چکا تھا۔ اب وہ مجھے دراز اسی بات پر مارنے لپٹنے لگا بغاوت کی جو چنگا بال دب گئی تھیں پھر سگ اٹھیں۔ میں نے اُس کے ہاں بھی چوری کی اور آوارہ لڑکوں کی منڈلی میں جا بیٹھا.... ایک روز ماسٹر نے چوری کرتے پھل لایا اور لگا پٹینے۔ میں نے بیخ بیخ کر کہا کہ میرے اپنے پیسے ہیں جو

تم ہمارے کرائے کے وصول کرتے ہو اور مجھے نہیں دیتے۔ اس کے پاس اس کا ایک ہی جواب تھا۔
”تھوڑے گھنٹوں کے اندر آئیں، اس رات اس نے مجھے بھوکا رکھا۔ اس کا انتقام میں نے اس طرح لیا کہ اس کا نیکل چلا کے جاکر اس کے ہاں چھ روپے پر بیچ دیا اور سب دوستوں کو بچہ دکھائی....

”ماسٹر نے مجھے غیر انسانی اذیتیں دے دے کرا قبل جرم کرنا چاہا لیکن میرا جرم سخت ہو چکا تھا اور پیار سے مجھ کو دل ایسا پھرن گیا تھا کہ اذیت، تشدد اور ظلم سے یہ اور زیادہ مضبوط ہوتا جا رہا تھا....

”ایک روز چچا ماسٹر کے ہاں آیا اور بتایا کہ میرا باپ ناکپوں میں مر گیا ہے میرے لیے دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ اب امید کی ذرا سی جگہوں پر ابھی وہ بھی مٹی میں مل گئی چچا نے مجھے اپنے ہاں چلنے کو کہا تو میں نے انکار کر دیا کیونکہ بہت اصرار کیا لیکن میں نہ گیا۔ دوسرے روز ماسٹر نے مجھے گھر سے نکال دیا میں تو خود بھی اب اس گھر میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اپنے مکان کے کرائے کا آسرا تھا۔ سوچا کرایہ داروں سے پانچ دس روپے کم کرایہ لے لیا کروں گا اور وہیں ایک کمرے میں جا رہوں گا....

”ماسٹر کے گھر کو آخری سلام کر کے میں کرایہ داروں کے ہاں گیا تو وہ ہاں تالا لگا رکھا معلوم ہوا کہ وہ دوبارہ کی چھٹی کر پیں باہر گئے ہوتے ہیں.... اور میں بمبئی شہر کی گلیوں، فٹ پاتھوں، سڑکوں اور باغوں میں مارا مارا پھرنے لگا۔ ایک رات ریٹو سٹیشن کے مسافر خانے میں سویا، اگلی رات قبرستان میں ماں کی قبر کے پاس سویا اور اس سے اگلا دن میرے لیے قیامت کا دن تھا۔ رہا فتنے کا تیسرا روز تھا۔ پاس پلے بھوئی کوڑی نہتی بھیک مانگی نہ گئی جس میں آتی کسی گھر یا ہوٹل میں نوکری کر لوں لیکن ماں کا اکوڑ اور لاڈلا بچہ کسی کے جھوٹے بہن بھائی پر آمادہ نہ ہوا....

”میں نے بازار کا رخ کیا۔ اس وقت مجھے ماں یاد آتی نہ باپ نہ یہ خواہش کو کوئی مجھے پیار سے بلاتا کے بس ایک ہی خواہش تھی کہ کوئی روٹی کا ٹکڑا پھینک دے اور میں اٹھا کے کھا لوں۔ مائیں لڑنے لگیں۔ سر ڈول گیا۔ آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی اور اس دھند میں مجھے روٹی بکاب والے کے ریڑھ کے نیچے کچر میں پڑا روٹی کا ایک ٹکڑا دکھائی دیا اور میں اس ٹکڑے پر جا کڑا پیشتر اس کے کہ میں اس سے کچھ صاف کرنا کھڑا میرے پیٹ میں بیج چکا تھا۔ اس ایک لقمے نے بھوک کی آگ کو اور زیادہ بڑھ کا دیا....

”تھوڑی ہی دور آگے کسی عظیم یاد داری نے مجمع لگا رکھا تھا۔ میں نے ایک آدمی کی پتلون کی جیب میں پانچ روپے کے نوٹ کا نوٹہ دیکھا۔ دوسرے لمحے میرا ہاتھ اس کی جیب میں تھا اور اسی لمحے اس کا ہاتھ میری کلائی پر تھا۔ میں چیخنے چلائے لگا۔ بھوکا مر رہا ہوں۔ مت مارنا مجھے تین روز سے بھوکا ہوں۔ میں اپنے حشر سے آگاہ تھا۔ پتھروں اور گونسوں سے بچنے کے لیے دوسرا ہاتھ چہرے پر لپیٹ لیا لیکن اس نے مجھے نہ پتھر مارا نہ گھونسا۔ وہ مجھے مجمع سے ایک طرف لے گیا۔ میں روئے اور چلائے جا رہا تھا۔ اس نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ چپ ہو جانے کو کہا اور پانچ کا نوٹ نکال کے میرے ہاتھ میں دے دیا۔ بولا: ”ڈرو نہیں.... یہ نوٹ اپنے پاس رکھ لو۔ بھوک لگی ہے؟“ میں نے کہا بہت بھوک لگی ہے....

”وہ مجھے اپنے گھر لے گیا عجیب و بران سا گھر تھا اس کا جہاں جاتے ہی میرا دل ڈوبنے لگے۔ اپنی عمر اور کمپرسی دیکھتے ہوئے دل میں طرح طرح کے خدشے آتے۔ اس کے گھر کا ماحول گھر ملو تھا ہی نہیں۔ وہ مجھے کمرے میں بٹھا کر بارگیا اور نوٹ آیا تو تھوڑی ہی دیر بعد ایک لڑکا روٹیاں، سالن اور کھیر کی پلیٹ لیے

کمرے میں آیا جسے دیکھ کر میں سب خوف بھول گیا اور میں روٹی پر ٹوٹ پڑا۔ روٹی کھا چکا تو اس نے دودھ پلایا وہ رہ رہ کے میرے سر پر ہاتھ رکھتا تھا اور باپ کی طرح بچکا بچکا کر باتیں کرتا تھا....

”اس نے مجھ سے پوچھا میں کون ہوں تو میں نے ماں کے مرنے سے لے کر اس کی جیب میں ہاتھ ڈالنے تک کی روایت دہرائی۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ”مجھے اپنا باپ سمجھو اور اس گھر کو اپنا گھر سمجھو....

”مجھے اوتھائی تو اس نے مجھے لیٹ جانے کو کہا۔ دل کا پھلا پھر تھا میں لیٹا اور سو گیا اور دوسرے دن دوپہر کو کچھ کھلی۔ وہ کمرے میں ٹپل رہا تھا میں جا کر اس نے مجھے پھر کھانا کھلایا اور کمانے دیکھ کر کسی کی جیب سے یوں نوٹ نہیں نکالا کرتے، آپس میں تجھے بتاؤں....

”اور اس نے مجھے جیب تراشی کا پہلا سبق دیا۔ دو ہی چار روز بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ بمبئی کا ماسٹر گروہ کٹ ہے۔ استاد غنڈہ جس کا گروہ ساری بمبئی میں پھیلا ہوا تھا شہر کے تمام جیب کھترے، اٹھائی کھراور زبٹیاں اس کی مرہیتیں۔

کو پھیلنا چاہتا ہوں میں لڑکی اور اس بچے سے بھاگ جانا چاہتا ہوں لیکن ان کی مصحوم مسکراہٹوں نے مجھے ڈرنا سا کر لیا ہے میں اپنے آپ میں قید ہو گیا ہوں... جیلا جیسے چونک اٹھا ہوا بولا "میں رسول بابا! نازنا نظر کر رہی ہوگی؟"

مازوں؟

"اس لڑکی کا نام ناز ہے" جیلانے کہا۔ "جاتا ہوں بابا! رات بہت گزر گئی ہے۔"

"عمر تو نہیں گزری" بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹھو خوب باتیں کرو... اور دیکھو بیٹا! میرے دھڑکنے والے ہاتھ میرے پاس آ کر میرے سب سے پیارے بچے ہو۔ ان دو مصحوم ہستیاؤں میں کھل جاؤ۔ اپنے بابا کو اپنا بنا لو تم آؤ بیٹا! میرے سینے سے لگ جاؤ۔ اپنے دکھ مجھے دے دو۔"

جیلانے انہوں نے ہلکے۔

"تم نے کبھی مسکراتے ہوئے آنسو دیکھے ہیں؟" جیلانے جھٹیلوں سے انھیں پوچھ کر کہا۔

"کبھی روتی ہوئی مسکراہٹیں دیکھی ہیں؟... نہیں دیکھیں تو مجھے دیکھ لو میرے آنسوؤں وقت مسکراتے ہیں جب میں کسی کا گھر لوٹ لیتا ہوں کسی کی حبيب کاٹ لیتا ہوں اور جب میرے چاقو کے زخم سے کسی کا خون بہتا ہے... اور جب تم سا کوئی پیارا انسان اس تار کی طرح میرے جذبات کا سا ڈھیر دیتا ہے تو میری مسکراہٹیں روتی ہیں۔ میں خدا کا شکر ادا کیا کرتا ہوں کہ مجھ میں جب میں میری سڑکوں پر چھوٹا پھر رہتا تھا تو مجھے جرائم کی دنیا کے ایک استاد نے سنبھال لیا، اور شکر اس بات کا زیادہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے کوئی ان شہرلوں سے نہ مل گیا جو چروں کو چروا رہے تھے آپ کو شریف شہری کہا کرتے ہیں۔"

"تم عجیب انسان ہو" بوڑھے موسیقار نے ہنسنے سے کہا۔ "میں نے تم جیسا انسان کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں نے اپنے جیسا انسان خود بھی کبھی نہیں دیکھا... میں تو اچھا بھلا تھا بابا مگر جب تک کو اپنے ساتھ رکھا ہے اور پھر یہ سچہ آگیا ہے تو میری حالت یہ ہو گئی ہے جیسے اپنے آپ کے لیے اپنی ہو گیا ہوں۔"

اپنے آپ کو پچھاننا مشکل ہو گیا ہے... میں کون ہوں؟ میں کیا تھا؟ اب کیا ہوں؟ کہاں سے چلا آیا ہوں؟

کہہ جا رہا ہوں؟ میری منزل کہاں ہے؟

بوڑھے موسیقار نے دھیسا قہقہہ لگایا اور کہا۔ "پتھر پیا کو نہیں توڑ سکتا، پیار پتھر کو توڑ دیتا ہے۔"

پتھر ہول کے آنسو نکال دیتا ہے۔

جیلانے کے لیے اٹھا اور آہ بھر کر کمرے سے نکل گیا۔

رات کا کچھلا پھر تھا۔ برقعہ کا موٹی جھٹی کوارٹروں اور چھوٹوں کی وسیع لٹی پر موت کا سکوت طاری تھا مگر جیلانے کے سینے میں ہنگامے بپا ہو رہے تھے جنہیں بوڑھے موسیقار کی پیار بھری آواز کی گونج تھمکاتا دے دے کو حشر لہا رہی تھی۔

جیلانے آج رات اس طرح چل رہا تھا جس طرح چور اچکے نہیں چلا کرتے۔ چل ہی نہیں سکتے۔ اس کا ضمیر جیسے بوجھ چھینک کے ہلکا پھلکا ہو گیا تھا مگر جیلانے ساتھ ساتھ ایک سانسے کو چٹا محسوس کر رہا تھا۔ یہ سایہ کسی چراچکے کا تھا اور اس کے خطوط جیلانے سے ملتے جلتے تھے۔

جیلانے اپنے ماضی کی داستان سن رہا تھا۔ اُس کے لب و لہجے میں خوشخبری نہیں تھی، انداز میں مجرمانہ ذہنیت کی لمبی سی جھانک نہیں تھی۔ ڈوکی جنبی اُسے دیکھتا تو یہی کہتا کہ گزرا اور بے بس سایہ آوی تم سیدھے اسے اور اچھی دھاتیں مار کر روڑے گا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں لال سرخ ہو جاتی جاری تھیں کبھی اُس کی زبان سے الفاظ کی بجائے آہ نکل جاتی تھی۔

بوڑھا موسیقار بے خود بیٹھا جیلانے کی داستان میں جیسے گھل جاتا تھا۔

جیلانے کا ہاتھ تھا۔ "بہت سی اُسے اس داستان نے مجھے حبيب تراشی کے تمام داؤ بچ سکھا کر اپنے وہ میں شامل کر لیا، پھر مجھے تالے توڑنے اور بھرنی میں ماہر بنا دیا۔ اُس نے مجھے پٹیا بھی، پیار بھی کیا لیکن اب میں پٹیا کی لذت اور پیار کی لذت سے بہت دور نکل آیا تھا۔ میں تھوڑے ہی عرصے میں اُس کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔"

"بابا! تم یہ سن کر شاید حیران ہو گے کہ میں اس پیشے میں لکھنے پڑھنے کو نہ بھول سکا میں نے اچھی اچھی کتابیں پڑھ ڈھ ڈالی ہیں۔ میں ایک ڈائری بھی لکھتا ہوں، دل میں غبار سا ہے جسے سننے والا کوئی نہیں ہوتا میں یہ غبار ڈائری میں اُگل دیا کرتا ہوں، چند فقرے لکھ کے پون تسکین ہو جاتی ہے جیسے میں نے کسی کو حال دل سن دیا ہو۔"

"جب بندہ داستان تقسیم خواہم کر اچھا آگیا اور اپنا گروہ بنا لیا جس کا میں اب سردار ہوں ساری کچی میں جال بچھا رکھا ہے۔ اس جال سے کوئی محفوظ نہیں۔ پولیس، قانون، حاکم، وزیر سبھی میرے جال میں اُجھکے ہوئے ہیں۔ وہ چپ ہو گیا پھر بولا۔ "مگر اب میں خود ایک جال میں اُجھکتا جا رہا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"میرے پاس ایک لڑکی ہے جسے میں نے خریدا تھا۔"

"خریدا تھا؟" بوڑھے موسیقار نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں! جیلانے کہا۔ "میراث بیچنے کے لیے لیکن اب تک اُسے بیچا نہیں میں نے اسے خرید کر گھر رکھ لیا تھا لیکن اُس نے آہستہ آہستہ مجھے خریدا لیا ہے۔ اس نے مجھے اپنی ذات میں اس طرح اُجھکا لیا ہے کہ میں اُس کے سامنے اپنے تمام داؤ بچ بھول جاتا ہوں اور ایک بچہ بن جیسے شاید کبھی کا کوئی ڈھیر نکل چکا ہو تا لیکن میں نے اسے زندہ دی ہے۔ اب یہ بچہ مجھ میں ایک نئی زندگی پیدا کرتا جا رہا ہے۔"

"پچھس کا ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔ "اسی لڑکی کا؟"

"نہیں! جیلانے بولا۔ "یہ ایک اور داستان ہے۔ وہ ایک بن بیاہی ماں کا بچہ ہے۔ اس لڑکی کو بچے نے مجھ میں ایسی جمل پھادی ہے جس سے میں کوسوں دور بھاگتا رہا۔ اس جمل میں ایک لطف سا محسوس کرتا ہوں۔ وہ دونوں جب رات میرے پاس بیٹھتے ہیں اور پچھلے میں تو میرے قصوں میں ایسی یادیں ابھرتی ہیں جو میں سمجھتا تھا کہ کبھی بے سحر آج لپک لپک کر ان یادوں کو اور گئی گزری باتوں

جیدانے پورے موسیقار کو کمائی سنا تو دی لیکن اس کی حالت اس جنگجو کی سی ہو گئی جس کی تلوار لیان جنگ میں گر پڑی ہو یا اس ناک کی سی جو زمر کہیں اگل آیا ہو۔

اس کے سینے کا لالہ بچھ کے رہ گیا اور اس کی زندگی میں انقلاب رونما ہوئے لگا۔ اپنے آپ سے اچھ لکھ کر وہ تھک چکا تھا۔ اب اس نے اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا۔ داخلی دنیا میں جوفنیانی آگئی تھی، اس نے اپنا آپ اسی کے ہماؤ میں ڈال دیا۔

دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے وہ راتیں بھی گزرتی گئیں جو جید کو کبھی شراب میں بدست کبھی دھیمی کی واردات کرتے اور کبھی کسی طوائف کے ہاں دیکھا کرتی تھیں مگر جید کی کیفیت ایسی ہو رہی تھی جیسے شب و روز اس کے اوپر سے ریل گاڑی کی طرح گزر رہے ہوں اور اس کا گناہ انک کٹ رہا ہو۔

اس کے شاگردوں نے کتنی بار دیکھا کہ شام جب جب محروں اور چراغوں کا باہر نکلنے کا وقت ہوتا ہے، جید پلنگ پر لیٹا ہوا ہے اور پتھر اس کے پیٹ پر پھیل رہا ہے یا وہ ٹپ پا تختہ پر چلا جا رہا ہے لوگوں کو بٹون میں نوٹ ڈالتے دیکھا بھی ہے مگر پتھر میں کوئی ٹھنڈا اٹھا تے چلا ہی جا رہا ہے لیکن غروں نے یہ نہ دیکھا کہ رات کو وہ بعض اوقات گھر سے غائب ہوتا ہے تو جانا کہاں ہے۔ وہ نہ تو کبھی طوائف کے ہاں ہوتا تھا نہ کسی اڈے پر نہ کسی فشکار کی کھوج میں۔ وہ اپنے باپا موسیقار کے پاس بیٹھا ہوتا تھا اس کا گروہ کراچی کے لیے بدستور خوف و ہراس بنا ہوا تھا۔ شہر میں جرائم کی رفتار پہلے سے زیادہ

تیز ہو رہی تھی جید کے چھو کرے اپنے کاروبار میں پہلے سے زیادہ مصروف تھے لیکن جیدان کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ تھک سارے لگا تھا۔

اس کے ساتھیوں نے آغاز کے چند روز اس کی خاموشی اور بے بدلے سے روپے کو بڑاؤ اہمیت نہ دی۔ سوچا شاید استاد تھک گیا ہے۔ جب اس کی لالعلقی بڑھنے لگی تو منٹا اوٹھ پڑا مگر سوتے اور اسے راہ پر لانے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک روز جید اصحن میں ٹہل رہا تھا کہ منٹا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”استاد!۔۔۔ منٹے نے کہا۔۔۔“ مینے گزر گئے ہیں تم گھر بیٹھے ہو یا کہ محبت ہو گئی ہے لیکن...“ جیدانے اسے آگے بولنے نہ دیا۔ اس کی طرف قہر لڑو کھا ہوں سے دیکھا اور منٹا دیک کے رہ گیا۔

پھر ایک روز جید لاٹری کھولے بیٹھا تھا ٹیپو گھرے میں ٹہل رہا تھا۔ دونوں کے درمیان بہت سی باتیں ہو چکی تھیں۔ دونوں اکتا چکے تھے۔

”میلر مطلب نہیں۔“ ٹیپو تھک مار کر صلح جو قسم کی بات پر آیا۔ ”تم یوں بیٹھ جاؤ گے تو تم تھک را ساتھ چھوڑ دیں گے ہم نے تمہارا انک کیا یا ہے استاد اتم ہمارے پیروم شد ہو لیکن بعض گاہوں پر تمہارا ساتھ ہونا ضروری ہوتا ہے۔“

”اے کے گھر کا کیا حال ہے؟“ جیدانے ٹیپو کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

”انہیں پیوں کی ضرورت تو نہیں؟“

”وہاں سب ٹھیک ہے۔“ ٹیپو نے ٹپٹا کر کہا۔ ”وہ میری ذمہ داری ہے۔“

ایک دن جید گھرے میں لیٹا ہوا تھا کہ ایک نو عمر لڑکا آیا۔

”اُستاد میں ہزار کاٹ چاہتا ہوں آج موقع ہے۔۔۔ رستہ صاف ہے اور...“

”نہیں چاہیے۔“ جیدانے غصے سے کہا اور کوٹ بدل لی۔ ”تجاو... اور سنو... اپنا کوئی آدمی گرفتار تو نہیں ہوا؟“

”نہیں اُستاد!“

اور ایک دن منٹا ہے کہ ہزار کاٹ کہ ایک لیڈر کا پیغام آیا ہے۔ کل کسی دوسری پارٹی کے جلسے کا پروگرام ہے۔

”تم اور ٹیپو سمجھ لو۔“ جیدانے کہا۔ ”اس کا کام میرے بغیر کرو۔۔۔ تم پتھے تو نہیں ہو۔۔۔ اور سنو منٹے اپنا کوئی چھوٹا گرفتار تو نہیں ہوا؟“

”نہیں اُستاد دو لوڈر ہے چھ چھ ماہ کاٹ کے پرسوں رہا ہوتے ہیں۔“

ایک دن ٹیپو جید کے پاس آ بیٹھا۔

”اُستاد اسوگر بازار میں ایک دکان ہے۔“

”کیا ہے؟“

”ریڈی میڈ پیڑے۔ دو سو تیار بوتھ شٹیں اور ہٹلن کے بہت سارے تھال ہیں کچھ اور مال بھی ہے۔ رات تالالوڑا پڑے گا؟“

”تین چھو کرے کافی ہیں۔“ جیدانے بے نیازی سے کہا۔ ”ٹیکسی لے لینا اور تم خود ساتھ جانا۔“

دارالحکومت میں سیاسی شعبہ بازیال عروج پر تھیں۔ لیڈروں کو جیدانے، ٹیپو، بشیرے اور گلو بدعاش اور ان کے گروہوں کی شدید ضرورت تھی۔ یہ تمام لوگ بوقت ضرورت حاضر ہوجاتے تھے مگر اب ان میں جیدانہیں ہوتا تھا۔ وزیروں اور اٹھائی گروں کے تعلقات بہت گھرے ہو گئے تھے مگر جیدانہ منظر سے غائب تھا۔ کوئی تلاش کرتا تو وہ ناز اور سپتے کے پاس بیٹھا ملتا یا جیکب لائن کے کوارٹر میں موسیقار کے پاس!

لیکن جیدانے گروہ کی کارگزاریوں سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ صرف عملی طور پر الگ تھک نظر آتا تھا، رحمان اسی کے ہاتھ میں تھی۔ اسے حکومت کی شب و روز ہلتی پالمیوں اور غیر یقینی سیاسی حالات کا مکمل علم تھا۔ وہ صرف فرنٹ لائن سے بہت آیا تھا۔ ہدایات اسی کی چل رہی تھیں۔ رات کو وہ سننے اوٹھ پو کاسی اور ساتھی کو بلا کر تمام سرگرمیوں کا حال سن کر اور ضروری ہدایات دے کر سوتا تھا۔

منٹا اوٹھ پو طہن نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ استاد ان کے ساتھ رہے۔ البتہ ناز طہن تھی وہ صرف ایک کچی محسوس کر رہی تھی جس کا اس نے ایک دن اظہار کر ہی دیا۔

”جید! آؤ۔ اب ہم ایک ہوجائیں۔“ ناز نے تشنہ سے بچھے میں کہا۔ ”اب تو ہم میں دو ہی نہیں

بہی چاہتے کیوں نہ شادی کر لیں۔“

جیدانے اس کی طرف دیکھا مگر چپ رہا۔

ناز نے جیسا کہ گلے میں باہیں ڈال دیں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں جیسا کہ یوں لگیں محسوس کی جیسے ناز نے آنکھوں کے راستے اس کی تیس برس کی بے چینیوں چوس لی ہوں۔ بڑے دو دروازے پر کسی کی دستک نہ ملے طلسم توڑ دیا۔ ناز نے باہر جا کر دروازہ کھولا۔ ایک لڑکا آیا تھا۔

”اُستاد کہاں ہے؟“ لڑکے نے پوچھا۔

”وہ باہر گیا ہوا ہے۔“ ناز نے بے رخی سے کہا اور پوچھا ”کیوں؟“

”اُسے شہی اور بالی نے بلایا ہے کتنی تھیں آج رات...“

”انہیں کتنا استاد کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ ناز نے سمجھا نہ بچھے میں کہا۔ ”نہیں آسکے گا۔“

دوسرے روز صبح اور ٹیپو اپنے کمرے میں جیسا کہ ایک دلچسپی کے لیے بکرے تھے اور وہ انہیں مال رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں جیسے جاتیں لیکن وہ دونوں مل نہیں رہے تھے۔

”اُستاد تم آخر استاد ہو۔“ ٹیپو نے کہا۔ ”آج تم نے ساتھ نہ دیا تو ساٹھ ہزار روپیہ ہاتھ سے نکل جاتے گا۔“

”ہو سکتا ہے کچھ زیادہ ہی ہاتھ آجاتے۔“ مٹے نے کہا۔

”کم از کم تین سو نوے کے مار میں۔“ ٹیپو بولا۔

جیسا خاموش کھڑا سنتا رہا۔

”ایک پتول اور ایک بندوق بھی ہے۔“ مٹے نے اضافہ کیا۔

”نہیں! جیسا کہ آہنگی سے کہا۔“ میں ساتھ نہ دے سکوں گا تم چلے جاؤ۔“

ٹیپو اور مٹا جھلا گئے۔

”کیوں اُستاد!۔“ مٹے نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ ”ہو چکی دادا گیری؟“

”عورت کی دوستی شیر کو لیدر بنا دیتی ہے۔“ ٹیپو نے کہا۔

”عورت کا غلام۔“ مٹے نے طنز نہ کہا۔ ”زل مرید!“

”تم نے کہا تھا میں اپنی دنیا کا خدا ہوں۔“

”تم نے انسانوں کا خون پانی کی طرح بہایا ہے۔“

جیسا خاموش کھڑا سن رہا تھا جیسے سنگ ر کیا جا رہا ہو چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک

جاتا تھا مٹا اور ٹیپو شعلے اُگل رہے تھے۔

”آج خود ہی تک۔“

”جی میں آتا ہے تیری ناز کی تڑکا بولی کروں۔“

”اس حرامی کچے کا گلہ گھونٹ دیں۔“

”تم نے عورتوں کو بازار دل میں بیچا ہے۔“

”ان دونوں نے تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔“

”یہ کچھ گرسبیلیاں اپنا پھیل نہیں۔“

جیسا جو کراچی کا بھوت اور گناہیوں کی دنیا کا دیوتا تھا۔ مٹے اور ٹیپو کے درمیان بے بس کھڑا تھا۔

ان دونوں کی لعن طعن زہر میں سمجھے ہوئے تیر بن کر اس کے سینے میں اُترتی جا رہی تھی۔

”جیسے اُستاد!۔“ مٹے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بھڑکا اور کہا۔ ”مجھے تم نے سوچا ہے کہ تم ہو کیا؟ تم جن بھوت تو نہیں۔“

”اُستاد ہو جا رہے اس لیے وفادار ہیں۔“ ٹیپو نے کہا۔ ”اس لڑکی کو چلتا کرو نہیں کرو گے تو اسے دھونڈتے پھر گے۔“

جیسا بول چکا جیسے کسی نے بجلی کے ننگے تار اس کے جسم سے لگا دیے ہوں۔ اس نے کھڑے کے اندر ہاتھ والا اور بڑی تیزی سے ناف سے خنجر نکال لیا۔ وہ ٹیپو کی ٹشٹ بڑھا ٹیپو نے چاقو نکال لیا۔ دونوں کے چہروں پر قہر اُتر آیا تھا۔ مٹا ان کے درمیان آگیا۔

”ایک عورت کی خاطر۔“ مٹے نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ ”شاگرد اُستاد کے مقابلے میں اُتر آیا ہے۔... سوش میں آ اُستاد! کو تو ایسی دس لڑکیاں نہیں لادیں۔“

جیسا کا چہرہ لال ہو گیا تھا اور وہ خاموشی سے ٹیپو کو گھور رہا تھا۔

”بٹھ جاؤ۔“ مٹے نے دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بٹھا دیا اور سگریٹ نکال کر اس میں چرس ڈالنے کے لیے تباہ نکالنے لگا۔ اس نے کہا۔ ”کیا ہیں ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہونا ہے؟“

جیسا نے خنجر ناف میں اُتر لیا اور باہر چل پڑا۔ مٹے نے اس کا ٹخنہ پکڑ لیا۔

”ارے جانے دوا سے!۔“ ٹیپو نے غصے اور مایوسی کے لیے جگہ لہجے میں مٹے سے کہا۔ ”دیکھ لی اس کی مردانگی۔“

جیسا کہ گھبراہٹ میں اس نے اپنے دونوں جگر یاروں کو ایسی عجیب سی نظروں سے دیکھا جیسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ جانے وہ کیا کرنا کیا کیا کتنا صحن میں کسی کے دوڑتے قدموں کی آہٹ سنائی دی جو کمرے میں آگئی جیسا کے قہر کا ایک نوعمر لڑکا تھا۔

”اُستاد!۔“ لڑکے نے ہانپتی کانپتی آواز میں کہا۔ ”جلدی نکلو! اللہ قسم، مر رہا آجائے گا۔“

”کیا ہے؟“ جیسا نے پوچھا۔

”آج سینکڑوں جہیز کاٹ لو اُستاد!۔“ لڑکے نے لڑکوں کی سی شوخی سے کہا۔ ”سارا شہر لوٹ رہی بازار میں جمع ہو گیا ہے۔“

”سیدھی جو اس کربات کیا ہے؟“ ٹیپو نے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا۔

”لوٹ رہی بازار کو لگتی ہوئی ہے۔“ لڑکے نے کہا۔ ”دکانیں جل رہی ہیں۔ بازار خالی ہو رہا ہے۔ ہزاروں لوگوں کا ہجوم تماشہ دیکھ رہا ہے کسی کو اپنا سوش نہیں۔ دکانوں سے دکاندار مال باہر پھینک رہے ہیں۔“

”اور اُستاد! وہاں جو لڑکی کی دکانیں بھی ہیں۔“ مٹے نے جیسا سے کہا۔ ”دعا ٹھکانے کرو اُستاد!... اٹھ اوٹھو!“

”جیلاستان!۔۔۔ لپو نے جیلا کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔
جیلا نے سر کو جھٹکا دیا اور بے جان سی آوازیں کہا۔ ”میں چلوں گا“
تینوں باہر نکل گئے۔ لڑکا ان کے پیچھے دوڑ پڑا۔

وہ سڑکیں روک دی تھیں، جہر سے فائر بریگیڈ کو آنا تھا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں آئیں تو انہیں جھوم آگے بڑھنے کا راستہ نہیں دے رہا تھا۔ لڑکا تیزی سے پھیل رہی تھی۔

جب جیلا، مٹنا اور ٹیپو وہاں پہنچے، اُس وقت آگ ساتھ والی عمارتوں کو لپیٹ میں لے چکی تھی ان کی دکانیں جل چکی تھیں اور ان کے اوپر فلیٹ جل رہے تھے۔ ہوا بہت تیز جل رہی تھی۔ شعلے انسانوں کی ستارے اور جانوں کو بیدردی سے چاٹتے ہوئے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ صرف ایک فائر آئین ان شعلوں سے نہ ڈر رہا تھا۔

ایک فائر آئین بیکار کھڑا تھا۔ شہر میں کئی جگہوں پر زمین کے نیچے فائر مائینڈرینٹ ہوتے ہیں۔ یہ ایک کم و بیش تین انچ گھٹلا ہوتا ہے جس کے اوپر جوڑی وارڈھکنا ہوتا ہے اور اس کے اوپر سطح زمین کے ساتھ ایک بڑا ڈھکنا چڑھا ہوتا ہے۔ فائر بریگیڈ والوں کو ان سے واقفیت ہوتی ہے۔ ان کے پاس ایک ٹری سی جانی ہوتی ہے۔ اس سے وہ فائر مائینڈرینٹ کھول لیتے ہیں اور اس پر اپنا پاپ چڑھا دیتے ہیں۔ اس تین انچ گھٹلے نل سے بہت تیز پانی آتا ہے جو فائر آئین کی ٹینکی میں جاتا ہے اور فائر آئین اسے پانیوں کے ذریعے دور اور پھینکتا رہتا ہے۔

فائر آئین جو بیکار کھڑا تھا، وہ اپنی ٹینکی کا پانی استعمال کر چکا تھا۔ اُس نے جو فائر مائینڈرینٹ کھولا تھا، وہ خشک تھا۔ اس میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ یہ آئین سڑک پر کھڑا صرف ٹن ٹن کر رہا تھا۔ وہ فائر آئین جھوم کے عقب میں گھرے دارن بھی بجا رہے تھے اور ان کی گھنٹیاں ٹن ٹن کاواہلا بپا کیے ہوئے تھیں مگر جھوم کا آسمان کی طرف لپکتے شعلوں نے جیسے پینا مار کر رکھا تھا۔ جھوم اپنی جگہ سے سر نہ سکنے والی چٹان بن گیا تھا۔

اور یہ جھوم جو تماشا دیکھ رہا تھا وہ بڑا سی بھیانک اور ہولناک تھا۔ بھٹے بازار غالی ہو رہے تھے۔ آگ کی زد میں آتے ہوئے سبز منزلہ مکانوں میں رہنے والے اپنا سامان اوپر سے نیچے پھینک رہے تھے۔ یہ فلیٹ بھول بھلیوں کی مانند تھے۔ ان کے مکین گیلریوں اور ٹیرھیوں کے پیچ و خم میں جھوم کر کے پھنے ہوئے تھے۔ حوتیں چیخ رہی تھیں، بچے چلا رہے تھے اور کچلے بھی جا رہے تھے۔ نیچے سے دھواں اوپر جا رہا تھا۔ بعض سٹیرھیوں کو آگ لگ چکی تھی۔

بعض لوگ بالائی منزلوں کی کھڑکیوں اور بالکنیوں سے کود آتے اور سڑک پر گر کر مر گئے۔ آگ نے ان کے نکلنے کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ جل کر مرنے سے انھیں کوئی دھڑا نہ رہا۔ اچھا لگا۔ اور کراچی کا جھوم دھڑک رہا تھا۔ یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس جھوم نے بھی دیکھا کہ ایک آدمی نے اوپر سے پھلانگ لگائی تو راستے میں بجلی کے موٹے موٹے تاروں پر اڑا جن میں سے مٹی زور زور سے پڑی تھی۔ اس کے انجام کا قصور کیا جاسکتا ہے۔

وہ تو قیامت تھی چھتوں، سٹیرھیوں، فرشوں اور بالکنیوں کی جلتی ہوئی لٹری راتھوں کے دھماکوں جیسی آوازیں پیدا کر رہی تھی۔ شعلے غرار رہے تھے۔ ان آوازوں کے ساتھ فلیٹوں سے بھاگنے والے مکینوں کی چیخ و پکار، تماشا کی جھوم کا شور اور اس میں سے راستہ بنانے کی کوشش میں فائر آئینوں کی ٹن ٹن

بوٹری بازار کراچی کا ایک مشہور بازار ہے۔ آج یہ ویسا نہیں جیسا ہوا کرتا تھا۔ یہ تین تین چار چار سبز عمارتوں کا جھرمٹ تھا۔ نیچے دکانیں اور اوپر رہائشی فلیٹ تھے۔ عمارتوں کے درمیان گلیاں بھول گلیوں کی طرح تھیں۔ سبز گلی مارکیٹ تھی۔ ہر قسم کی دکانیں تھیں۔ بچروں کی، جوتوں کی، جہولری کی اور یہاں جہول سٹور بھی تھے۔ ان گلیوں میں ہر چیز مل جاتی تھی۔ صرف چلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ رات کو یہ دکانیں دن کا منظر پیش کرتی تھیں۔ یہ کراچی کا مشہور شاہی گنگ سٹور تھا۔

بوٹری بازار کی رونق میں آج اضافہ ہو گیا ہے اور یہ شاہی گنگ سٹور زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے۔ تمام عمارتیں سینما اور سرسیتے سے تعمیر ہوئی ہیں۔ اس سے پہلے عمارتیں کراچی کی پرانی عمارتوں کی طرح اینٹوں اور پتھروں سے بنی تھیں۔ چھتیں لکڑی کی تھیں۔ ان میں اینٹیں اور پتھر استے نہیں تھے۔ جتنی لکڑی استعمال ہوتی تھی، بعض فلیٹوں کے فرش بھی لکڑی کے تھے۔

۱۹۵۷ء کے آخر میں کراچی کے اس بارونق اور وسیع علاقے کو جو بوٹری بازار کہلاتا ہے، آگ لگ گئی۔ آگ اس طرح لگی کہ فٹ پاتھ پر کتش بازی دالے نے اپنا آتش گیر سامان پھیلارکھا تھا۔ کراچی کے فٹ پاتھ بھی بازار ہی ہوتے ہیں۔ پولیس اور کارپوریشن کی کورم لوازسی سے فٹ پاتھ کے دونوں طرف زمین پر پکڑے پکڑے دکانیں لگی ہوتی ہیں اور ان کے درمیان ڈیڑھ ایک فٹ راستہ لگوں کے لیے رہ جاتا ہے۔ بوٹری بازار کے پہلو سے گزرتی ہوئی ایک چوڑی سڑک کے فٹ پاتھ پر ایسا ہی بازار لگا رہتا تھا۔ ان میں ایک آتش باز بھی تھا جس نے ہوائیاں اور پٹانے زمین پر پھیلارکھے تھے۔

کسی نے گزرتے گزرتے سگریٹ کا جلتا ہوا آخری سہرا بے حس یا طبی سے پھینکا اور پھیل میں بتنا اس کے نکل گیا۔ جلتا سگریٹ سہرائیوں کی بنبوں سے جالگ۔ بنبوں نے آگ بڑھائی اور تین چار ہوائیاں جن کے مٹنہ بوٹری بازار کی بڑی دکانوں کی طرف تھے جل کر اڑیں اور ایک ایسی دکان کے اندر چلی گئیں جس میں طرح طرح کے کیمیکل پڑے تھے۔ ہوائیاں آتش گیر کیمیکل میں جا پھیں۔ کیمیکل کا مرتبان ہر کی طرح پھٹا اور آٹا فانا دکان آتش فشاں بن گئی۔

ہمارے ہاں چونکہ ایسے ہنگامی حالات سے نمٹنے کی کوئی ٹریننگ نہیں ہوتی اس لیے لوگوں میں جھکڑ بڑج جاتی ہے۔ بوٹری بازار میں بھی ایسے ہی ہوا۔ لوگ دھڑکنا آگ ایک دوسرے کو روندتے پھلتے بھاگ اٹھے۔ آگ پھیل گئی۔ چھتیں لکڑی کی تھیں چھتیں جلنے لگیں۔ دکانوں کے درمیان سے اوپر لپٹیوں کو جاتی سٹیرھیاں لکڑی کی تھیں۔ اس صدیوں پرانی خشک لکڑی نے فوراً آگ پکڑ لی۔ آگ دوسری دکانوں میں داخل ہو گئی کسی مکان کو لگی ہوئی آگ کے شعلوں کی آواز بڑی خوفناک ہوا کرتی ہے۔ یہ شعلے دہشت طاری کر دیتے ہیں۔ لوگ سواتے بھاگنے کے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ بوٹری بازار کی آگ میں پول ہوا کہ لوگ دھڑکنا آگ سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس جھوم میں اضافہ ہو رہا تھا اور اس جھوم نے

اور ان کے جینے چھٹکا دیتے ہوئے ہارن۔ یوں نظر آتا تھا جیسے سارا کراچی جل کے رہے گا۔ لوگوں کی حدیں اُس وقت کٹتی ہیں جب وہ بسوں پر ملے بولتے ہیں اور ایک دوسرے کو دھکے دیتے اور دھکے کھاتے بسوں میں اپنے آپ کو ٹھونکتے ہیں، یا اُس وقت جب وہ مداری کا تماشہ دیکھنے میں محو ہوتے ہیں، یا جب کھوٹی ہوئی جاتی واپس دلانے والے حکیم کے مجھے میں کھڑے اُس کی پُرفریب باتوں سے مسحور ہو رہے ہوتے ہیں۔

بوٹری بازار کی آگ تو ایسا تماشہ تھا کہ مجھ میں کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ دھکم پیل ایسی جیسے پتھر ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں۔ یہ دھکم پیل اور جرم کی یہ محویت جیب کڑوں کے لیے پکے ہوتے فصل کی مانند ہوتی ہے۔ درآتی لے کے کاٹتے چلے جاؤ۔

وہاں صرف جیدا تھا اور ٹیوپی نہیں، سارے شہر کے جیب کترے پہنچ گئے تھے اور ہاتھ کی صفائی دکھا رہے تھے ٹیوپی نے ایک آدمی کو دیکھا۔ وہ اپنے جلنے کھر سے دو آچی کیس اٹھا لیا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک عورت اور دو بچے تھے۔ ایک آچی کیس عورت نے اٹھا رکھا تھا ٹیوپی دوڑ کر آگے گیا اور اس آدمی سے کہا۔ ”ایک آچی کھچے بیڑا دیں۔ آپ نچوں کو سنہا لیں۔ رو رہے ہیں“ اس بد نصیب باپ نے ٹیوپی کو کوئی ہمدرد انسان سمجھ کر ایک آچی ا۔ سے دے دیا۔ دو منٹ بعد اسے نہ بہرہ و انسان نظر آیا نہ اپنا آچی کیس۔

جیدا اپنے روپ میں آگیا تھا۔ جیدا جیب کترا۔ وہ چونکا اٹھا تھا اس لیے کوئی موٹی آسامی دیکھ رہا تھا۔ اسے ایک فیشن ایبل عورت چینی چلائی، بھاگتی نظر آئی۔ ایک فائر بریگیڈ کے افسر کے سامنے جا کے دھاریں مار رہا کر رونے لگی۔ وہ اُسے بازو سے پکڑ کھینچ رہی تھی جیدا ان سے دور نہیں تھا۔ وہ اوپر قریب ہو گیا۔

جیدا کی تجربہ کار نگاہوں نے عورت کا ہاتھ لے لیا۔ وہ زیورات پہنے ہوئے تھی جیدا نے حساب لگا لیا کہ اُس کے گلے کا ہار پونڈ پاسے کا ہے اور ایک ہزار کی مالیت کا ہوگا۔ کانوں کے مندرے ٹھانی تین سو کے اور تین انگوٹھیاں سو سو روپے کی۔ عورت بجاتے خود ہی نہیں تھی عجب جس کے لگ بھگ تھی اور قربت مزدول تھا۔ اس قیامت میں کسی عورت کا دلینا شکل نہیں تھا لیکن جیدا کی نظر زیورات پر تھی۔ عورت رو رو کر بلکان ہو رہی تھی اور وہ فائر بریگیڈ کے افسر کے گلے میں مابین ڈالے اُسے کھینچ رہی تھی۔ افسر اُسے پر سے دھکیل رہا تھا۔ جیدا ڈرا اور قریب ہو گیا۔

”خدا کے لیے میرا بچہ نکال لاؤ۔ عورت چیخ رہی تھی۔“ اس سامنے والے کمرے میں سو رہا تھا۔ خدا کی راہ میں میرے بچے کو نکال لاؤ۔

”معتزہ!..... فرادیکھتے تو۔“ افسر نے کہا۔ ”بھجاب تک....“ عورت نے ایک کرا اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ”نہیں! یوں نہ کہو۔ ایک ہزار روپیہ انعام دیں گی کسی آدمی سے کہو.... میرا بچہ زندہ ہوگا۔ آپ اُسے نکال سکتے ہیں۔“

جیدا اور قریب ہو گیا۔ ایک آدمی دوڑا آیا۔ وہ اس عورت کا خاوند تھا۔ وہ بھی رو رہا تھا۔

”غیر صبر کرو۔“ اُس نے عورت کو کندھے سے تھام کھر پرے لے جاتے ہوئے کہا۔ ”جو ہونا تھا ہو چکا۔“

عورت پاگل ہوئی جاری تھی، خاوند کے گلے لگتی کبھی افسر کی طرف لپکتی مگر فائر بریگیڈ کا افسر کی جان بچانے کے مزد میں نہیں تھا نہ وہ گھبرا ہوا تھا نہ اُس کی حرکات میں کسی قسم کی سرگرمی یا ضرر ہی نہ تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ آگ اُس کے چار انجنوں کے بس سے نکل گئی ہے۔

”کیوں صاحب!۔“ کسی نے اُس سے پوچھا۔ ”اور انجنیں آ رہے ہیں؟ اس طرح تو شہر جل جائیگا۔“ آرمی، نیوی اور ایئر فورس کے خاتر فائلنگ سکواڈ آ رہے ہیں۔ گھبراہٹ نہیں۔“

خاوند اپنی بیوی کو گھسیٹنے لگا مگر وہ عمارت کی طرف بھاگتی اور چینی چلائی تھی اور اپنے بچے کو پکارتی تھی۔ ”کیا ماں ہے بھائی!۔“ جیدا نے اس عورت کے خاوند سے پوچھا۔

”دوسال کی عمر کا بچہ کمرے میں سویا رہ گیا ہے۔“ خاوند نے جواب دیا اور اُس کی سسکیاں لگتیں۔ ”اُس سامنے والے کمرے میں۔“ عورت نے کہا۔ ”وہ سامنے دوسری منزل پر۔“ اب

اُس کی آواز بھی ٹھنکتی جاری تھی۔ اُس نے جیدا کے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بڑی زور سے بولی۔ ”میرا بچہ.... میرے بھائی! امیر لال! بل رہا ہوگا۔ میرا لال!.... میرا لال!“

جیدا اور ذرا سی دیر پہلے اُس کے زیورات کی اور اس کے جسم کی قیمت کا حساب لگا رہا تھا، یوں محسوس کرنے لگا جیسے اُس کی اپنی مال اسے پکار رہی ہے اور وہ جل رہا ہے اُس کے پاؤں تلے زمین یوں جل گئی جیسے زلزلہ آیا ہو۔ اسے ایک ثانیہ کے لیے اپنی مال یاد آئی اور اس کے وجود میں آگ لگ گئی۔

ہر طرف وہ شور و غوغا تھا کہ کانوں بڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دو اور انجن پہنچ گئے مگر جیدا اس قدر تیز تھی کراگ پانی کے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔

جیدا کو فائر بریگیڈ کی سیڑھی بڑی نظر آئی۔ اُس نے بچے کی مال سے کہا۔ ”ہیں ٹھہرو۔“ اُس نے بلڈنگ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”وہ فلیٹ بتایا ہے؟ دوسری منزل پر؟“

”ہاں!۔“ عورت نے جواب دیا۔ ”وہ بالکونی والا دروازہ۔“ وہ فائر بریگیڈ والوں کی آہنی سیڑھی کی طرف دوڑا جس ٹرک پر بیکار بڑی تھی۔ عورت کا خاوند اُس کے پیچھے گیا اور اُس سے کہا۔ ”کیا کمرے ہو؟.... کیا میری بیوی نے تمہیں انعام کا لالچ دیا ہے؟“

نہ بنو آگ اور پہنچ جی ہے آگ نہ جانا۔ جیدا نے اُسے گھور کر دیکھا اور سیڑھی گھسیٹ کر لے گیا۔ اُس نے سیڑھی اوپر کی تو بالکونی تک پہنچ گئی۔ فائر بریگیڈ کے دو آدمی اُس کی طرف دوڑے مگر جیدا اُمتی نہیں پاگل ہو چکا تھا۔ اس قسم کے نفسیاتی محسوس انتہا پسند جو کرتے ہیں۔ ان کا اچھا کام بھی انہارل حالت میں ہوتا ہے اور اچھا۔

فائر بریگیڈ کے آدمیوں کے پیچھے تک وہ سیڑھی پر چڑھ کر بالکونی تک پہنچ چکا تھا۔ اس طرف اس بلڈنگ سے کوئی شعلہ باہر نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا کمرے آگ سے محفوظ ہیں۔ جیدا نے مندرے سے کودھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ جیدا نے کواڑوں پر لائیں ماریں۔ زور زور سے کندھے سے ٹھکریں ماریں۔ ایک کواڑ ٹوٹ گیا۔ جیدا نے اپنے جسم کی طاقت چھٹی نہیں آزمائی تھی۔ اُسے پہلی بار

تک گیا۔ جھک کے دیکھا۔ اس طرف بازار کی گلی تھی۔ دوسری طرف جاکے دیکھا۔ اس طرف بھی بازار کی گلی تھی۔ وہ جھک کر تیسری طرف گیا۔ یہ بھی گلی تھی۔ یہ عمارت چاروں طرف سے کسی عمارت کے ساتھ ملی ہوئی نہیں تھی۔ جیدانے اوپر دیکھا۔ اوپر آسمان تھا۔

فائر آئینوں کی ٹن ٹن، پانی پھینکنے کی آوازیں اور لوگوں کا شور و غوغا کانوں کے پردے پہاڑا تھا۔ جیدانے ایک دفعہ پھر چاروں منڈیوں کا جائزہ لیا۔ لیکن بے سود۔ سچے کامر ٹول رہا تھا۔ وہ اب نزع کے وقت کی سی چکیاں لینے لگا تھا۔ جیدانے غرپ اٹھا۔

اسے ایک ہی راستہ سوچا کہ کوئی نیچے سے رستہ پھینکے اور وہ رستے کا سر اُھیل سے ماندھ کے نیچے اتر جائے لیکن شعلوں نے اب تمام عمارت کو ہر طرف سے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ رستے کا اوپر آنا ناممکن تھا۔ وہ شعل کی طرف منڈی تک گیا۔ نیچے دیکھا تو ایک شعلے نے لپک کر اُسے جھلا دیا۔ وہ پیچھے ہٹا اور سامنے دیکھا۔

اس کا ڈوبتا بتوال سنہل گیا۔ اسید کی ایک کون چمکی اور جیدانے ایک بار پھر آنکھیں سیکڑ کر دھتیں میں سے دیکھا۔ سامنے شعل کے اُس بارفٹ پاتھ پر ایک پرانا اور گھنا دخت تھا جو شعل کے اوپر پھیلنے پھیلنے جلتی ہوئی عمارت سے پانچ چھ گز تک پہنچا ہوا تھا۔ یہی ایک راستہ تھا۔

جیدانے ایک ایسا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا جو خوشی کا فیصلہ تھا لیکن بچ بچنے کی آخری کوشش یہی ہو سکتی تھی اس نے سوچ لیا تھا کہ اس چھتری نما دخت کی ٹنیاں شاید اُس کا وزن نہ سہا سکیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ منڈیوں سے کوڑ کر دخت کی ٹنیاں تک پہنچ ہی نہ سکے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ آگ بے قابو ہو چکی ہے جسے چھت لوہے کی طرح تپ رہی ہے اور اگر نہ ہی والی ہے جل کے مر جانے سے تو یہی بہتر ہے کہ وہ ٹوڑ جائے۔ اگر دخت تک نہ بھی پہنچ سکے تو وہ شعل پر گر کر مرنے لگے گا لیکن پھر شاید اس کے اوپر گرے اور بچ جائے۔

اس نے اور کچھ سوچے بغیر تفصیل کو لاتوں سے کرا کر کڑ بھر چڑا راستہ بنا لیا۔ وہیں کہیں قدم پیچھے آیا۔ پچھے کو پیچھے پر بٹھا اُس کے بازو اپنی گردن کے گڑے غریبے اور چاروں پچھے پر ڈال کے چادر کے سرے اپنے سینے کے آگے باندھ لیے۔ پھر چادر میں لپٹ گیا۔ جیدانے تین ارا چھلا، پھر پچھے کو ماتھ لگا کر محسوس کیا کہ گٹھ کو دیکھا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ کچھ مضبوط بندھا ہوا ہے تو وہ دوڑ پڑا۔

اُس نے رفتار تیزی تیزی کی کہ بہت جیسے قدم کا فاصلہ ایک جھپکتے طے کر لیا۔ جیدانے آخری قدم منڈی پر پڑا جہاں سے اُس نے تفصیل کرائی تھی اور وہ جسم کا تمام زور لگا کر جہاں آگے کو بندھ ہو گیا۔ بازو آگے

پھیلائے جیسے اڑتا ہو۔ اور دوسرے لمحہ وہ دخت کی گھنٹی شاخوں پر جا پڑا۔

جیدانے وزن سے ٹنیاں ٹوٹنے لگیں۔ اُس نے چند ایک ٹنیاں مضبوطی سے پڑائیں اور نیچے والی ٹنیاں پر پاؤں رکھے۔ اس طرح وہ شاخوں کو تھامتا، سر کچا بڑے ٹن سے تک پہنچ گیا۔

فائر بریگیڈ کے آدمی مصروف تھے۔ جہم میں سے دو چار آدمی دوڑے اور فائر بریگیڈ کی ایک ٹریجر گھسیٹ کر دخت کے ساتھ لگا دی۔ جیدانے ٹریجر پر پاؤں رکھتا نیچے آگیا۔ اُس نے سب سے پہلے پچھے کو چادر سے نکال کر دیکھا۔ پچھے صبح و سلامت تھا۔

پچھے کی مال رو رو کے ہلکان ہو رہی تھی اور ابھی تک اُس دروازے پر نظریں جمائے ہوئے

تھی جس میں جیدانے غائب ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھوں پر دو ٹپہ پھیلا رکھا تھا اور ابھی تک خدا سے اپنا بچہ مانگ رہی تھی۔ اُس کے خاندان نے اُسے ایک بار غصے سے کہا تھا۔ ”تُو نے ایک آدمی کو زندہ جلا ڈالا ہے۔“

مجرماں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اُس نے خاندان کی طرف دھیان نہ دیا۔ اُس کے خاندان نے ایک آدمی کو پلڑنگ کی منڈی سے اڑ کر درخت پر آتے دیکھا تھا۔ پھر اُس نے جیدانے کے کندھے سے اپنا بچہ لگا دیکھا تو وہ دوڑا گیا۔ پچھے کی مال سے کسی نے کہا۔ ”وہ دیکھو۔ وہ آدمی ایک بچے کو نکال لایا ہے۔“

مال دوڑی گئی۔ اُس نے اپنے پچھے کو بچا لیا اور اُسے جیدانے سے نوح کریشنے سے لگا لیا۔ پچھے کا باپ جیدانے سے بغل گیر ہو گیا۔ ایک جہم جیدانے پر لوٹ پڑا۔ کوئی ماتھ ملا رہا تھا، کوئی میٹھ چھکارا تھا۔ کوئی گلے لگنے کو لپک رہا تھا اور بتوں نے دور سے ہی مرجھا، زندہ باد اور آفرین کہ کر داد دے لی۔

جیدانے جہم میں یوں کھڑا تھا جیسے اپنے گرد پیش کا ہوش ہی نہ تھا۔ مال نے پچھے باپ کے حوالے کیا اور گلے کا ہار اٹا کر جیدانے کے ماتھ میں دے دیا اور بولی۔ ”میرے پیارے بھائی! یہ قبول کرلو۔“

جیدانے اپنے ماتھ میں سونے کا ٹرکھ کر چوٹک اٹھا۔ اُس نے عورت کی طرف دیکھا، پھر ہار کو دیکھا اُس نے آگے بڑھ کر ہار پچھے کے گلے میں ڈال دیا اور جہم کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ عورت اس کی طرف نہ لگی۔ اُس کے خاندان نے بھی کہا۔ ”لے جاؤ بھائی! ہم اُجرت نہیں دے رہے۔ یہ تمہارا عالم ہے۔“ لیکن جیدانے کہیں گم ہو چکا تھا۔

ادھر وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوا۔ ادھر فائر بریگیڈ کی ٹن ٹن بیکار کی تھم گئی۔ جہم میں ٹرکھ لپک گئی۔ لوگ ایک دوسرے کو روندتے بھاگ لگے۔ فائر آئین جہم کو منڈیا بھاگنے لگے۔ دلوں کو بلا دینے والی خوفناک گھڑا سہٹ سے عمارت کی سامنے والی دیوار زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ تین منزلیں عمارت کی دیوار کی بلندی معمولی نہیں تھی چھتیں بھی گرنے لگیں اور آگ دور دور تک پھیلنے لگی۔

اب بتاؤ۔

”کیا تاؤل ناز!۔ جیدانے اٹھڑے اٹھڑے سے بچے میں کہا۔ کسی کے ساتھ لڑائی نہیں ہوتی۔۔۔ ایک ایسی بات ہوگئی ہے۔۔۔ ایسی بات۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ کوئی اور تھا۔ میں ایسا ہمارے نہیں گناہگار اور مجرم بہادر نہیں ہوا کرتے۔۔۔“

”کچھ سناؤ تو سہی۔۔۔ ناز نے کہا۔“ ایسی کون سی بات ہوگئی ہے؟“
جیدانے ناز کو سارا واقعہ سن دیا لیکن اس کے سامنے کے انداز میں ڈرنا تھا اور ڈر کی بات ہے خود ستائی کی لمبی سی بھی جھٹکتا نہیں تھی، بلکہ وہ حیران ہوا جا رہا تھا کہ وہ کیا کر گزرا ہے۔ وہ ناز سے پوچھنے لگا تھا کہ وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا لیکن ناز نے اسے سہمت نہ دی اور دلوانہ وار اس سے پلٹ گئی۔ اس کے گالوں کو چوما، پسینے سے جڑے ہوئے بالوں کو چوما۔ جیدانے تاب ہو گیا اور اس نے بازو ناز کی کمر کے گرد لپیٹ لیے۔

اُسے یوں لگا جیسے وہ ایک بار پھر جلتے ہوئے مکان میں پھنس گیا ہو۔ ناز کے بازو دل میں اُس کا انگ انگ جلتے لگا۔ اُس کی آنکھیں نیم داغیں جیسے اس پر بے خودی طاری تھی۔ ناز کے آنسو بہنے لگے۔ بولی۔ ”جیدانے! میں بھی تو جل رہی ہوں، تمہاری ہی لگائی ہوئی آگ میں جل رہی ہوں خدا کے لیے بتاؤ اس آگ سے کب نکالو گے؟“
جیدانے کچھ جواب دیتے بغیر اس کا گال اپنے گال سے لگا لیا۔

دوسرے کمرے سے بچے کے رونے کی آواز آئی تو ناز نے دھیان نہ دیا لیکن خبیانچہک اٹھا، کرسی سے اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

بچہ جیدانے کو کھٹی کھٹی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ اس کے چیلے سے ٹوڑتا تھا۔
”بھوت بنے ہوئے ہو۔ ناز نے منہس کر کہا۔ ”ہٹو! امیرے ٹھٹھے کو ڈرا دیا۔“

جیدانے بچے کو اٹھایا تو ناز نے بچہ اس سے لے لیا۔

”میں دیکھتی ہوں، پانی گرم ہو گیا ہوگا۔“ ناز نے کہا۔ ”تم پہلے نہاؤ پھر مہم ٹی کر آؤ۔۔۔ دکھاؤ تو ٹانگ کتنی کچھ جل گئی ہے۔“ اس نے جھک کر جیدانے کی ٹانگ دیکھی۔ ٹخنے کے قریب خاصا بڑا زخم تھا۔ بچہ جھوک سے مناب ہو رہا تھا۔ ناز باورچی خانے میں چلی گئی۔

لڑکے نے جیدانے کو آگے بتایا کہ اُس نے غصا خانے میں گرم پانی رکھ دیا ہے۔ جیدانے غصا خانے میں جا کر صرف منہ ہاتھ دھویا اور آگے قہقہے اور پاجامہ بدلایا۔ اس کے ذہن میں اندھی سے پہلے کا سکوت تھا۔ اُسے جیسے نہ وہ آگ باجی جس میں سے وہ ایک بچے کو زندہ نکال لایا تھا نہ یہ آگ جا بھی ابھی ناز نے اس کی داخلی دنیا میں لگا دی تھی

وہ کرسی پر جا بیٹھا۔ سگریٹ منہ میں لیا اور ماچس جلاتی۔ جب جلتی ہوئی دیاسلائی اُس کی آنکھوں کے قریب آئی تو ذرا سی ٹوہنیٹ جلد بن گئی اور دوسرے ہی ثانیے جیدانے کو سر شعلے ہی شعلے نظر آنے لگے۔ اس نے چونک کر دیاسلائی پر سے کھڑکی دیاسلائی تو کچھ گئی لیکن شعلے پھیلنے اور غراتے ہی رہے۔ اس کے ذہن میں ایک مکان جل رہا تھا۔ شعلوں نے میکیوں کے نکل بھاگنے کے تمام راستے بند کر رکھے تھے۔

ناز بچے کو شکر باروچی خانے کی طرف جاری تھی کہ جیدانے اس کا حال علیہ اور رنگ روپ دیکھا تو جھٹکا اس کی طرف دوڑی۔

جیدانے قہقہے کیوں سے پھٹا ہوتی اور پتلون نہا پاجامہ ٹخنوں کے قریب سے جلا ہوا تھا۔ قہقہے اور پاجامے پر سیاہ اور سبز رنگ کے داغ دھبے تھے۔ چہرہ کالا ہو گیا تھا۔ لال سرخ اور سوجی ہوئی۔ بال پسینے سے جڑے ہوئے اور سر سے دانتیں کان کے پیچھے سے خون ٹپک رہا تھا اور اس کی چال ٹھال بھی بدلی ہوئی تھی۔ ناز کچھ کہہ کر کسی سے لڑا کر آیا ہے۔
”یہ کیا علیہ بنا رہا ہے؟۔۔۔ ناز نے پوچھا۔

جیدانے جواب دیتے بغیر کمرے میں چلا گیا۔ ناز نے لڑکے کو پانی گرم کرنے کے لیے کہا اور خود کمرے میں گئی جیدانے سر جھکاتے ٹھل رہا تھا۔ ناز نے اُسے بلایا تو بھی وہ کسی کھری سوج میں غرق رہا۔
”آخر معاملہ کیا ہے؟۔۔۔ ناز نے جھٹکا کر کہا۔ آج کوئی نئی لڑائی تو نہیں لڑی تم نے کہیں ٹھٹھے اور پو کے ساتھ ہی تو جھڑپ نہیں ہوگئی؟“

”نہیں لڑائی تو نہیں ہوئی۔“ جیدانے ایسے لہجے میں کہا جو اُس کا اپنا اجہ نہیں تھا۔ اُس کی زبان جیسے اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”ہاں میں آگ لگ گئی تھی۔ ایک بچہ جلتے مکان میں رہ گیا تھا۔ اس کی ماں سڑک پر کھڑی رو رو کر بڑا حال کر رہی تھی۔ میں گیا اور جلتے مکان میں سے بچے کو زندہ نکال لیا۔“

جیدانے اس قدر عظیم کارنامہ یوں سنا ڈالا جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ وہ کمرے میں گیا اور بچے کو اٹھا لیا۔

ناز خاموش کھڑی سن رہی تھی۔

جیدانے ٹخنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے یہاں سے ٹانگ جل گئی ہے۔۔۔ بچے کی ماں عجیب بے وقوف عورت تھی۔ اتنا قیمتی ہار گلے سے اتار کر مجھے دے دیا۔“
”اُس نے ہاتھیں دے دیا؟۔۔۔ ناز نے پوچھا۔ کھانا ہے وہ ڈار؟“
”اُسی کے بچے کے گلے میں ڈال آیا ہوں۔“ جیدانے جواب دیا۔

”معلوم ہوتا ہے آج شرب یا چرس کی بجائے گا بنائی کو آئے ہو۔“ ناز نے کہا۔ ”اور نشتے کی حالت میں لڑائی مار کھائی کی کوئی فلم دیکھ آئے ہو۔“

اُس نے ناز کی طرف دیکھا۔ ایک تو اس کے چہرے پر سیاہ دھبے تھے اور آنکھیں لال اور سوجی ہوئی تھیں، دوسرے کچھ ایسے تاثرات اُس کے چہرے پر آگئے تھے جو جیدانے جیسے جرائم پیشہ انسان کے لیے اجنبی سے لگتے تھے۔ اُس پر جیسے خوف سا بھی طاری تھا۔ کچھ بھی تھا۔ ناز کے لیے اُن کو کھتا تھا۔ جیدانے کو اُس نے جہانی طور پر بھی اور ذہنی کھانا سے بھی اس حالت میں کچھ نہیں دیکھا تھا۔

”تمہیں ہو گیا ہے جیدانے؟۔۔۔ ناز نے جھٹکا کر کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔۔۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔۔۔“

جیدانے سر کو جھٹکا دیا، لیکن آگ کا قطر جھپٹا ہی چلا گیا۔ ایک آج کی آگ کو اس نے ایک بچے کی خاطر اپنی جان شعلوں کے سپرد کر دی تھی، اور ایک اس کے ذہن میں لگی ہوئی آگ..... برسوں پرانی جس میں اس نے ایک آدمی اور اس کے دو بچے جلا ڈالے تھے۔

اس کے ذہن میں آتش فشاں پہاڑ جھٹکنے لگا۔ اسے برسوں پرانی، اپنے ہاتھوں لگائی ہوئی ایک آگ یاد آگئی، کراچی آنے سے چند سال پہلے اس نے ممبئی میں ایک مکان میں نصف شب کو آگ لگائی تھی، پیشتر اس کے کمر گھروالے نکل جھٹکے شعلوں نے دروازوں اور کھڑکیوں کو لپیٹ دیں لے کر جھٹکنے کے رستے بند کر دیتے تھے۔ ایک قیامت بپا کر کے جیدا لگ کھڑا جلتے ہوئے ایک آدمی، ایک عورت اور دو بچوں کی دلدور چھین سنا رہا تھا شعلوں نے ان بچوں کو بھی خاموش کر دیا تو جیدا جا کے اطمینان کی گہری فیند سو گیا تھا۔ دوسری صبح اس نے جھلسی ہوئی لاشیں دیکھیں تو اس کے رگ دریشیں ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی۔ انتقام کی آگ سمجھتی تھی۔ اس آدمی نے اس کے اُستاد کے خلاف گواہی دی تھی۔ یہ آدمی اپنے دو بچوں کے ساتھ چل گیا اور اس کی بیوی بچہ گئی تھی۔

رسول پرانی اس آتشزدگی کو وہ بھی کا بھول چکا تھا لیکن آج دیاسلاتی نے پابھلی ہوئی ٹانگ نے اس کے ذہن میں وہی شعلے پھر پیدا کر دیے۔ جلتے ہوئے بچوں کی چیخیں اس کی داخلی دنیا میں زلزلے بپا کرنے لگیں، پھر بادلوں کے یہ شعلے اس کا ٹانگ جلا کرنے لگے، ضمیر جھلس کر تڑپنے لگا۔

اس نے درد کی شدید محسوس کی۔ اس کا ماتھ لاشعوری طور پر ٹانگ پر چلا گیا تو اسے خیال آیا کہ آج کی آگ نے اسے جھلسا دیا ہے۔ سینے کی جلن کہیں زیادہ شدید تھی۔ اسے آج پہلی بار محسوس ہوا کہ اس نے ممبئی میں محسوس بچوں کو کس بے دردی سے زندہ جلا ڈالا تھا۔ انتقام تو بڑوں سے لینا تھا۔

وہ اپنے آپ میں تڑپ اٹھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے ضمیر میں ایک کانٹا چھبنا ہوا ہے جو اسے اب جینے نہ دے گا، شاید مرنے بھی نہ دے۔ جیچیں اس نے آج پہلی بار محسوس کی جیسے اُن جلتے ہوئے بچوں کے جسموں کا درد اُسی کے جگر میں سمٹ آیا ہے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور باہر پھل پڑا۔ وہ دیوانہ سا ہونے لگا اور اسے غصہ بھی آنے لگا تھا۔ اسے اپنی پر غصہ آتا تھا تو اسے اس نے جھوکا مار دیا تھا۔ بادل پر غصہ آتا تھا تو اسے قتل کروا دیا تھا آج اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا تو اپنے آپ سے بھاگ بھی رہا تھا اور اپنے آپ میں ہی پناہ ڈھونڈنے لگا۔ وہ بے چین تھا، بے حال تھا۔

وہ باہر کو چلا تو ناز نے پوچھا "ٹو اکٹر کے پاس چلے؟"

وہ خاموش رہا۔

"بیٹی کرواؤ پھر منالینا طبیعت سنبھل جائے گی۔ ناز نے کہا۔

وہ سر جھٹکے خاموشی سے باہر نکل گیا چہرے کے تاثرات شدید درد کے آئینہ دار تھے۔

ناز بہت خوش تھی جیدانے آج اسے نگے لگا لیا تھا۔ وہ ایسے خوش تھی جیسے منزل اس کے استقبال کو آگے بڑھ آئی ہو لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی منزل بل رہی تھی۔

جیدا فٹ پاتھ پر سر جھٹکا نہ چلا جا رہا تھا۔ وہ رہ رہ کے جھکے ہوئے سر کو جھٹک کر اس آگ کی یاد کو اگلنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس نے ممبئی میں لگائی تھی لیکن آج ساری کراچی میں آگ ہی بکری کا مروضہ تھا۔ اس کے پاس سے جو گزرتا تھا آگ کی ہی باتیں کرتا گزرتا تھا۔

"بڑی زور کی آگ ہے"

"ابھی تک سنبھل رہی ہے"

"جانے کتنے لوگ جل گئے ہیں"

"ایسی آگ کبھی سنی تھی نہ دیکھی تھی"

"اپنے گاہروں کا تہجر ہے"

"اللہ کا قہر ہے"

"آگ.... آگ.... آگ"

جیدا شعلوں کی لپیٹ میں چلتا ہی گیا۔ وہ جھنجھلا اٹھا خیال آیا کسی آڈے پر جا کے چرس کے دوش لگے یا تخیل کی بی لے کہ باہر کی دنیا کی آوازوں سے بیگانہ ہو جائے لیکن چرس آدوہ کی بی لے کے تصور سے لے متلی سی آنے لگی جیسے اس بوئیں اسے جلی ہوئی لاشوں کی بو آنے لگی تھی۔

بے چینی اور خیالوں کی افلا تھی بڑھتی چلی گئی۔ اس نے بالی کے گھر کا رخ کیا اور بالی کے دل فریب جسم کے تصور میں پناہ ڈھونڈنے لگا مگر تصور کھڑا تو یہ ناز کا تھا۔ ناز کی تشنہ سی مسکراہٹ، جذبات سے بھرپور جسم اس کی طرف بڑھ رہا تھا جیدا کو یوں لگا جیسے اس کے بازو ناز کو سینے سے لگا لینے کو بڑھ رہے ہوں۔ بالی کا گناہ مجرمہ جسم ناز کی مسکراہٹ میں ایسا چھپا کہ ابھر نہ سکا۔ جیدا کو بھی کا خیال آیا سوچا آج کی رات اس کے ہاں کھڑا آتے، شاید کچھ قرار آجائے، اس کے قدم رکھنے لگے لیکن ناز نے مسکرا کر اس کی راہ روک لی۔ بچے نے لپک کر اس کے دل کو دبوچ لیا اور جیدا تیز قدم چل پڑا۔

ناز اور بچے کے خیال نے اس کی جلن ٹھنڈی کر دی تھی لیکن شعلے پھر پھل اُٹھے۔ اسے اپنے جسم سے بدلو کے بھجھو کے اٹھتے محسوس ہوتے اور ساتھ ہی یہ احساس کہ یہ جسم ناز کے قابل نہیں اور ہونٹ بچے کا سمنہ چومنے کے قابل نہیں۔ اسے یوں لگا جیسے ناز اور بچہ اسے سچ چھ کر رہے ہوں۔ "تم پاپی ہو، ظالم اور دوڑنی ہو۔ ہمارے قریب مت آؤ، ہمارے جسم سے جلے ہوئے بچوں کی بو آتی ہے۔" وہ رگ گیا جھنجھلاہٹ اور غصے سے وہ دیوانہ ہونے لگا ضمیر اس کے سامنے منگناج رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ آگ ابھی تک لگی ہوئی ہے جل کے اسی میں خود جاتے یا کسی کا خون خروے یا ہر کسی کو آگ میں پھینک دے اور اس دنیا میں اکیلا رہ جائے۔

اس نے بہت کچھ سوچا مگر اس کی سوچ اور پھر ایک تلخ احساس غالب آ گیا کہ اس کا زہر چوس لیا گیا ہے۔ اب وہ کسی کا خون نہ ہاسکے گا۔ اس نے اپنے آپ میں زبردستی محسوس کی اور وہ خوفزدہ سا ہو گیا۔ زہر پہلے ناک نے ڈمک مارنے کو چھین تو پھیلا لیا مگر ڈمک میں زہر نہیں تھا۔ وہ بچہ کے رہ گیا اور سر جھٹکا کے چل دیا۔

"کراچی جل رہا ہے...."

جیڈا چپک اٹھا، سر اٹھا کے دیکھا۔ دو آدمی آگ کی باتیں کرتے جا رہے تھے۔ اس نے چاہا کہ بڑھ کے اپنی کانگھونٹ دے۔

”ابھی کچھ نہیں“ — ایک اور آدمی کشتابو اقریب سے گزر گیا۔

جیڈا کیوں لگا جیسے کسی نے اس کے کان میں طنز آواز میں کہہ دیا ہو — ”یہ آگ تم نے لگائی تھی۔“

پچھتم نے جلاستے تھے۔

وہ بھاگنے کی رفتار سے چل پڑا کس سمت؟ اُسے معلوم نہ تھا۔ وہ چلا ہی جا رہا تھا جیسے کوئی اُس کا تعاقب کر رہا ہو۔

اس سرنگی میں، پسینے میں شزلو، باہمی سانسوں کو سننے والے کی کوشش کرتا وہ ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ صحن چمڑا گیا اور ایک گھر سے میں جا پہنچا۔

”آؤ بیٹا! — ایک پیاز بھری بوڑھی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

جیڈا نے پچھتی پچھتی نظروں سے مرعوف دیکھا اور بے بس ہو کر دوڑا لو گر پڑا۔

”بابا جان! — وہ سسے ہوتے لہجے میں بولا۔“ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میرا زہن کہاں ہے؟

بوڑھے موسیقار نے اُسے کندھوں سے تھام کر دیکھا۔ اس کے کان کے پیچھے خون گھس گیا تھا۔

شک ہوا کہ سر پرچٹ آنے سے دماغ موقوف ہو گیا ہے۔

”جیڈا! بوڑھے نے جیڈا کو کندھوں سے تھمھوڑا اور کہا — ”جیڈا بیٹا!

”کہو بابا! سن رہا ہوں۔“ جیڈا کی آواز گہری لکائی سے آتی معلوم ہوتی تھی۔

”کیا کر آئے آج؟ — بوڑھے نے پوچھا۔“ لڑائی جھگڑا ہو گیا کسی سے؟

”نہیں۔“ جیڈا نے کہا اور آگ میں سے بچہ نکال لانے کی تمام تر تفصیلات سنا دیں اور یہی سنا دیا کہ اس کے بعد اس کی ذہنی حالت کیا ہو گئی ہے۔ اس نے بابا کو بمبئی والی آگ کی واردات بھی سنا ڈالی۔

جیڈا چپ ہو گیا۔ چہرے پر گہری اداسی چھا گئی۔ دکھ سے لہریز لہجے میں بولا — ”اب میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔“ کاش! میں ناکو غریب کے یوں گھر پر نہ لکھ لیتا جس کام کے لیے خریدی تھی اسی پر چلا دیتا۔ کاش! میں کسی کا بچہ یوں گود نہ لیتا کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیتا۔“ اُس نے آہی اور بولا — ”بابا! وہ بھول گھڑی تھی جب میں تمہارے ہال پہلی بار آیا تھا اور تم نے مجھے جیڈا کہا تھا۔ تم مجھے یوں پیار سے بیٹا نہ کہتے۔

... ہم تینوں کے پیار نے میرا زہن جوں لیا ہے۔ میں بھنگ گیا ہوں۔ یہ محبت میرے لیے نہیں، میں محبت کے لیے نہیں۔ میں غنڈہ ہوں، چر ہوں، غولی ہوں۔“

”اپنے آپ کیوں بے حال نہ کرو بیٹا! — بوڑھے نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا —

”تمہارے دل نے محبت کو قبول کر لیا ہے۔ یہ حقیقت تمہیں انوکھی سی لگ رہی ہے کیونکہ تم اس جذبے سے برگلاؤ رہے ہو۔ اب ایک جذبت سے غنڈہ گودی سے نکل آؤ اور ناز اور پچھتم کو لے کر کسی گوشے میں آباد ہو جاؤ۔“

”یہ ناممکن ہے بابا جان!

”کیوں ناممکن ہے؟

”اب میں اس حقیقت کو چھپا نہیں سکتا کہ مجھے ناز سے محبت ہے اور مجھے پچھتم سے پیار ہے۔“

— جیڈا نے تلخ سا گھونٹ نگل کر کہا — ”میں اب ان کی خاطر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ ان کی محبت نے اور میرے گناہوں نے مجھے ڈس لیا ہے۔ میرا جسم بھی اور دماغ بھی بریکار ہو گیا ہے۔ آج ایک پچھتم کو آگ سے نکالا تو میرے سینے میں وہ آگ بیدار ہو گئی جو برسوں گزرے میں نے لگائی تھی اور ایک آدمی اور دو بچوں کو زندہ جلا ڈالا تھا۔ ان مصہوموں کی رو میں جیسے آج کی آگ کے شعلوں میں بھیجی تھیں اور انہوں نے میری روح کو لو لہان کر دیا ہے۔“ جیڈا کے جسم نے جھجھکی لی اور جیسے اپنے آپ میں لرزنا اٹھا ہو۔ بولا — ”لیکن میں اب نازا اور پچھتم کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ میں ان کے قابل نہیں۔ میں اس قدر بزدل ہو گیا ہوں کہ اپنے شاگردوں کے سامنے بھی نہ جا سکوں گا۔“

اس کے چہرے کا تاثر یک سخت بدل گیا۔ آنکھیں کھیں دور دیکھ رہی تھیں اور ہونٹوں پر لمبی سی لرزش تھی۔ وہ خیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا — ”میں طوفان میں گھر گیا ہوں بابا! کوئی راہ نہیں۔“

جیڈا کی آواز لرز کے خاموش ہو گئی۔ بابا اس کی بدلتی ہوئی ذہنی کیفیت کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ کیا کرے کہ جیڈا نے کبھی کی سی تیزی سے پتوں ناپا جاسے کی جیسے بڑا سارا چاقو نکالا کھولا اور چاقو اوپر کر کے کہا —

”بابا جان! ایک ہی راہ ہے۔ میں جا رہا ہوں۔“

اُس نے بازو لمبا کیا اور چاقو کی نوک اپنے سینے کی طرف کر کے چاقو کھینچا۔ چاقو اور اس کے سینے میں صرف ایک سانس، صرف ایک ثانیہ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ بابا لول تڑپا جیسے چاقو اُس کے

اپنے سینے میں پرست ہو رہا ہو۔ سوچنے کا وقت نہ تھا۔ اٹھ کر جیڈا کے ہاتھ پکڑ لینے کا وقت نہ تھا۔ اُس کے پاس سنار کھینچتی تھی۔ اُس نے پلک جھپکتے سنار اٹھائی اور ایک کر جیڈا کے سینے پر رکھ دی۔

چاقو سنار کے تونے میں گھس گیا۔ بوڑھے نے سنار کھینچی تو چاقو سنار کے ساتھ ہی چلا آیا۔ دوسرے ہی ثانیہ وہ اچھل کے اٹھا اور سنار پر سے پھینک کر جیڈا کے منہ پر زناٹے دار دو تھپڑ مارے۔ ایک اس

گال پر ایک اُس گال پر اور چلا کر کہا — ”میں تمہیں مرنے نہ دوں گا۔“ اور پیشتر اس کے کہ جیڈا نہ بھٹکا اُس نے جیڈا کو سینے سے لگا کر زور سے پھینچا اور اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ کر طویل بوسہ لیا۔

بابا جیڈا کو سینے سے لگاتے پلنگ پر بیٹھ گیا اور جیڈا اس کے سامنے فرش پر دوڑا لو بیٹھ گیا۔

”جاگ! جیڈا جاگ!“ — بابا نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کے کہا — ”نیکل اس جسم سے ناز تیری راہ دیکھ رہی ہے۔ وہ مصدمہ کچھ تیرے انتظام میں روٹا ہے جس کا کوئی باپ نہیں۔ تو ہی اُس کا باپ ہے۔ میرا کوئی بیٹا نہیں۔ تو ہی میرا بیٹا ہے۔“ بابا کی آواز بھرا گئی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا — ”تو باپ کو ڈھونڈ رہا ہے میں بیٹے کی تلاش میں ہوں۔ جاگ جیڈا! ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پایا ہے۔ آنکھ

کھول کے دیکھ! اترا وہ گھر آباد ہو گیا ہے جسے تیس برس گزرے موت نے اجاڑ دیا تھا۔“

”بابا جان! — جیڈا زار و قطار رو رہا تھا۔ بولا — ”سخت آزمیت میں ہوں۔ ذرا سالیٹ جانے دو۔ میرے منہ پر چادر ڈال دو۔ ذرا ساروں کو کچھ سوچ لوں۔ تم نے مرنے بھی نہ دیا۔“

وہ لیٹ گیا۔ آنسو بہے جا رہے تھے۔ بابا اس کے سر ہانے بیٹھ گیا اور اس کی پیشانی سے ہلانے لگا۔ جیڈا نے یوں محسوس کیا جیسے لرزنا جواب دہ تھا اس کے ضمیر سے گناہوں کا زہر جس رہا ہو اس نے سکون سا محسوس کیا۔

”تم بزدل ہو بیٹا!“ بوڑھے موسیقار نے کہا۔ ”دل والے یوں نہیں مڑا کرتے.... اٹھو، تمھارے زخم دھو کر ان پر کچھ لگا دو، غراب ہو جاؤ گے۔“

میں یہ زخم اپنے ساتھ اسی حالت میں خدا کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ جیہا نے آہ بھر کر کہا۔
”یہ زخم میری ایک نئی کاشتوت ہیں میں خدا سے کہنا چاہتا ہوں کہ ساری عمر کے گناہ مجھ کے ان دو زخموں کے عوض بخش دے.... اب جی کے کیا کروں گا؟“

بوڑھا سنس دیا اور باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک سلاخی تھی اور زخم دھونے کے لیے کپڑا، روٹی اور دوائی بھی تھی۔ اُس نے جیہا کے زخم دیکھے۔ ایک کان کے پیچھے تھا اور ایک ٹخنے کے اوپر یہ جگہ جل رہی تھی اور اس میں سے نمی رسی رہی تھی۔ بوڑھے نے کان کے پیچھے کا زخم صاف کرنا شروع کیا۔

”خدا نے تمہیں بہت بڑا انعام دیا ہے۔“ بوڑھے موسیقار نے زخم صاف کرتے ہوئے کہا۔
”گناہگاروں کو خدا بڑی لمبی ڈھیل دیتا ہے۔ اگر کسی گناہگار کے ہاتھوں خدا کی کاٹنی کام کرا دے تو یہ خدا کا انعام ہوتا ہے.... دنیا میں زیادہ تر لوگ وہ ہیں جو گناہوں میں سکون حاصل کرتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو تمھاری طرح جرم کو زندگی بنالیتے ہیں اور اعلانیر کہتے ہیں کہ وہ گناہگار ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو اپنی شرافت کا ڈھنڈرہ پیٹتے رہتے ہیں لیکن جہاں اپنے فائدے کی خاطر جھوٹ بولنا پڑے، جھوٹ بولتے ہیں۔ دغا اور فریب دیتے ہیں۔ رشوت لیتے ہیں اور نماز روزے کی پابندی بھی کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عبادت کے عوض خدا ان کے گناہ معاف کیے رکھے گا۔ انہیں خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔“

”میں کچھ نہیں سمجھتا بڑے میاں!“ جیہا نے کہا۔ ”میں ہی سمجھتا ہوں کہ مجھ پر ظلم ہوا اور میں ظالم بنا میرے ساتھ بے انصافی ہوئی اور میں نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا۔“
بوڑھا اُس کے کان کا زخم صاف کر کے اس پر دوائی لگا رہا تھا۔ اُس نے جیہا کو کوئی جواب نہ دیا جیہا چپ ہوا تو وہ بھی چپ ہو گیا۔ آخر وہ خاموش ہو گیا۔ بوڑھا چپ رہنے والا آدمی نہیں تھا۔ جیہا نے اُسے دیکھا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو تھے جیہا نے سر اُس سے دوڑ لیا اور اُسے حیرت دیکھنے لگا۔

”تمھاری آنکھوں میں آنسو بابا جان؟“

بوڑھے نے تھکھیلوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ایک روز مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے کبھی مسکراتے ہوئے آنسو اور روتی ہوئی مسکراتیوں دیکھی ہیں؟.... میں نے فتیے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ مسکراتے ہوئے آنسو اور روتی ہوئی مسکراتیوں تم نے بھی کبھی نہیں دیکھیں.... میں آج تمہیں دکھانا چاہتا ہوں۔“

اُس نے جیہا کا سر پکڑ کر اپنے آگے کر لیا اور زخم پر دوائی لگانے لگا۔

”تم نے اپنے دل کی سنائی ہے بیٹا!“ بوڑھے موسیقار نے جیہا کے سامنے بیٹھ کر اُس کے ٹخنے کے زخم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کبھی دوسروں کی بھی سنو.... ہر کوئی کبھی بے بیٹا اب تو وہ وقت آن

لگا ہے کہ جھوٹ بولو تو تم سچے، سچ بولو تو سزا پاؤ۔ قتل میں کر دوں، پھانسی تم پاؤ.... پھر بھی جیہا بیٹے! سچ اور سچی محبت خدا کو عزیز ہے۔ یہ روح کی غذا ہے۔ روح کے لیے جھوٹ اور بدی ویسے ہی ہے جیسے تم اپنے جسم میں شراب اور چرس ڈالتے رہتے ہو جسم اندر سے گل مڑ جاتا ہے۔ اسی طرح روح بھی مریض اور کمزور ہو جاتی ہے۔ اسے سچ اور محبت کی غذا دو تو سندست اور توانا رہتی ہے.... تم مجھے بڑا پیارا انسان کہا کرتے ہو اور کہتے ہو کہ تمہیں سکون میرے پاس آکر ملتا ہے۔ آؤ تمہیں بتاؤں کہ میں نے یہ پیارا سکون کہاں سے حاصل کیا ہے۔“

بوڑھا ستاروں اور جیہا کے سامنے بیٹھ گیا اور اُس کے ٹخنے کا زخم صاف کرنے لگا۔

”میری ماں نے مجھے جنم دیا اور میرا نام لکھا رکھا۔ بوڑھے موسیقار نے کہا۔ ”تین برس بعد شاید میرا دل بھلانے کے لیے یا مجھے ساری عمر تڑپانے کے لیے خدا نے مجھے ایک بہن دی۔ ماں نے اس کا نام شاہدہ بی بی رکھا۔ مجھے بھی سی اس گویا کے ساتھ بہت پیار تھا۔ اُس کی خاطر میں نے ماں کے پاس سوسے کی ضد چھڑا دی اور ماں کی گود بھی کے لیے خالی کر دی۔ ننھی بھوک سے روئی تو میں ماں کو جہاں نہیں دے دیتی پکڑ لانا۔ ماں جی اماں جی اگلی کو دودھ پلاؤ۔ اور ماں سستی سکتا کی گڈی کو گود میں لے کر دودھ پلانے بیٹھ جاتی ہیں دودھ پتی گڈی کے پھول جیسے ہاتھوں سے کھیلنا رہتا....“

”اگلی میری اکلنا بھتیجی ہیں نے اس کے سوا اور کوئی کھلونا نہیں دیکھا جیہا بیٹے اماں نے مجھے بہت پیار دیا ہے لیکن مجھے گڈی سے بہت پیار تھا۔ میرا باپ بہت غریب آدمی تھا لیکن ہمارے گھر میں پیار کا خزانہ تھا۔ باپ بیٹی کی بندرگاہ پر محنت مزدوری کرتا تھا۔ ہم تنگدست تھے لیکن ہمیں تنگدستی بھی بیماری لگتی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میرے ماں باپ آپس میں کبھی لڑے ہوں....“

”ہیں تو برس کا ہو گیا اور گڈی چھ برس کی۔ ایک صبح میرا باپ کام کے لیے گھر سے نکلا اور شام کو واپس نہ آیا۔ رات گزر گئی۔ اگلا دن بھی گزر گیا یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ماں کو پریشان اور بے چین دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس واقعہ کو ساڑھے برس گزر گئے ہیں۔ مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے۔ میری ماں نے مجھے کہا کہ تم اور گڈی گھر کھیلنے رہنا میں تمھارے ابا کو لینے جا رہی ہوں میں نے ماں سے کہا کہ تم جاؤ، میں گڈی کا خیال رکھوں گا میں نے یہ بات جو افرادوں کی طرح کہی تھی....“

”ماں جانے ہی والی تھی کہ میرا باپ آگیا مگر وہ لسان نہیں تھا جیسا گھر سے نکلا تھا۔ اس کے کپڑے خون آلود تھے۔ دانت کبھی سے ہاتھ تک بازو بلیوں میں لپٹا ہوا تھا اور ایک پکڑا گلے سے بندھا تھا جس میں اُس نے بازو ڈال رکھا تھا۔ اُس کا رنگ جو سالو اور اجڑا ہوا تھا، پیلا پڑ گیا تھا۔ ہم سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ باپ نے بتایا کہ جاز پر بہت بڑے بڑے ٹکس چڑھاتے ایک ٹکس ایسا کہ اُس کا بازو اُس کے پیچھے آگیا اور بڑی ٹوٹ گئی۔ اُسے ہسپتال لے گئے۔ اُس کی بڑی جگہ پر کھر کے پٹی باندھ دی گئی اور اگلے روز اُسے ہسپتال سے نکال دیا گیا....“

”لوٹے ہوئے بازو نے باپ کو بہرہ و زنگار کر دیا۔ دو ہی روز بعد گھر میں فاقے ہوئے لگے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک رات میرے ماں باپ یہ سچہ گواہ ہیں باتیں کر رہے تھے کہ میں سو رہا ہوں گڈی سو گئی تھی۔ میں جاگ رہا تھا۔ میری ماں باپ کچھ رہی تھی کہ تم کو کام کرنے سے رہے۔ بچوں کو کھوکھو کا نہیں مارا جاتا تھا میں محنت مزدوری کے لیے باہر نکلتی ہوں میرے باپ نے اُسے کہا۔ نہیں۔ زمانہ غراب ہے تم

حوان ہوا تو بصورت بھی جو بھٹھا رہا باہر جا کر کام کرنا ٹھیک نہیں۔۔۔

”ماں اُسے یقین دلاتی رہی کہ عورت ایمان اور اخلاق کی کچی ہوتی تو دنیا کا ہاتھ توڑ دیتی اُس کا کچھ نہیں بچتا۔ وہ دونوں اس سستے پر باتیں کرتے رہے اور میری آنکھ لگ گئی۔ اگلی صبح ماں کام کے لیے چلی گئی شام کو ایک روپیہ کھالائی پھر وہ بروز کام پر جاتی اور وہیں سواریاں کھالائی۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب روپے کی پوری قیمت ہلا کرتی تھی۔ چار اُنے میں گھر کی دال روٹی چل جایا کرتی تھی۔ دال دو چار اُنے میں ہانڈی روٹی کرتی اور باقی پیسے الگ کھدیتی۔ باپ گھر میں درو سے کراہتا رہتا نہ تکلیف کے باوجود اُس نے مجھے اور لکڑی کو مال کی غیر حاضری محسوس نہ ہوئے دی۔ اس نے ہمیں ماں کا پیار دیا۔۔۔

”دو مہینوں میں ماں نے اتنے پیسے بچائے جن سے باپ کی ٹوٹی ہوئی بڑی جڑوائی جاسکتی تھی۔ ماں اسے ایک جراح کے پاس لے گئی۔ اس نے بڑی بھلائی۔ زخم کی حالت ٹھیک نہیں تھی لیکن جراح نے اسید دلائی کہ زخم بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمارے گھر میں خوشیاں لوٹ آئیں۔ باپ بہت خوش تھا کہ وہ کام کرنے کے قابل ہو جائے گا مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

بوڑھا جو مسیقار جیلا کے شے کے زخم صاف کر کے اس پر ایک پوڈر چھڑک رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”تھرا یہ زخم تو کچھ بھی نہیں۔ میں نے اپنے باپ کے بازو کا زخم دیکھا تھا تو میں کانپ اٹھا تھا۔ میری ماں ہرات اُس کے زخم سے بڑی کھلی، زخم صاف کرتی اور اس پر کوئی دوائی لگاتی تھی۔ آج تھرا یہ زخم دیکھ کر مجھے باپ کا زخم یاد آ گیا ہے۔۔۔ ہم یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ ہمارا باپ ٹھیک ہو جائے گا تو وہ کام پر جایا کرے گا اور مال ہمارے ساتھ گھر رہا کرے گی۔ مگر ایک روز ماں شام کو اُنے کی بجائے دو پہر کو ہی گھر آگئی۔ وہ رو رہی تھی میرا باپ لیٹا ہوا تھا۔ ماں اُس کے اوپر گڑ کچیاں لینے لگی۔۔۔

”میں اور لکڑی بہت چھوٹے تھے۔ ماں کو دیکھ کر مجھے زخم رونے لگے۔ ہمیں ماں کے رونے کی وجہ معلوم نہ ہوئی۔ اُس نے میرے باپ کو کچھ بتایا تھا۔ باپ اٹھا اور چلے کی طرف گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس نے دال سے چھری اٹھائی تھی اور وہ دوڑتا باہر نکل گیا تھا۔ میری ماں بیٹھی رو رہی تھی۔ اُس نے مجھے اور لکڑی کو روک دیا تو ہم دونوں کو بازوؤں میں لے کر ہمیں چپ کو لے گئی کچھ دیر بعد اس نے پوچھا کہ تمہارا باپ کہاں ہے میں نے اُسے بتایا کہ وہ چھری لے کر باہر نکل گیا ہے۔۔۔

”ماں نے ہمیں الگ کر کے کہا۔ ”کیا تمہارا چھری لے کر گیا۔ اور وہ بھی دوڑتی باہر نکل گئی۔ میں اور لکڑی دروازے میں جا کھڑے ہوئے۔ تھک گئے تو بیٹھ گئے۔ دن گزر گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ماں روٹی ہوتی والیں آئی۔ اُنوں ٹروس کے لوگ جو ہماری طرح غریب اور مذہور تھے۔ انکھے ہو گئے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں لوگوں کی باتیں سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر یہ جیلا ایک آدمی نے میری ماں پر دست درازمی کی تھی اور ماں کو اپنی عزت بچانے کے لیے خاصی لڑائی لڑائی پڑی تھی۔ اس آدمی نے مجھ سے بازار میں لوگوں سے کہا تھا کہ اس عورت کا خاندان کام سے معذور ہو گیا ہے اور یہ بیکاری سے پیہ کا رہی ہے۔۔۔

”میرا باپ بہت پیارا اور مہرا سا آدمی تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس قدر غیر متناہد اور دلیر ہے۔ وہ چھری لے کر باہر نکل گیا تھا۔ اس نے بازار میں جا کر اُس آدمی کو ڈھونڈ لیا اور اُس پر حملہ کیا لیکن چھری کا ایک ہی وار کر سکا۔ لوگوں نے اُسے پکارا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ وہ آدمی روپے لیے پیسے والا تھا۔ وہ

میری ماں جیسی عورتوں اور میرے باپ جیسے آدمیوں کو مذہوری دیا کرتا تھا۔ اس لیے پولیس اُس کی اور انصاف اُس کا تھا۔۔۔

”جیلا بیٹے! ہمیں باتیں نہیں بتا سکتا کہ میری ماں کا اور ہم دونوں بچوں کا گھر میں کیا حال ہوتا تھا۔ ہر دم کیل کہاں سے کرتے۔ باپ خواست آکھ روز بعد بھٹانے کی حالات سے جیل کی حالات میں بھیج دیا گیا۔ ابھی مقدر سے چلائی تھا کہ پتہ چلا کہ میرے باپ کے بازو کا زخم بہت خراب ہو گیا ہے اور وہ جیل کے ہسپتال میں سب سے پندرہویں روز بعد اطلاع آئی کہ میرا باپ مر گیا ہے۔ اُس کے زخم میں شاید زہر پیدا ہو ہو گیا تھا جس سے جسم میں پھیل گیا اور موت کا باعث بنا۔۔۔

”بھٹے کے چند آدمی میری ماں کے ساتھ چارپائی لے کر گئے اور میرے باپ کی لاش لے آئے۔ تم نے اپنی ماں کا جنازہ دیکھا تھا۔ میں نے اپنے باپ کا جنازہ دیکھا۔ ہماری خوشیاں باپ کے ساتھ دفن ہو گئیں۔ ماں نے میرے اور لکڑی کے لیے اپنا خیمہ اور سکون قربان کر دیا مگر ایک ماہ بعد ماں کام پر گئی اور واپس نہ آئی۔ وہ آج تک نہیں آئی۔ میری عمر ایک کم تر برس ہو گئی ہے۔ ماں کو بھی کی مری ہو گی لیکن وہ آج بھی مجھے اُسی طرح نظر آتی ہے جس طرح میں نے اُسے دیکھا تھا۔ بھولی بھالی سی، جوان اور خوبصورت لڑکی۔ اپنے بچوں کی خاطر باہر نکلی اور۔۔۔

بوڑھے مسیقار نے میری سہیلی اور اُس کے ہونٹوں پر بڑی ہی اداس مسکراہٹ لگائی۔ وہ جیلا کے شے کے زخم کو صاف کر کے اُس پر دوائی لگا چکا تھا۔ چپ ہو کر اس کو دیکھتا رہا۔ بولا۔ ”اس پڑتی ہانڈیا خراب ہو جائے گا۔“ اُس نے آہ بھری اور کہنے لگا۔ ”جسم کے زخم ٹھیک ہو جائا کرتے ہیں، دل کے زخم ہمیشہ رہ رہتے ہیں۔ رستے رہتے ہیں۔۔۔ میری عمر دس سال سے زیادہ ہو چکی تھی اور لکڑی سات سال کی ہو گئی تھی۔ وہ جیل جیل بڑی ہوئی جا رہی تھی، ماں کی طرح خوبصورت نکلتی آ رہی تھی۔“

”غریب کی بڑی خوبصورت نہیں ہونا چاہیے۔“ جیلا نے کہا۔ ”تمہاری ماں کو اُسی آدمی نے غائب کیا ہو گا جس نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور جس پر تمہارے باپ نے چھری سے حملہ کیا تھا۔ تم جوان ہونے کو اس کی گردن پر جا چھری رکھتے۔ تمہاری ماں برا کہہ ہو جاتی۔“

”میں جوان ہونے سے پہلے ہی جوان ہو گیا تھا۔“ بوڑھے ستاروا نے اپنے دونوں ہاتھ جیلا کے سامنے کر کے کہا۔ ”میرے یہ ہاتھ جن کی انگلیاں ستارے کے تاروں پر قرض کرتی اور ان انگوٹوں کو زخم دیتی ہیں جنہوں نے تم جیسے پتھر ڈال کر کو مسخ کر لیا ہے، یہ ہاتھ اُس آدمی کے خون سے رنگے ہوئے ہیں جیسے قانون سزا نہیں دے سکا تھا۔ اسے ان ہاتھوں نے سزا دے دی تھی۔۔۔ جیلا بیٹے! اس پیدائشی موسیقار نہیں ہوں میں تمہاری دنیا کا آدمی ہوں جسے لوگ زمین دوز دنیا کہتے ہیں۔ تم استاد ہو۔ میں بھی استاد رہا ہوں۔“

جیلا نے اُسے چونک کر دیکھا۔

”تمہارے دل کا در میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”زخم بہتی ہیں رے ہو۔ اگر کسی سے پوچھتے کہ کوئی نہیں کیسے کیسے استاد ہو کر رہے ہیں تو لوگ گلو بھیتا کا نام بھی لیتے۔ میرا نام نقان تھا۔ ماں باپ نے مجھے کوئی بھیتا کہا اور بھیتی کی سوسائٹی نے مجھے گلو بھیتا بنا دیا۔۔۔ میں نہیں سن رہا تھا کہ میرا

باپ میری ماں کی عزت پر قربان ہو گیا۔ میری ماں اپنے بچوں پر قربان ہو گئی اور میں نے اپنا بچپن بھیل کود اور ماں باپ کی یادیں اپنی ہنس لکڑی پر قربان کر دیں۔ میں نوکری کے لیے گھر گھر بھرا ستر کسی نے نہ رکھا۔ دو گھروں میں مجھ سے میرے ماں باپ کے متعلق پوچھا گیا۔ میں نے بتایا تو دونوں گھروں سے مجھے دھتکے کر نکال دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ اس عورت کا بیٹا ہے جس کے آتش کو اس کے باپ نے چھری سے زخمی کیا تھا۔ ایک گھر میں کہا گیا: ایسے لوگوں کو گھر کے قریب سے بھی نہ گزرنے دو۔ یہ چروں بد معاشوں کی اولاد ہے۔۔۔

”چھوٹے سے ایک بٹل میں جو دراصل تھوڑا کلاس سی کنٹینر تھی، مجھے پانچ روپے ماہوار اور پنی کپڑے پر نوکری مل گئی۔ میں بھولا نہ سمایا۔ صبح سے رات گھری ہوئے ہمسائیوں کے گاہکوں کے آگے چائے اور کھانا کھتا اور جھوٹے برتن اٹھا کر دھوئے والے کو دینا۔ جسم ٹوٹ جاتا تھا لیکن مجھے خوشی ہوتی تھی کہ میں اپنی بہن کی محنت کی حلال کھائی کھلا رہی ہوں۔ اپنے ماں باپ کو میں نے دل میں دفن کر دیا اور لکڑی سے اتنا پیار کیا کہ وہ بھی ماں باپ کو بھولنے لگی۔۔۔

”بٹل کا مالک نیک آدمی تھا۔ ایک روز اسے بتایا کہ میں کیوں نوکری کر رہا ہوں۔ گھڑی کے متعلق بتایا کہ وہ سارا دن گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ مالک نے کہا کہ اپنی بہن کو ساتھ لے آ کر۔ اسے بھی اپنے ساتھ کھانا کھلا کر اور شام ہوتے ہی بہن بھائی گھر چلے جایا کرو۔۔۔ میں ہی چاہتا تھا۔ اب لکڑی بھی میرے ساتھ آئے گی۔ وہ جھیلتی رہتی اور میں اپنے کام میں لگا رہتا ہوں اسے بٹل سے کھانا کھلاتا۔ وہ جو فرمائش کرتی وہ پوری کرتا۔ اسے اچھے اچھے کپڑے پہناتا۔۔۔

”اس بٹل میں کام کرتے چھ سات مہینے گزر گئے۔ ایک روز میں دوپہر کا کھانا کھانے لگا تو لکڑی کو بلانے نکلا۔ وہ باہر نہ مل۔ ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔ میں دوڑا دوڑا گھر گیا۔ چابی تو میرے پاس تھی۔ لکڑی وہاں بھی نہیں تھی۔ ادھر ادھر کے گھروں میں جا کے دیکھا۔ لکڑی نہ ملی۔۔۔ وہ آج تک نہیں ملی۔“

رات گزرتی جا رہی تھی۔ بوڑھی بازار بھی تک چل رہا تھا۔ فائر بریگیڈ نے بہت حد تک آگ پر قابو پا لیا تھا۔ کراچی ریفورٹ وہاں طاری تھا۔ اس آگ کا جلا ہوا جیلا ایک دل جلے کی زندگی کی کمانی سن رہا تھا۔

”میری لکڑی بہتی کی اندھی گلیوں میں لکھو گئی۔ بٹل کے مالک نے تھکانے میں رپورٹ درج کرادی۔ بوڑھا موسیقار بکرا رہا تھا۔ ”تم پولیس کو اچھی طرح جانتے ہو۔ مجھے صرف ایک بار تھکانے بلایا گیا۔“

تھکاندار نے کہا، جالکے! تیری بہن مل گئی تھی تو تجھے اطلاع کر دیں گے۔ میں بہت رویا دار اس کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ میری بہن کو ڈھونڈ نکالے۔ اس نے مجھے تسلی دی اور چلا گیا۔۔۔

”جس طرح تم روٹی کے ایک ٹکڑے کی خاطر ایک استاد کے ہاتھ چڑھ گئے تھے، اسی طرح میں اپنی لکڑی کی تلاش میں بھٹکتا ان لوگوں سے جا ملا جو گلیکٹ کلکلا تے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ رات کے وقت سنان گلیوں میں چھپ جاتے۔ کوئی اکیلا دو اکیلا آدمی گزرتا تو اسے روک کر اس کی جیب خالی کر دیتے۔ میرے پاس لٹیا جیلا اپنا مکان تھا۔ ہم نے اسے خفیہ آڈو بنالیا۔ وہاں جھابھی ہونے لگی۔ میں نے بٹل کی نوکری چھوڑ دی۔ ایک بار ہم تین لڑکے کچرے گئے۔ ہم نے رہزنی کی تھی۔ ہم تینوں کو تین تین ماہ ہارٹے قید ہوئی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ پولیس اور جیل کا خوف دل سے اتر گیا۔۔۔

”میں تین بیٹاؤں کا بیٹا اتم اسی راستے کے مسافر ہو جو منزل میں تم نے طے کی ہیں وہ میں نے تین برسوں میں طے کر لیں۔ عمر بھی چودہ سال تھی۔ ایک روز ایک آدمی ملا میں اسے جانتا تھا۔ وہ جرات منہ تو نہیں تھا لیکن اس کا شمار بد معاشوں میں ہوتا تھا۔ اس نے مجھے کہا: تم اتنے بد معاش بنے پھرتے ہو۔ اپنی ماں کی بے عزتی اور باپ کی موت کا تو انتقام لو۔ معلوم نہیں اس نے مجھے یہ الفاظ کیوں کہے ہیں۔ اس سے پوچھا کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا۔ اس نے کہا کہ آؤ نہیں دکھانا ہوں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور وہ آدمی دکھایا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں کہ وہ کیا کام کرتا تھا میں نے اسے دیکھا اور اس کا گھر بھی معلوم کر لیا۔۔۔

”اس روز اپنے دو دوستوں کو بتایا کہ اس آدمی نے میری ماں کی عزت پر ہٹا ڈالا تھا اور مجھے اس نے تعزیم کیا ہے۔ اور میں اس سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔ میرے یہ دونوں دوست میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔۔۔ دور دراز گزرتے۔ ہم تینوں کے پاس بے بے چاقو تھے۔ شام کے بعد ہم انیس کے گھر کے سامنے ادھر ادھر ٹھٹھنے لگے۔ اس کے گھر میں اندھیرا تھا۔ دروازہ دیکھا تو کالا کتا بھاڑتا تھا۔ ایک لاکھ لاکھ کی طرح بہت ہو گیا تھا۔ اس نے ایک آدمی سے پوچھا کہ یہ صاحب کہاں چلے گئے ہیں۔ جواب ملا کہ اس ٹرائی کی بجائی کا کچا پتہ کہاں چلا گیا ہے۔ نہ آئے تو ساری رات نہ آئے۔ آئے گا تو ڈراپ کے نشے میں جھومتا آئے گا۔۔۔

”اتنی لمبی باتوں کو چھوڑو۔ ہم ادھر ادھر گھر سے پھرتے رہے۔ کوئی دو گھنٹوں بعد وہ آگیا۔ تالا کھول کر اندر چلا گیا۔ میری کا وہ علاقہ زیادہ آباد نہیں تھا۔ وقت بھی ایسا ہو گیا تھا کہ علاقہ سنان تھا۔ ہم تینوں اس کے پیچھے اندر چلے گئے۔ وہ دوسرے کمرے میں جا کر کھانا ہم نے اپنے اپنے منہ پر رومال چڑھا رکھے تھے۔ آنکھیں نیچی تھیں۔ ہم اس کمرے میں گئے۔ فرنیچر اور کمرہ کی سجاوٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ امیر آدمی ہے۔ وہ ابھی گھر آتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ہمارے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو تھے۔۔۔

”میں نے اپنے باپ کا نام لے کر کہا: ”اعتبار خان کی بیوی کہاں ہے؟“ اس نے کہا کہ وہ کسی اعتبار خان کو یا اس کی بیوی کو نہیں جانتا۔ ہم تینوں نے اسے تھپکھپکایا اور چاقوؤں کی نوکیں اس کے جسم کے ساتھ لگا دیں۔ میں نے کہا: ”زندہ رہنا چاہتے ہو تو تادو اعتبار خان کی بیوی اور اس کی بیٹی کہاں ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے چاقو کی نوک اسے چھبوی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تسلیم کر لیا کہ میری ماں اور بہن کو اسی نے اغوا کر لیا تھا اور اس نے دونوں کو بچہ دیا ہے لیکن میری ماں کے متعلق اس نے بتایا کہ اسے خریدنے والوں نے اسے ایک کمرے میں رکھا۔ رات کو اس نے اپنے آزار بند کا پھنڈ بنا کر خود کشی کر لی تھی میری بہن کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ دلی میں کہیں ہوگی۔۔۔

”تھکانے سے لیے یہ باتیں انوکھی نہیں رہیں۔ مجھے بھی سچا ہوا اور نوجوان لڑکیاں اغوا کر لیں ہیں۔ اس آدمی کا ظاہری کاروبار کچھ اور تھا لیکن وہ دراصل پردہ فروشوں کی دنیا کا تاجر تھا۔ میری ماں اور بہن کو اس نے انتقاماً اغوا کر لیا تھا کیونکہ میرے باپ نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اس نے جب میری ماں اور بہن کے متعلق یہ انکشاف کیے تو خون سے دماغ کو چڑھ گیا۔ مجھے اپنی بہن کے خرمیوں کا اتنا پتہ پوچھنا چاہیے تھا مجھ میں نا تجربہ کار تھا۔ میں نے پاگل ہو کر چاقو اس کی پسلیوں کے نیچے پوری

طاقت سے مارا اور چاقو کو ایک طرف جھٹکا دیا۔ اُس کا سپیٹ کھٹ گیا۔ وہ آگے کوچھا تو میرے دونوں دستوں نے اس کے پسپوں میں چاقو اتار دیتے۔ وہ گر پڑا....

”میرے اُس دوست نے جو بہت ہوشیار تھا، تپانی پرتال پڑا دیکھ لیا۔ اُس نے تالا اٹھا لیا۔ ہم تینوں نے اُس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ چھ ساڑھے چھ سو روپے بیکارہم نے بنی بھائی۔ باہر آئے اور باہر کے دروازے کو تالا کھرا غائب ہو گئے۔ سو تین ڈالہ اُس کے گھر کے سامنے سے گھرے۔ وہاں تالا کھرا تھا۔ وہ بڑا نام آدمی تھا اس لیے کسی نے بھی معلوم نہ کیا کہ وہ کہاں ہے۔ چوتھے دن اُس پڑوس والوں نے بدلو سے تنک اکروا دیا۔ پانچا تو اُس کا تالا توڑا گیا۔ پولیس نے اُس کی لاش نکالی۔ ہم کئی دن دیکھتے رہے۔ پولیس تفتیش کرتی رہی اور کوئی قابل گرفتار نہ ہوا....

”میری ماں تو میری چچی گڈی زندہ تھی اور وہ دلی میں تھی۔ ہم نے مقتول کی جیسے جو رقم نکالی تھی وہ قیوں نے بانٹ لی۔ میں نے مکان دوستوں کے حوالے کر دیا اور دلی چلا گیا۔ میں بیوقوف تھا۔ مجھے صرف یہ سولت حاصل تھی کہ میں حرم اور غنڈہ گردی کی دنیا کا آدمی تھا میں عصمت فروشوں اور ناجائزے گلے والیوں میں اچھی نہیں تھا میں ان کی زبان میں بائیں کر سکتا تھا۔ ان کے اشارے اور ان کی حقیقت بان بھی سمجھتا تھا میں نے وہ سارا بار بازار چھان مارا“

”تم واقعی بیوقوف تھے بڑے میاں!“ — جیلا نے کہا — ”ماز کو کوئی کراچی میں ٹھونڈ سکتا ہے؟“ — ”نہیں دھونڈ سکتا“ — بوڑھے نے کہا — ”میں بیوقوف نہیں پاگل ہو گیا تھا۔ رات کو خیال آجاتا کہ میری گڈی عصمت فروشوں کے پاس ہے تو اٹھ باہر کو دوڑ پڑتا تھا.... میں نے پانچ سال دلی میں گزارے جیسے کامل چور یاں کیں جو تو میرا شغل تھا۔ جو اٹھ لانے کا تجربہ حاصل کیا اور خوب کمایا اور سب اجیری گیٹ میں اڑا دلی کی ہرنا چنے کانے والی کے ہاں گیا مگر مجھے اپنی گڈی نظر نہ آتی....

”میری عمر بیس برس ہو چکی تھی اور میں دلی کے نامی گرامی دادا خیر میں مقبول ہو چکا تھا۔ میرے اندر سکون نہیں تھا، بچپن نہیں تھا۔ میری اپنی ضرورت صرف اتنی تھی، روٹی پکڑا اور شراب چرس سے مجھے نفرت تھی۔ میری ایک عادت تھی کہ میں طوافوں کے ہاں جاتا تھا اور صرف بائیں کر کے انہیں پیسے دے دیتا اور واپس آجاتا۔ مجھے ان کے جہوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی.... جانتے ہو کیوں؟ — مجھے طواف کا چہرہ گڈی کا چہرہ لگتا تھا۔ طواف میری واقعہ ہو چکی تھیں۔ وہ جان گئی تھیں کہ میں مبینہ کا گینگسٹر اور دلی کا دادا ہوں وہ مجھے پیسے واپس کرتی تھیں تو میں کتنا تھا کہ میں بدکاری کے لیے نہیں۔ وہ باتیں کرنے اور سننے کے لیے آتا ہوں....

”اب میں نہیں بتاتا ہوں کہ میں موسیقار اور ستار نواز کیسے بنا گا۔ نے سب نے کاشوق شروع سے تھا۔ ایک رات ایک گھر میں چوری کے لیے گیا۔ ستاری طرح میں نے بھی دو فخر لو کے رکھے تھے۔ ایک نے بتایا کہ کانے والی میواؤں کو گانا سکھانے والا ایک استاد ہے۔ اُس کے گھر بہت رقم ہے جو وہ الماری میں رکھتا ہے۔ رات ابھی آجی نہیں ہوئی تھی۔ میں استاد کے گھر میں آسانی سے داخل ہو گیا کیونکہ دروازہ کھلا تھا۔ وہ ایک کمرے میں فرش پر بیٹھا ستار بجا رہا تھا۔ وہ بوڑھا تھا اور لاش کی مانند لاغر اُس نے مجھے دیکھا اور سر کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا....

”میں نے پیشہ و چوروں کی طرح اُسے چاقو کھا کر کہا — میں بیٹھنے نہیں آیا، کچھ لینے آیا ہوں۔ رقم میرے حوالے کر دو۔ اُس نے ایک الماری کی طرف اشارہ کر کے بے نیازی سے کہا — تو کھو لو۔ درمیان والے خانے میں بن پڑوں کے نیچے کچھ پیسے پڑے ہیں۔ جاؤ لے جاؤ۔ میں نے الماری کھولی پڑوں کے نیچے ہاتھ پھیرا تو وہاں دس دس اور پانچ پانچ کے بہت سے نوٹ پڑے تھے۔ وہ ستار میں مگن رہا جیسے اُسے خبر ہی نہ ہو کہ اُس کا گھر لٹ رہا ہے۔ میرا ہاتھ رک گیا اور میں کبھی یہ سوچا کہ میں بدل ہوں جو میں سے ایک موسیقار کو لوٹ رہا ہوں۔ پھر خیال آتا کہ میں چور ہوں۔ اُکو ہوں۔ یہ بوڑھا مریض میرا کیا بگاڑ سکتا ہے....

”میں نے نوٹ نکال لیے۔ ایک ہاتھ میں نوٹ اور دوسرے میں چاقو تھا۔ وہ ابھی تک ستار میں مگن تھا۔ میں جب الماری سے ہٹ کر دروازے کی طرف چلا تو وہ ستار کھڑا آہستہ آہستہ اٹھا۔ میں اُس کے قریب سے گزرنے لگا تو اُس نے اپنا دایاں ہاتھ اس طرح میری چاقو والی کلائی پر مارا جس طرح قصائی ہڈی توڑنے کے لیے چھڑا مارا کرتا ہے۔ یوں لگا جیسے میری کلائی ٹوٹ گئی ہو۔ چاقو میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ اُس نے ایک ٹھونسہ میرے پسپوں کے نیچے مارا۔ میرا سانس رک گیا اور میں دوسرا ہو گیا۔ اُس نے چھڑے کی طرح ایک ہاتھ میری گردن پر مارا۔ میں ٹٹنے کے بل گر پڑا۔ یوں لگا جیسے میری گردن پر ڈنڈا پڑا ہو۔ نوٹ بھی میرے ہاتھ سے گر پڑے اور بکھر گئے....

”اُس نے میرے سر کے بال کٹھے میں لے کر اتنی زور سے کھینچے کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے قصائی کے چھڑے کی طرح ایک ہاتھ میری شہرک پر مارا۔ اُصین کو نہا میں پیچھے کوجا پڑا۔ اُس نے میرا چاقو اٹھا لیا۔ یہ سب کچھ صرف دو سیکنڈ میں ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ مشین کی طرح چلے تھے۔ مجھے سنبھلنے اور سوچنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اُس نے گرج کر کہا: ”اٹھو“ — میں اٹھا تو اُس نے کہا — یہ نوٹ اٹھاؤ۔ میں نے سداہتے ہوئے جانور کی طرح نوٹ اٹھا لیے۔ اُس نے کہا — اپنی جیب میں ڈال۔

”میں نے نوٹ اپنی جیب میں ڈال لیے تو اُس نے بیٹھنے کو کہا اور پوچھا — کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟ — میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس نے مجھے کس اثر میں لے لیا تھا۔ میں تنومند جوان اور وہ لاش کی طرح بوڑھا جسم مگر اس کے سامنے میری طاقت سلب ہو گئی جیسے گول میں خون جم گیا ہو.... پھر یوں ہوا کہ میں طرح تم نے مجھے اپنے پیچھے سے لے کر اب تک کی اپنی زندگی کی کمانی سنائی تھی، اسی طرح میں نے اُسے اپنی زندگی کی کمانی سنائی۔ یہی کمانی جو میں تیس سالہ بچوں چیل اس کی کمانی میں گم ہو گیا تھا۔ رات گذرتی جا رہی تھی۔

بوڑھا کھڑا تھا — بات بڑی لمبی ہے۔ دیا میں ذرا متفقہ کر دیتا ہوں۔ وہ بوڑھا مجھ سے پیار تھا۔ اُس نے ایک توجہ جان کانے والی کے ساتھ شادی کی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ وہ تار بجا کرتا تھا۔ ایک بار ایک سلمان نواب نے اس کی بیوی کی شہرت میں کراہیں اپنے ہاں بلایا۔ نواب لڑکی پر فخریت ہو گیا اور اسے منہ مانگی قیمت پیش کی جو وہ نوٹوں نے ٹھکرادی۔ وہ واپس آگئے اور ایک

بوڑھا کھڑا تھا — بات بڑی لمبی ہے۔ دیا میں ذرا متفقہ کر دیتا ہوں۔ وہ بوڑھا مجھ سے پیار تھا۔ اُس نے ایک توجہ جان کانے والی کے ساتھ شادی کی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ وہ تار بجا کرتا تھا۔ ایک بار ایک سلمان نواب نے اس کی بیوی کی شہرت میں کراہیں اپنے ہاں بلایا۔ نواب لڑکی پر فخریت ہو گیا اور اسے منہ مانگی قیمت پیش کی جو وہ نوٹوں نے ٹھکرادی۔ وہ واپس آگئے اور ایک

دل میں لیے اس دنیا سے نصحت ہو گئی میں نے اس کی گدھی کا احترام کم نہ ہونے دیا میرے پاس جو گائے والی آتی تھی اسے میں گدھی سمجھتا تھا۔ ہر گائے والی مجھے اپنا پرستاد مانتی تھی... اور اس طرح میں پیارا اور موسیقی کی جنت میں داخل ہو گیا۔

"میں اگست ۱۹۴۷ء میں کراچی آ گیا تھا۔ ہندوستان کے کئی شہروں کی ناپختہ گائے والیاں یہاں آ گئیں۔ میں پہلے تو کھانے کے لیے بھٹکتا رہا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے ہاں جگہ دی لیکن مجھے یہ مکان زیادہ پسند آیا ہے میرے پاس وہی دلی والی رونق لگ گئی اور میں پیارا اور موسیقی کی زندگی میں رواں دواں ہو گیا۔"

بوڑھے موسیقار نے دیکھا کہ جیلا جوتھوڑی دیر پہلے لیٹ گیا تھا، گہری نیند سو گیا ہے۔ بوڑھا مسکرایا اور زیر لب بولا۔ "تم نے منزل پالی ہے... بھٹک بھٹک کر!"

جس وقت جیلا بوڑھے موسیقار کی کمائی سن رہا تھا، اُس وقت نازیتابی سے اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ جیلا زخموں کی سرسہم ٹپی کے لیے گیا ہے۔ اُسے جلدی واپس آنا چاہیے تھا مگر رات بہت گزر گئی تھی، وہ نہیں آیا تھا۔ اُسے مینڈ نہیں آ رہی تھی۔

کوئی مکان میں داخل ہوا۔ نازوڑی باہر نکلی۔ اُسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہ جیلا نہیں آ رہا اور ٹیپو تھے۔ وہ جھومتے آ رہے تھے۔ ان سے پیچھے دو لڑکے تھے جنہوں نے دو کھڑیاں اور ڈونرنگ اٹھارے رکھے تھے۔ لڑکے اُس مے میں سامان لے گئے جہاں چوری کا مال جایا کرتا تھا۔ بوڑھی باڑا لی گئی۔ انہوں نے خوب ہاتھ مارا تھا۔

"اُستاد کہاں ہے؟" ٹیپو نے ناز سے پوچھا۔

"آیا بھی ہے یا نہیں؟" فتنے نے پوچھا۔

"آیا تھا۔" ناز نے بے خبری سے جواب دیا۔ "کیس چلا گیا ہے۔"

"کہا کیا ہے؟" ٹیپو نے پوچھا۔

"مجھ نہیں۔" ناز نے جواب دیا۔ "وہ تو زخمی ہو کر آیا ہے۔ کہتا تھا اُس نے ایک بچے کو جلتی ہوئی آگ سے نکالا اور اُس کی مال کے حوالے کیا ہے۔"

"کیا کہا؟" ٹیپو نے حیرت سے پوچھا۔ "ایک بچے کو آگ سے نکالا ہے؟"

"ہاں۔" ناز نے کہا۔ "بچے کی مال لے اُسے سونے کا ہار دیا تھا۔"

"کہاں ہے وہ بچہ؟" فتنے نے پوچھا۔ "تھارے پاس ہو گا؟"

"نہیں۔" ناز نے جواب دیا۔ "وہ بڑ نہیں لایا۔ اُسی عورت کو دے آیا ہے۔"

ٹیپو نے لڑکھڑاتا ہوا قہقہہ لگایا اور بولا۔ "وہ کہتا ہے اور تم کھواس کرتی ہو۔"

"کچھ... کچھ... ناز نے جھلا کر کہا۔ "آئے دو لے تمہاری چڑی اتروا دوں گی۔"

"میں کہتا ہوں وہ جو مال لایا ہے وہ ہیں دکھاؤ۔" ٹیپو نے کہا۔

"وہ مجھ نہیں لایا۔" ناز حقارت سے بڑکھڑاتے ہوئے چلی گئی۔

اُسی روز ٹیپو اور جیلا نے ایک دوسرے پر چاقو نکال لیے تھے۔ ٹیپو اور متا دیکھ رہے تھے

ہی مینے بعد نہ پانچنے والی خواہ گئی۔ یہ آدمی نواب کے ہاں گیا جہاں سے اسے نکال دیا گیا۔ پولیس کے پاس گیا مگر اس کی بیوی برآمد نہ ہو سکی۔

"یہ آدمی دل برداشتہ ہو کر گھر میں قید ہو گیا۔ چونکہ استاد رنواز تھا اس لیے ناپختہ گائے والوں نے اُسے گوشہ تنہائی سے نکال لیا لیکن اُس نے کسی ایک کی ملازمت نہ کی۔ اُس نے اپنے آپ کو پچھے راگ میں ڈلوایا۔ اس نے شادی کی نہ سوچی۔ ستاری اس کی بیوی اس کی محبوبہ اور اُس کی تنہائی کی ساتھی تھی۔ اُس نے گائے والیوں کو گائے کی تربیت دینی شروع کر دی۔ کسی نے جو دیا اُس نے لے لیا۔ اُسے روپے پیسے کے ساتھ کوئی دیکھی نہیں تھی۔"

"میں نے اسے اپنی بہن کا حلیہ بتایا۔ نام بتایا۔ اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی اور کہنے لگا۔ کو تین چار سال گزرے وہ ایک بڑی خوبصورت لڑکی کو کھٹکنا چ سکا تھا۔ شاید وہ اپنا نام شاید یالگدی بتاتی تھی۔ اتنا یاد ہے کہ وہ مہنتی سے آتی تھی بالائی گئی تھی لیکن وہ اب دلی میں نہیں... اس نے خود بخود نے مجھے اپنا مہر بتایا۔ میں اس کی خدمت کرنے لگا۔ پہلی ملاقات میں اُس نے مجھے کہا تھا کہ میں سارے نوٹ اپنی جیب میں ڈال لوں میں نے جیب میں ڈال لیے تھے لیکن نکال کر اُس کے آگے رکھ دیتے۔ اس نے مجھے کہا تھا۔ چروا کر بگاڑ لیں گے۔ ان میں جہانی طاقت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، وہ مجھ جیسے بوڑھوں کے ہاتھوں پٹ جاتے ہیں۔ طاقت ایمان اور اخلاق کی ہوتی ہے۔ تم مارے مارے نہ پھرو۔"

"میں رو پڑا۔ وہ میرے تم اور گڑی کی داستان سن چکا تھا جس طرح میں نے تمہیں کہا تھا کہ میرے پاس آیا کہ اور اپنے دل کی سنایا کرو، اسی طرح اُس نے مجھے کہا اور اتنے پیار سے کہا کہ میں اُسی کا ہو رہا۔ اُس نے میرا سر پیار سے مار ڈالا۔"

"یہی شکوہ مجھے تم سے ہے۔" جیلا نے کہا۔ "مجھے تمہارے پیار نے بزدل بنایا ہے۔" "جسے تم بزدلی کہتے ہو وہ بہت بڑی بہادری ہے۔" بوڑھے موسیقار نے کہا۔ "میں نے جیل کو محسوس کر رکھا۔ انسان کو خدا نے صرف نیکی کا جذبہ دیا ہے۔ گناہ کا جذبہ انسانوں کی پیداوار ہے۔ گناہ بھٹکی ہوئی نیکی کو کہتے ہیں۔ نیکی دب جاتی ہے اور ایک نہ ایک دن ابھرتی اور نکاحوں کو بایستی ہے۔ تم ایک بچے کو پال رہے ہو جس کا کوئی باپ نہیں۔ تم اُسے اٹھانے لاتے تو اُسے مال کوڑے کوڑے ڈھیر پھینک دیتی۔ آخر زندہ رہتا تو وہ چورا چکا یا بھکاری بنتا... تم نے آج اپنے آپ کو آگ میں پھینک کر ایک بچے کو آگ سے نکالا ہے... کیوں؟ ذرا سوچو، کیوں؟ تمہارے دل میں کوئی لالچ نہ تھا تمہارے اندر وہ انسان زندہ ہے جو نیکی ہے۔ اسے پیار کی غلطی تو وہ تو منہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب جو تم کہتے ہو کہ تمہارا زہر مار دیا گیا ہے، یہ دراصل وہ انسان زندہ ہو رہا ہے جسے تم نے مار رکھا تھا۔"

"تم اپنی کمائی میں سارے تھے۔" جیلا نے کہا۔

"ہاں، میں سارا تھا۔" بوڑھے موسیقار نے کہا۔ "کہ میں اس موسیقار کا مرید ہو گیا، پھر میں نے اس سے ستر کھینچی شروع کی۔ راگ، انگلیاں سیکھیں اور اُس کے پیار نے مجھے غڈکوں کے استاد کی بجائے راگ نگار کا استاد بنادیا۔ دس گیارہ برس بعد وہ اپنی گدھی میرے سپرد کر کے اور اپنی بیوی کی یاد

کمزور اُن کے اُستاد کو بیکار کرتی جا رہی ہے۔ اسی پرانے دونوں کا جیلا کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا۔ اگر ایک لڑکا بوہڑی بازار کی گگ کی اطلاع نہ لاتا تو ان کا جھگڑا لڑائی تک یا جراتی تک پہنچ سکتا تھا۔ اب نا انہیں کبھی جیلا بھی نہیں لایا تو انہیں شک ہوا کہ جیلا نے مال ناز کو دے دیا ہے۔ وہ دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے۔

”اب حد ہو گئی ہے مُنھے اب ٹیپو نے کہا۔“ اُستاد ہمیں دھوکہ دے رہا ہے۔ کیا تم مان سکتے ہو کہ وہ کچھ بھی نہیں لایا ہوگا؟ اس نے ایک بھی پاگٹ نہیں ماری ہوگی؟“ اور دیکھو یہ لڑکی کیا جھوٹ بول رہی ہے۔ مُنھے نے کہا۔ ”جیلا نے ایک پتے کو آگ سے نکلایا ہے اور اُس نے بچے کی ماں کو اُس کا دیا ہوا مارا پس کر دیا تھا۔“ دونوں پر شراب کا نشہ طاری تھا اور دونوں جراتمیشہ تھے۔ شریعت لوگ نہیں تھے۔ ان کے جھگڑوں کے فیصلے ان کے چاقو کیا کرتے تھے۔ ٹیپو اٹھ کھڑا ہوا اور مُنھے سے کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔ دونوں ناز کے کمرے میں چلے گئے۔

”مُن چھوڑی!“ ٹیپو نے ناز سے کہا۔ آج کی رات گزر رہی ہے۔ ہم تین کل کا دن اور کل کی رات دیتے ہیں۔ اس کے بعد تم ہمیں یہاں نظر نہ آؤ۔ اس حرامی بچے کو ساتھ لے جانا۔ اگر تم یہاں سے نہ نکلتی تو ہم تمہیں کوٹھے پر پہنچا دیں گے۔ وہ تھا۔ اعلام آجاتے جواستاد بنا پھرنا ہے تو اُسے بتادینا کہ میں نے اور مُنھے نے نہیں کیا تھا ہے۔“

ناز مُن ہو کر رہ گئی۔

”اگر تم نے جیلا کو چارے ساتھ لڑانے کی کوشش کی تو اُس کی لاس بھی تم کو دی جائے گی۔“ مُنھے نے کہا۔ ”اور تم۔۔۔“

ناز کو یاد آ گیا کہ وہ کہاں ہے اور یہ کیوں لوگ ہیں۔ اُس کا تو جیسے خون ہی خشک ہو گیا ہو۔ ممتا اور ٹیپو باہر نکل گئے۔

جیلا بوڑھے ستار نواز کے گھر گری نیند سویا ہوا تھا اور ناز اُس کے انتظار میں مختصر تر کانپ رہی تھی۔

جیلا کی کچھ کھل گئی۔ اُس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اُسے بول لگا جیسے اُس نے خواب دیکھا ہو۔ وہ خالوں کی دنیا میں جینے والا آدمی نہیں تھا۔ عادی محبِ مہرجن کے شب و روزِ مہرجم اور جیل کے چکر میں گزرا کرتے ہیں وہ خواب نہیں دیکھا کرتے۔ ان کی نظر حقیقت پر ہوتی ہے۔ وہ صرف اُس چیز کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں جسے وہ دیکھ سکیں اور جسے وہ چھو سکیں۔ وہ جب کسی گھر کا آلا توڑتے ہیں تو ان کے ذہن میں جیل کا آلا ہوتا ہے کسی ناپسنے والی کے کوٹھے پر جب وہ گھنگھروں کی باکسی طوائف کی چڑیلوں کی جھنگار سننے میں تو انہیں جھنگریوں کے چھٹا کے یاد آ جاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس قسم کے خواب نہیں دیکھا کرتے کہ وہ جھنگریوں سے بچے رہیں گے۔

جراتمیشہ لوگ حقیقت پر نظر رکھتے ہیں اور ان کا وجود معاشرے کی بڑی تلخ حقیقت ہے مگر معاشرہ اس حقیقت سے جو اس کی اپنی پیداوار ہے، نظریں چراتا ہے اور اپنے کمنے کی سزا جھگڑت رہا ہے۔

جیلا نے اپنے سر میں گرانی محسوس کی۔ اُسے یاد آ گیا کہ رات اُس نے شراب نہیں پی چرس کا بھی کش نہیں لگایا۔ اُس کی مجرمانہ زندگی میں یہ پہلی رات تھی کہ اُس نے شراب پی نہ چرس کیوں؟ اُس کا ذہن اس سوال کے جواب میں اُسکھ گیا کہ رات کو ان سی قیامت ٹوٹی تھی کہ اُس کا اپنے پلاسے کا معمول ٹوٹ گیا اور وہ اس پر بھی پریشان ہونے لگا کہ اُس کی آنکھ اتنی سویرے کبھی نہیں کھلتی تھی۔ کھل بھی جاتی تو وہ کروٹ بدل کے سو جاتا تھا لیکن اُس صبح اُس نے کروٹ بدل کر سو جانے کی بجائے ذہن اور زیادہ بیدار ہو گیا، اور اُسے کان کے پیچھے درد محسوس ہوا۔ پھر سٹخنے سے درد کی ٹپس اٹھی۔ وہ پوری طرح بیدار ہو گیا اور اٹھ بیٹھا۔

کمرے میں ابھی تاریکی تھی۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے اُس نے باہر دیکھا۔ باہر بھی ابھی صبح کے کوئی سہارا نہیں تھے لیکن جیلا کی نیند پوری ہو چکی تھی۔

”خواب تھا۔ اُسے خیال آیا۔“ کھتے ہیں جھولی لبرسی ہاتھیں خواب میں یاد آتا کرتی ہیں۔ یہ جیاتی والی کسک تھی جو میں نے لگائی تھی اور خواب میں دیکھتا رہا ہوں کہ کراچی کے کسی بازار میں لگ گئی ہوئی ہے۔“ اُس کا ہنسا ہوا، فریب خوردہ اور فریب کار ذہن بہت ہی آہستہ آہستہ بڑی ہی مری مری چال سے حقیقت کی طرف آ رہا تھا لیکن ایک آواز نے اسے روک لیا۔ یہ ایک بڑی ہی سرلی پُرسوزاؤ و جہاں آواز بھتی۔ یہ آواز نہیں ایک لے تھی، الپ سا تھا جیسے ویرانے میں تھوڑی ہی دُور کوئی لیاہ مسافر ٹھکانا جا رہا ہو۔

جیلا نے اپنے موبے قیادار بابا کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اُسے خیال آ گیا کہ بابا ریاض کو رہا ہے اور یہ سڑم گوج اُس کے تانپورے کی ہے مگر جیلا کا ذہن زیادہ نہ اٹھا رہا۔ اس ریاض کے الپ کے الفاظ شفاف پانی میں رنگ برنگی پھیلیوں کی طرح اُس کے سامنے سے تیرتے ہوئے گزرتے

لَکے۔ اَلصَّلٰوۃُ تَعِیْنُ عَلَیْکُمُ التَّوْحٰدَۃُ حَقِّیْکُمُ التَّوْحٰدَۃُ... اللہ اکبر... اللہ اکبر...

یہ الفاظ وہ پہلی بار نہیں سن رہے تھے یہی الفاظ سنتے سنتے وہ اس عمر کو پہنچا تھا کہ اس نے انہیں کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ اذان کی مقدس آوازوں کو اس نے ٹریفک کی آوازوں اور گروپش کے دیگر شور و غوغا سے کبھی الگ کر کے نہیں سنا تھا۔ مسجدوں کے لاؤڈ سپیکروں کی بھٹی بھٹی جیتی چلاتی اس آواز کو اس نے شہر کی دوسری آوازوں سے الگ کرنے کے کبھی قابل نہیں سمجھا۔ کبھی کوئی بھٹی اور بھٹی آواز میں اذان دیا کرتا تو جیسا کہ وقت سی محسوس کیا کرتا تھا، اس لیے میں کہ وہ اذان کے تقدس کو سمجھتا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ آوازوں کے تڑم اور موسیقیت کا قابل تھا۔ اسی تڑم اور موسیقیت نے اسے اس بڑے ستاروں کے سامنے گھٹنوں بٹھالیا تھا، اور یہ بڑھا اس کے ذہن، اس کے دل اور اس کی سوچ پر محترم علم پر چھا گیا تھا۔

یہ پہلی اذان تھی جس نے اس پر سحر طاری کر دیا۔ آواز ہی کچھ ایسی تھی۔ یہ اذان پہلی بار شہر کے شور و شر سے الگ تھلک، تنہا اس تک پہنچ رہی تھی جو اتم پیشہ کراچی ابھی گہری نیند سو رہا تھا۔ سڑکوں پر ابھی ٹریفک کی دوڑ شروع نہیں ہوئی تھی۔ خواجہ بھل اور ریڑھیوں والے ابھی گھاس بھوس کی چپٹوں اور مٹی کی دیواروں میں سوتے ہوئے تھے۔ شہر خاموش تھا۔ فضا چپ چاپ تھی، اور اس فضا کے سکوت میں اذان کی سترم گونج پھیلی آ رہی تھی۔

جیسا کہ کھڑا تھا۔ اس نے کان کے پیچھے اور سننے کے زخم میں درد کی ٹپس محسوس ہی نہ کی۔ وہ یوں کھڑکی کی ٹفنہ بڑھا اور کھڑکی کھول دی جیسے ہی عینی قوت نے اس پر غالب آکر اس سے یہ حرکت کرائی ہو۔ ہوا کا ایک سڑجھکا اس سے لپٹ گیا اور اس جھونکے کے ساتھ تڑم اور مقدس بے اس کی باتیں لینے لگی۔ "لا الہ الا اللہ"۔ اور پھر فضا خاموش ہو گئی۔

وہ انتظار کرنے لگا کہ فضا اس مقدس تڑم سے ایک بار پھر فرش ہوگی اور اس کی بھٹکی ہوئی زخم خوردہ روح کو سہلائے گی۔ مگر آوازوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بیک وقت کئی لاؤڈ سپیکر چھٹانے لگے۔ کوئی قریب سے، کوئی دور سے اور کوئی بہت ہی دور سے کسی کی آواز مٹی اور بھٹی تھی، کسی کی کج اور جینا اور کچھ آوازیں بہت ہی بڑھتی تھیں۔

جیسا کہ کھڑکی بند کر دی اور اس آواز کو اپنے ذہن میں محفوظ کرنے کی کوشش کرنے لگا جو اس نے سب سے پہلے سنی تھی اور جس نے اسے مسخ کر کے کھڑکی کھلوا دی تھی۔ وہ تصور میں یہ آواز سننے لگا اور جس طرح اس نے کھڑکی کھولی تھی اسی طرح اس کی ذات کا بااس کی روح کا دیکھ بھلنے لگا۔ وہ اپنے آپ میں ایک اثر سلسریت کو محسوس کرنے لگا۔ یہ اثر بھی اسے سکون دیتا بھی مضطرب اور بے چین ہوجاتا۔

"جاگ اٹھے بیٹا!۔ اسے بڑے ستاروں کی آواز نے اس کیفیت سے نکال لیا۔ بڑے نے کمرے کا بلب جلا کر کہا۔ "لاؤ دکھاؤ ذرا، زخموں میں درد تو نہیں؟"۔ اور وہ اس کے قریب آگیا۔ جیسا کہ بڑے کو حیران سا ہوئے دیکھا اور کبھی بڑی سی آوازیں لولا۔ "زخم؟"۔ "اوہ... میں نے رات خواب نہیں دیکھا تھا... مجھے یاد آ رہا ہے... ہاں ہاں... مجھے یاد آ گیا ہے"

ستاروں اور مسکرا رہا تھا۔

"میں نے اذان سنی ہے۔" جیسا کہ کہا۔ "آواز تمہاری طرح بہت پیاری تھی میرے دل پر اس کا اثر ہوا ہے... میں بتا نہیں سکتا یہ کیسا اثر ہے۔" اس نے لپک کر کھڑکی کھول دی اور بولا۔ "میں نے صبح کبھی نہیں دیکھی تھی۔"

"تم نے اپنے آپ کو اللہ کے نور سے محروم کر رکھا تھا۔" موسیقار نے کہا۔ "میں علم حاصل نہیں کرتا کہ میں کبھی کبھی ذات میں یہ انقلاب کیسے آیا ہے۔ گھبراہٹ میرے عزیز! میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ یہ انسان کی فطرت کے کرشمے ہیں۔ انسان چاہے تو اتنا غمزہ اور بزدل بن سکتا ہے کہ چوبیس بجے ہی بیدار ہو جائے اور اتنا طاقتور ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا سے ٹکرائے اور کھڑے ہو۔ میں نے کتا نہیں نہیں پھیس، انسانوں کو پڑھا ہے۔ گرتوں کو اٹھتے دیکھا ہے اور سینہ تان کر اور گردن اگڑا کر چلنے والوں کو اذیت دے منہ کرتے دیکھا ہے۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں گرایا جاتا ہے بعض خود ہی گرتے ہیں... اور دیکھو بیٹا! جو گرتے ہیں وہ اٹھ بھی سکتے ہیں۔"

ستاروں نے جیسا کہ چارپائی پر اپنے پاس بٹھالیا۔ وہ گویا تھا۔ "میں نے رات تمہارے ساتھ بہت باتیں کی تھیں۔ میں نے شاید وہ غلط بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ میری غلطی تھی۔ وعظ اور نیند نصیحت سے کوئی انسان شہر نہیں سکتا۔ حالات اور انسان ہیں جو انسانوں کو بگاڑتے ہیں سواری نہیں ہیں، مگر انسان صاف گوشت اور ہڈیوں کا مجموعہ نہیں اصل انسان روح اور ضمیر ہے۔ وہ جو بڑا جاتے یا بگاڑ دیتے جاتے ہیں وہ جیم ہوتے ہیں۔ اندر سے انسان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اصل انسان ہی ہوتا ہے جو بگاڑا نہیں جاسکتا اور اسی اصل انسان کے آگے فرشتوں نے خدا کے حکم سے سجدہ کیا تھا....

"جیل خانے مجرموں کو سزا دیتے ہیں، انہیں پاکیزہ نہیں بنا سکتے جیل خانے میں جرم کو سزا دی جاتی ہے پیارا شہقت سے مجرمی انسان کو مجرم بنا دیتی ہے۔ اسے پیارا شہقت مل جاتے تو وہ راہ راست پر آجاتا ہے... ایک وقت تھا جو میں نے بھی دیکھا ہے۔ اس ملک میں ایسے ایسے ڈاکو اور بزنز چلا کرتے تھے جنہیں پولیس اور فوج بھی نہیں پکڑ سکتی تھی۔ وہ گھیرے میں سے نکل جایا کرتے تھے ان کی دہشت آتی ہوئی تھی کہ پولیس اور فوج بھی ان سے ڈرتی تھی مگر جب بھی کوئی ڈاکو پکڑا گیا وہ ایک عورت کے ہاتھوں یا عورت کی وجہ سے بڑا گیا۔ وہ عورت کی محبت میں گرفتار ہوا اور اس کی ساری ستادی اور ساری دہشت ختم ہو گئی۔ اس عورت کے وجود اور پیار میں اسے مال کا پیار ملا، بہن کا اور بھائی کا پیار ملا تو جس مجرمی نے اسے ڈاکو بنایا تھا وہ پوری ہو کر اس کی کمزوری بن گئی... ڈاکو اور چور اچکے آسمان سے نہیں گر کر اترتے۔ زمان کی کوکھ سے وہ فرشتوں کی مانند پاک صاف پیدا ہوتے ہیں۔ وہ جب ایسی مجرمی اور ایسی تشنگی اور ایسے ظلم اور بے انصافی کا شکار ہوتے ہیں جیسے تم اور میں ہوتے تھے تو وہ چور اور ڈاکو بنتے ہیں۔

"میری استاد اور میری دہشت ناز اور بچے نے تم کو دی ہے۔" جیسا کہ کہا۔ "تمہاری ذات کا اصل انسان بیدار ہو گیا ہے۔" بڑے ستاروں نے کہا اور ایسی آواز بھر کر بولا انسان کو خدا نے بڑی قوت دی ہے۔ ایک بات یاد آتی ہے معلوم نہیں کہاں تک سچ ہے میرا خیال ہے سچ ہی ہوگی۔ ایک بڑی ہی خوبصورت عورت ایک نیک اور پارسا آدمی کو دل سے چاہتی

وہ سب کو دیکھنے لگا۔ وہ کوئی شکار دیکھ رہا تھا۔ اچانک بس رک گئی۔ دھچک لگا تو اُس نے باہر دیکھا۔ اُسے وہیں اُترنا تھا۔ وہ اُنچا کُمر اُس کا انداز جب کُتروں والا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور یہ وقت ریش کا تھا۔ لوگ فیخڑوں، دفنوں اور دکانوں کو جارہے تھے۔ وہ دھکے دیتے اور دھکے کھاتے بسوں پر اُتر اور چڑھ رہے تھے جب کہ جسے ایسے ہی ریش میں اپنا کمال دکھانا کر رہے ہیں۔

جیلاس کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اُس نے ایک شکار دیکھ لیا تھا عین اُس وقت ایک سچوئیدریش سے گھبرا کر چیخ اٹھا اور زور زور سے رونے لگا۔ جیلاس نے اٹھا۔ اسے ایسے لگا جیسے اُس کا بچہ رو رہا ہو۔ وہ دروازے کی طرف لپکا۔ مسافر دروازے میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہ انہیں دھکیلتا ہوا باہر نکل گیا اور اپنے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔

”دروازہ ناز کے کھولاریوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دروازے کے ساتھ ہی لگی کھڑی تھی۔ اُس نے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ شب بیداری کے اثرات بھی تھے۔ بال بکھرے بکھرے سے اور آنکھوں کے نیچے سانولے سے حلقہ پڑ گئے تھے۔ جیلاس نے اسے دیکھا تو پریشان نہ ہوا۔ ناز اُسے اتنی زیادہ ضرورت کبھی نہیں لگی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”کہاں غائب ہو گئے تھے؟“ ناز نے پکارا اور غصے سے مٹی اُڑا کر پوچھا۔
”تم نے پہلے کبھی نہیں پوچھا تھا۔“ جیلاس مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں معلوم ہی ہوں کہ میں کہاں غائب ہوجا رہا ہوں۔“

”اندراچلو“ ناز نے کہا۔ ”رات تمہاری حالت ایسی نہیں تھی کہ پہلے کی طرح غائب ہوجاتے میں ساری رات سوئی نہیں۔“

جیلاس چلتے چلتے ٹل گیا اور حیرت سے ناز کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم پاگل ہو۔ میرے نیلے ساری رات کبھی کوئی نہیں جاگتا تھا۔ میرا انتظار کسی نے نہیں کیا تھا۔“

ناز نے کچھ کہنا چاہا۔ اس کے ہونٹ کاپنے مکر اُس نے بات نکل لی جیلاس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے گھرے میں لے گئی۔ سچوئیدریش جیلاس کو دیکھتے ہی ”ابو“ کہتا اس کی آنکھوں سے لپٹ گیا۔ جیلاس نے جھک کر اُسے اٹھایا اور گال اس کے گالوں سے رگڑنے لگا۔ ناز بارچی خانے میں چلی گئی۔ جیلاس کے دل میں بچے کا پیار تو تھا ہی لیکن آج وہ بچے کے گال چاٹ رہا تھا۔ کبھی اُسے ذرا پرے کمرے خور سے دیکھنے لگتا اور پھر اُسے گلے لگا کر بازوؤں میں بھینچ لیتا۔

ناز جب ناشتہ لے کر آئی، سچوئیدریش میں چلا گیا تھا اور جیلاس اور بچے کی وہ تصویر دیکھ رہا تھا جو ناز نے منگو کر دیوار سے لٹکانی تھی۔ کبھی صورتوں کے چہرے پر ماسٹا کا ناز اُسی محنت سے اور مال کے جذبات کے رنگ بھر کے پیدا کیا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے تو دیر لگی ہوئے لگے کی اور سچوئیدریش میں چل رہا تھا، مسرت کا مضمون سامعہ تھا۔ ناز نے جیلاس کے قریب تپائی پر پڑے کھلی تو بچی جیلاس کی طرف دیکھتا رہا۔

ناز نے اس کی پٹلی پیچھے کھڑے ہو کر ایک ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھا اور ہاتھ آگے نہ کر کر اس کی قمیض کے اندر لے گئی۔ اس کا یہ ہاتھ جیلاس کے شنگے سینے پر رینگنے اور سر کھنے لگا۔ ناز نے دوسرا ہاتھ جیلاس کے دوسرے کندھے پر رکھا اور سر کا قمیض کے اندر لے گئی، پھر چھکی اور اپنا گال جیلاس کے

تختی مگر وہ آدمی اسے قبل نہیں کر رہا تھا۔ ایک رات وہ اپنے کمرے میں قراں پڑھ رہا تھا۔ وہ عورت آگئی۔ اُس نے اظہار محبت کیا اور ایسے انداز سے کیا کہ اس آدمی کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ رات تنہائی اور عورت کے جن نے اُس کی بارسائی کو جھنجھڑا لایا مگر اس نے شیطان کے آگے سنبھلا نہ پڑا۔ اس کے سامنے دیا جل رہا تھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ دیتے کی ٹوپر رکھ دیا۔ ہاتھ جلا تو درد سے اُس کے منہ سے سی، نکل گئی اور اُس پر عورت کا جو جادو سوار ہو گیا تھا، وہ اُتر گیا۔ عورت نے سر اُس کے باؤں پر رکھ دیا اور یہ کہہ کر چلی گئی کہ میں تمہارے قابل نہیں.... کل تم نے بھی اپنا آپ گال میں چھینک کر اپنے گناہوں کو جلا ڈالا ہے۔ دل میں پیار کو زندہ رکھو۔“

پیار کے لفظ نے جیلاس کو بیدار کر دیا اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ بوڑھے نے اُسے کہا کہ وہ ناشتہ تیار کرتا ہے لیکن وہ چل پڑا۔

”ناز انتظار کر رہی ہوگی۔“ اُس نے کہا اور دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔
صبح کا اجالا بھرا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا قریبی بس سٹاپ پر پہنچا۔ بسیں چل پڑی تھیں۔ اُس کے نمبر

کی بس آئی تو وہ اس میں سوار ہو گیا۔

”سیک تو اللہ کا قہر تھا۔“ اُسے پچھلی سیٹ سے آواز سنائی دی۔

”ماٹھ برس عمر ہو گئی ہے۔ ایسی آگ پہلی بار کبھی ہے۔“ ایک اور مسافر نے کہا۔

”آپ لوگوں نے شاید دیکھا نہیں۔“ ایک مسافر نے کہا۔ ”میں وہاں موجود تھا۔ اس بلڈنگ میں

رہنے والے بھال رہے تھے لیکن ایک آدمی فائر بریک کی سیڑھی لگا کر چلتی بلڈنگ کی دوسری منزل میں

چلا گیا اور ایک پتھر کو آگ سے نکال کر سب سے اُڑا اور اسے سننے والے درخت پر

آگرا.... وہ تو بچہ تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو دیکھا تو بھی یقین نہیں آیا کہ کوئی انسان اتنی بہادری کر سکتا ہے۔“

”وہ اُس کا اپنا بچہ ہوگا۔“ ایک اور مسافر نے کہا۔ ”اپنے بچوں کے لیے بزدل بھی آگ میں

گود جاتے ہیں۔“

”ٹھنکے پتھر اُس کا اپنا نہیں تھا۔ یہ واقعہ مانے والے نے کہا۔“ کسی اور کا تھا۔“

”پھر وہ کوئی فرشتہ ہوگا۔“ ایک مسافر نے کہا۔ ”ورنہ کراچی کا شہر تو چوروں اور اُٹھائی کیروں سے

بھرا پڑا ہے۔“

جیلاس رہا تھا۔ اس کا سینہ فخر سے پھلتا جا رہا تھا۔ اُس کے جی میں آئی کہ سب کو سنا دے

کہ کسی کے بچے کو آگ سے نکال لانے والا میں تھا اور میں فرشتہ ہوں لیکن وہ جھینپ گیا جیسے اُس

نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تو سب کو انھیں گے کہ تم جھوٹ بولتے ہو تم حبیب خترے ہو۔ تم

ہمارے تالے توڑتے ہو اور ہماری عیسیں کاٹتے ہو تم بڑا کی لعنت۔ تم بچوں کو جلاتے ہو۔

اُسے غصہ آئے لگا۔ اُسے بوڑھے موسیقار پر بھی غصہ آیا کہ اُس نے اُسے مرنے نہ دیا

کی ستار اُس کے سینے اور خیر کے درمیان آگئی تھی۔ اُسے اچانک یاد آگیا کہ اُس کا خیر ستار لوانا کی تا

میں رہ گیا ہے۔ وہ خالی ہاتھ کبھی باہر نہیں نکلا تھا۔ وہ حبیب ختران گیا بس میں کچھ مسافر کھڑے تھے۔

میں پولیس اور شہر میں جیل خانہ ہے، اور میں اس شہر کی ایک پرزہ ہوں۔
 ”مگر تمہارے خلاف کوئی مقدمہ تو نہیں چل رہا۔“ ناز نے کہا۔ ”تم ضمانت پر بھی نہیں، پھر تمہیں پولیس اور جیل خانے کا کیا ڈر ہے؟ تم زمین دوز دنیا سے نکل کر اوپر آ جاؤ، تم ارادہ کر لو کہ یہ دھندلا چھوڑ دینا ہے۔“ ناز نے ٹسکرا کر کہا۔ ”تمہیں شاید یہ ڈر ہے کہ میں تمہیں دھوکہ دوں گی۔“

”تم مجھے دھوکہ دے چکی ہو۔“ جیدانے کہا۔ ”مجھے بوڑھی بازار کی لگ میں تم نے جھینکا تھا۔ مجھے میرے دوستوں کے سامنے تم نے شرمسار کیا اور انہوں نے مجھے زن مردار اور زہل کہا۔ تم مجھے اس منسل پر لے آئی ہو جو مجھ سے چھین لی گئی تھی اور جہاں میں اب لوٹ کے جانا نہ چاہتا تھا۔“ اس نے آہ لی اور اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز سے بولا۔ ”مجھ سے وہ سب کچھ چھین لیا گیا تھا جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر زندہ رہے تو وہ انسان نہیں رہتا۔ میں انسان نہ رہا، وہ نہ بن گیا۔ میں نے اپنے آپ میں چھین لینے کی طاقت پیدا کر لی۔ پیار کی لاش میرے وجود میں لگتی سڑتی رہی اور زہر بن کر میرے خون میں شامل ہو گئی۔ میں سانپ بن گیا، تم جانتی ہو میں لوگوں کو کس طرح ڈس رہا تھا، تم نے مجھے دھوکہ دیا۔ مجھے کھوئی ہوئی محبت دے کر اور مجھ سے چھینا، تمہارا پیار مجھے ٹوٹا کر میرا زہر مار دیا۔ دھوکہ چڑھائیں دیا گیا تھا، تم نے اس کا انتقام مجھ سے لے لیا۔ میں نے تمہیں قید میں رکھا تھا، تم نے مجھے زنجیروں میں باندھ دیا۔“

وہ عجیب سے لکھ میں بولتا جا رہا تھا۔ ایسے لکھ میں اس نے پہلے کبھی بات نہیں کی تھی۔ وہ چونک کر انبارل ڈھن کا آدمی تھا اور انتہا پسند اس لیے وہ اپنی بے بسی کو بھی انتہا تک پہنچا رہا تھا۔ وہ اپنی نفسیاتی کیفیت کی بھول بھلیوں میں کھو گیا تھا۔
 ”کیا تم میری زنجیر توڑ سکو گے؟“ ناز نے اسے چھپڑنے کے لیے کہا۔ ”مجھ سے جان چھڑا سکو گے؟“

جیدانے کہا۔ ”اس نے ناز کو سر سے پاؤں تک دیکھا، اس کے چہرے کا تاثر بردہ لے لگا۔ اس کے ہونٹ ہنسنے لگے۔“

”نہیں۔“ جیدانے کہا۔ ”میں تمہاری زنجیریں نہیں توڑوں گا۔ محبت کا جواب محبت سے دوں گا، لیکن اپنی اس دنیا سے نہیں بھاگوں گا۔“ اس کے لکھ کی بے بسی اور جذباتیت ختم ہو گئی اور وہ علوی مجرموں کے استاد کے لکھ میں بولا۔ ”کراچی کے استاد کی کہیں گے، جیدانے کہا کہ اچھے دیکھا کہ سچہ کیا میرے اوٹوں کے استاد کو اور تمہاں ہوں گے؟... میرے ہاتھوں میں جسے پہلے بچے میری لکڑی پر نہیں بیٹھ سکتے۔ وہ گلی، بالی، گلنار اور ششی کو خراب کر دیں گے۔ یہ میری بے عزتی ہے کہ میرے علاقے میں کوئی دوسرا استاد آئے۔ میں نے وزیروں سے پوچھا کہ اپنے علاقے کے تھاندار بدلو لے میں ملک کی باگ دوسرے ہاتھ میں ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور علاقے کے استاد کی کانٹا آواز میں بولا۔
 ”میں یہ بادشاہی چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔“

”اور میں اس بچے کے ساتھ قیدیں پڑی رہوں گی؟“ ناز نے ایسی سنجیدگی سے کہا جس میں غصے کی جھلک بھی تھی۔ ”کتنی؟“ ایک نہ ایک دن تمہاری داشتہ کملاؤں گی، اور پھر ایک دن یہاں

بہر پر رکھ دیا
 جیدانے خیالی سی میں ہیچھے بٹھا اور اس کی پیٹھ ناز کے جسم کے ساتھ لگ گئی۔ جیدانے کہہ کے بچے میں کہا۔ ”مال۔“ اور اس نے سکون کی لمبی آہ لی۔ ناز کے چند ایک پریشان ہال جیدانے گالوں سے ٹک کر رہے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ ناز نے جذبات سے کانپتی ہوئی سرگوشی کی۔ ”آج تمہارے منہ سے نہ شراب کی بو آ رہی ہے نہ چرس کی۔“
 جیدانے آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور بڑی آہستگی سے سرگھما کر ناز کو دیکھا۔ جیدانے آنکھوں کا تاثر دیا اور ان کے ساتھ جیسے وہ خود چلا رہا ہو کہ آج اس کا وجود ان لوگوں سے خالی کیوں ہے۔

”اوہ! جیدانے کراہ کر کہا۔ ”گو دل گھما لے سے سر کے زخم میں درد ہوتا ہے۔“
 اس میں نے اسے جذبات سے نکال دیا اور اس کے چہرے پر درد کا تاثر دیکھ کر ناز بھی حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی اور اس سے زخموں کے متعلق پوچھنے لگی۔ جیدانے درد کے باوجود پڑنی سے جواب دیا۔ وہ ناز کو اور زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ناز نے چائے بنا کر پیالی اس کے ہاتھ میں دے دی۔ جیدانے اسے کھیا کھیا سا، کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ ناز نے اسے غور سے دیکھا۔

”میں نے تمہیں پریشانی کی حالت میں کبھی بارگم اور کھویا بوا دیکھا ہے۔“ ناز نے کہا۔ ”آج بھی تم پریشان ہو کر مجھ پر بے ہوشی سے لگتے ہو۔ رات کس کی نہیں تھی؟“
 ”ناز! جیدانے کہا۔ ”تم نے پرانے وقتوں کے ٹاکوؤں کی کہانیاں پڑھی ہوں گی.... منی بھی ہوں گی۔ ان ٹاکوؤں میں سے جو بھی پڑھا اچھا وہ عورت کی محبت میں گرفتار ہو گئے پڑ گئے۔“
 ”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ عورت محبت کا فریب دیا کرتی ہے؟“ ناز نے کہا۔

”دونوں باتیں ہیں۔“ جیدانے کہا۔ ”پولیس کی سمن اور چالاک عورت کو فریب دینے کا ذریعہ بناتی ہے اور عورت مخلص ہو تو بھی اس کی محبت مجھ جیسے ٹاکو کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔“
 ناز تیس پڑی اور بولی۔ ”تم مجھے فریبی سمجھ رہے ہو یا میری محبت میں تمہیں غلوں نظر آتا ہے؟“
 ”تم میری کمزوری بن گئی ہو۔“ جیدانے کہا۔ ”تمہاری محبت میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ تمہارے اور اس بچے کے پیار نے میرا زہر چوس لیا ہے۔“

”مجھے جیدانے!۔“ ناز نے کہا۔ ”کہوں اپنے آپ کو فریب دیتے ہو یہ دھندلا چھوڑ کیوں نہیں دیتے تمہارے پاس روپے کی کمی نہیں مجھے معلوم ہے کہ اس مکان کے کسی کمرے میں تم نے زلیات وغیرہ بھی دبا رکھے ہوں گے، انہیں نکالو اور کراچی سے نکل چلو تم نے دنیا بھی بے تم میں عقل ہے۔ اچھے بُرے کو سمجھتے ہو کہ کسی اور شہر پہلے چلتے ہیں۔ وہاں کوئی باعزت

کا رو بار کر لو؟
 ”کسی اور شہر کی نہیں کسی اور ملک کی بات کرو۔“ جیدانے کہا۔ ”اپنے ملک کے برہمن

ایک اور ناز آجاتے گی، اور اس وقت یہ بچہ کراچی میں جیسے کلاٹ رہا ہوگا۔

”داشتہ نہیں۔“ جیدانے کہا۔ ”میں بچہ چکا بول کر محبت کا جواب محبت سے دل کا تم میری بیوی بنو گی۔“

”اور تھوڑے ہی عرصے بعد میں جید سے جیب کمرے کی بڑھ کلاؤں گی۔“ ناز نے جلیلی کا آواز میں کہا۔ ”اور میں تمہارے قاتلوں کی داشتہ بنوں گی۔“ مجھے پولیس کے افسروں کے گھروں میں بھیجا جایا کرے گا، یا میں اس وقت تک صرف اس قابل رہ جاؤں گی کہ گندے بغلیظ چرسیدوں اور انیمیل کے لیے طوائف بنادی جاؤں گی۔“

”کیا بچہ رہی ہو ناز؟“ جیدانے حیرت سے پوچھا۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہو؟... قتل؟... مجھے کون قتل کرے گا؟“

”بوش میں آجیدے بد معاش!۔ اب ناز کے لیے میں حکم اور عتاب تھا۔“ میں جانتی ہوں تم یہ دھندلائیں چھوڑ سکتے۔ اس چکر سے تم نہیں نکل سکتے لیکن میں کراچی سے نکلنا پڑے گا میں سوچ رہی تھی کہ تمہیں اصل بات بتاؤں یا دل میں رکھوں میں اس کو شش میں بھی کر تم میری محبت کی خاطر کراچی سے نکلنے پر آمادہ ہو جاؤ میں نے کبھی بھی توقع نہیں کھی کہ تم شریفانہ زندگی میں واپس چلے جاؤ گے۔ میں نے ناول اور افسانے پڑھے ہیں جن میں کوئل اور قاتلوں کو آخر میں زامہ اور پارسا بنا دیا جاتا ہے اور ان کے ہاتھوں میں تسبیح دے دی جاتی ہے۔ یہ سب افسانے ہیں میں انہیں سچی کہانیاں سمجھا کرتی تھی لیکن ڈاکٹروں کی دنیا میں اگر کوئی کچھ تو معلوم ہوا کہ وہ سب سن گھڑت قصے تھے۔“

”مجھے وہ بات بتاؤ جو تم دل میں رکھنا چاہتی تھیں۔“ جیدانے کہا۔ ”اور یہ بھی بتاؤ کہ تم یہ بات مجھ سے کیوں چھپا رہی تھیں۔“

”اس لیے کہ کوئی شاعر اپنے استاد کے ہاتھوں یا استاد اپنے شاگرد کے ہاتھوں کٹ نہ مرے۔“ ناز نے کہا۔

”غور سے سوچو جید!۔ ناز نے کہا۔ ”کل رات جب تم زخمی حالت میں باہر نکل گئے تھے تو میں سمجھی کہ تم مر چکے ہو۔ میں نے اسے جانے ہو میں تمہاری راہ دیکھتی رہی۔ تم بڑے بہت دور گزری تو میں ادا ٹیپو آگئے۔ انہوں نے تمہارے متعلق پوچھا میں نے انہیں بتایا کہ تم زخمی ہو گئے تھے اور کسی ڈاکٹر کے پاس چلے گئے ہو۔ انہوں نے پوچھا کہ مال کہاں ہے میں نے کہا کہ وہ کچھ بھی نہیں لایا۔ وہ شراب میں بدمست تھے۔ کہنے لگے تم کجاس کرتی ہو ہم مان نہیں سکتے کہ اس نے ایک بھی پاکٹ نہ ماری ہو میں نے انہیں بتایا کہ تم نے ایک بچے کو آگ سے نکالا ہے اور زخمی ہو گئے ہو۔ انہوں نے تمہارے لکھا اور کہنے لگے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ بچے کی مال نے تمہیں ایک مار دیا تھا جو تم نے نہیں لیا تھا۔“

جید کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

”انہوں نے کہا کہ استاد ہمیں دھوکہ دے رہا ہے۔“ ناز نے کہا۔ ”اور سونے کا ہاتھ اسے پاس ہے میں نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی لیکن وہ زمانے تب ٹیپو نے مجھے کہا۔ ہم نہیں آج اور کل کی رات دیتے ہیں۔ اس کے بعد تم یہاں نظر نہ آؤ۔ اس حوالے سے کچھ سوچنا ہے۔“

اکرم یہاں سے نہ گئیں تو ہم تمہیں کوٹھے پر پہنچا دیں گے۔ وہ بابک کرتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔“

”یعنی آج رات تمہاری یہاں آخری رات ہے۔“ جیدانے طنز پر کہا اور اپنے ناف پر ہاتھ رکھا۔ چوک کر بولا۔ ”خبر دہیں رہ گیا ہے۔“ وہ میز کی طرف بڑھا جس کی دراز میں اس کا ریو الو پڑا تھا۔ ناز نے ایک کر دراز کھولی اور ریو الو نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”وہ بہت غصے میں تھے۔“ ناز نے ریو الو اپنے پیچھے کر کے کہا۔ ”کسی نہ کسی کا خون ہو جائے گا خون تمہارا بھی ہو سکتا ہے میں ان سے بات کروں گی۔“

”اور میں تمہاری چوڑیاں پس کر سیاں بیٹھا رہوں گا؟“ جیدانے ناز نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ٹھنڈے دل سے سوچ لو مجھ سے غلطی ہوئی جو تمہیں یہ بات بتادی۔ ذرا اگل جاؤ جید سے میں اپنے آپ کو گولی مار دوں گی، تمہیں مرنے نہیں دیکھ سکتی۔“ ”کیا تم انہیں اتنا شیر دل سمجھتی ہو کہ مجھے قتل کر دیں گے؟“

”تم ان کے خدا نہیں۔“ ناز نے کہا۔ ”تمہارا رشتہ جرم اور گناہ سے قائم ہے جو کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا ہے۔“

اتنے میں صحن میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی جید ابامرنگل گیا۔ ”متنا اور میو جڑا ہے۔“ جیدانے کہا۔ ”میں نے کچھ پیچھے تھا۔ ٹیپو نے گھوم کے دیکھا اور جید کو کچھ کرک گیا۔“

”تم نے کچھ استاد!۔“ ٹیپو نے کہا۔ ”مٹنے نے پیچھے دیکھا اور وہ بھی ٹیپو کے پاس آگیا۔ ناز کمرے سے نہ نکلی۔“ ”ہاں!۔“ جیدانے استادوں کے لیے میں کہا۔ ”مکو میرے لیے کیا حکم ہے؟ کیا میں بھی اس کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں؟“

”بوش میں آؤ استاد!۔“ مٹنے نے کہا۔ ”کل ہمارے درمیان خیر اور چاقو نکل آئے تھے۔ کیا یہ اچھی بات ہے؟... ایک چھوڑی کے پیچھے ہیں انہیں دیکھا ہے ہو؟“ ”اور اب تم اتنے بے ایمان ہو گئے ہو کہ سارا مال مضمم کر رہے ہو۔“ ٹیپو نے کہا۔ ”اور جھوٹ بھی بول رہے ہو۔“ مٹنے نے کہا۔

”تم نے کچھ میں سے کچھ کو نکالا تھا؟“ ٹیپو نے کہا۔ ”تم نے؟... لوگوں کی پچیاں خوا کر کے پیچھے والا کسی کے پیچھے کو جاتی ہوئی آگ سے نکال سکتا ہے؟“ ”میں اپنے زخم تمہیں دکھاؤں؟“ جیدانے کہا۔ ”کھول کر دیکھ لو۔ یہ چھری چاقو کے نہیں آگ کے زخم ہیں۔“

”اور سونے کا وہ مار کہاں ہے جو تمہاری چھوڑی کھتی ہے کہ بچے کی مال نے تمہیں دیا تھا؟“ ”مٹنے نے کہا۔“ ”اپنی داشتہ کی طرح کہ دو کہ تم نے مار لیا ہی نہیں تھا۔“ جیدانے آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ دوہین قدم تو فاصلہ تھا۔ اس نے وہیمی سی آواز سے مٹنے سے

نہا۔" ہارمیس دسے دول؟ اور اس کے ساتھ ہی جیاد کے دونوں ہاتھ کبلی کی سی تیزی سے چلے
وہ لڑنے اور لڑنے میں ہمارت رکھتا تھا۔ اس کا ایک گھونسہ نٹنے کے سپٹ میں پڑا وہ دوسرا ہوا تو
دوسرا گھونسہ نیچے سے اُس نے ٹھوڑی پر مارا۔ مٹا جس زندہ ادھیر عمر آدمی تھا۔ گھونسے کا رے پڑے
اور وہ بچھے کو گرا۔

غیسو نے ناف سے جاقو نکال لیا۔ اُدھر مٹا اٹھا اور اُس نے خنجر نکال لیا۔ جیاد خالی ہاتھ تھا۔
اُسے معلوم تھا کہ حرام پیشہ لوگوں کی لڑائی اُس وقت ختم ہوا کرتی ہے جب ایک فریق اپنے خون
میں نہا کر گر جاتا ہے۔ جیاد کا گردہ تو کراچی کا خونخوار گردہ مشہور تھا۔

جیاد خالی ہاتھ تھا۔ مٹا اور غیسو لال انگارہ آنکھوں سے اُسے گھورتے اُس کی طرف بڑھے۔ نہیں
پتہ چل چکا تھا کہ جیاد خالی ہاتھ ہے اگر اُس کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ اب تک نکال چکا ہوتا۔
جیاد پیچھے ہٹا اور نہایت تیزی سے اُس نے فیض امار گردوں ہاتھوں میں لی اور اُس کے کوزی۔
جرائم پیشہ لوگوں کی لڑائی کے داؤ بیچ کے مطابق اُسے جاقو اور خنجر کے داؤ فیض سے روکنے تھے
فیض کی بجائے کوئی اور پڑا ہوا چادر ہو تو اس میں جاقو، چھری یا خنجر کے وار لیے جاسکتے ہیں لیکن اُس
کے لیے قدموں کی تیزی اور جسم کی چھرتی کی ضرورت ہوتی ہے۔

مٹا اور غیسو جیاد کے پہلوؤں کی طرف ہو گئے۔ اس طرح وہ دونوں کے وار بیک وقت نہیں
روک سکتا تھا۔ ایک پہلو پر ایک کا دار روکنا دوسرے پہلو یا پیٹ پر دوسرا دشمن وار کر دیتا۔ تینوں غموش
تھے۔ وہ ایک دوسرے کو زلکار رہے تھے نہ دھمکی دے رہے تھے۔ اب زبان کو نہیں لٹھل
کو کام کرنا تھا۔ جیاد کے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

اچانک ایک آواز سنائی دی۔ "اگر ایک قدم اور آگے بڑھایا تو..."

تینوں نے اُدھر دیکھا۔ ناز ہاتھ میں روایو لیے اُن کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ
میں باورچی خانے کی چھری تھی۔ اُسے بھی معلوم تھا کہ یہاں ایک قاتل ہونا ہے اور وہ جیاد ہی ہو
سکتا ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اُن ہیں قاتل ہوا تھا اور اُس کی لاش یہیں ایک سیبت نال کمرے
میں دفن ہے۔ ناز نے اُدھر پہنچو ڈرا لے کے لیے نہیں آئی تھی۔ وہ کوئی چلا لے کا ارادہ لے کر
آئی تھی۔

مٹا اور غیسو بک گئے اور قہر بھری نظروں سے ناز کو دیکھنے لگے۔ ناز قریب گئی تو جیاد نے
اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ اُس سے روایو لینا چاہتا تھا لیکن ناز نے چھری اس کے ہاتھ میں سے
دی اور روایو اپنے پاس رکھا۔ نالی مٹے اور غیسو کی طرف تھی۔

"دونوں کی لاشیں اُن کی ٹہلیوں پر پھینک کر اوپر مٹی ڈال دیں گی۔" ناز نے کہا۔
جیاد نے اُن سے ہتھیار لینے کی بجائے انہیں کہا۔ "خنجر جاقو اندر کر لو اور میرے ہاتھوں
اپنا خون نہ کراؤ۔"

دونوں نے اپنے ہتھیار فیضوں کے اندر نافوں میں اُس لیے۔

"عورت کو کہاں کہاں ساتھ رکھو گے استاد؟" غیسو نے کہا۔

"ہم سے بگاڑ کر کچھتاؤ گے۔" مٹے نے کہا۔ "زندہ رہنا چاہتے ہو تو اسے کہو کہ ہم پر

گولی چلا دے۔ پھر ہماری لاشیں اُن کی ٹہلیوں کے ساتھ دفن کر دینا۔"
"ناز! جیاد نے اسے کہا۔ "اندر چلی جاؤ۔ روایو اپنے پاس رکھو۔" وہ چلی گئی تو جیاد نے
مٹے اور غیسو سے کہا۔ "اب بتاؤ کیا چاہتے ہو میرے پاس کوئی ہارمیس اور میں نے کل ایک
پیسہ نہیں اٹھایا۔"

دونوں اسے ایسی نظروں سے دیکھتے رہے جن میں صلح صفائی کا بلکا سا بھی اشارہ نہیں تھا۔
اُن کی آنکھوں میں قہر اُترا ہوا تھا۔

"تم جانتے ہو میں نے کسی کو کبھی بخش نہیں۔ جیاد نے ٹھہری ٹھہری آواز میں کہا جس میں دھمکی نہیں
بلکہ دوستی کا رنگ تھا۔ وہ کہتا تھا۔ "تم میرے شاگرد ہو رہم نے بڑا لبا سفر طے کیا ہے۔ اب ہم
اگلے نہیں چل سکیں گے۔"

"اس چھوڑی کو چلا کر واپس آؤ۔" مٹے نے کہا۔ "دیکھو عورت نے ہماری دوستی پر کسی چھپری
چلائی ہے۔"

"اور عورت ذات پر اتنا بھروسہ نہ کرنا سادہ۔" غیسو نے کہا۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ایک
عورت کے ہاتھوں اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکا۔ اُس نے کہا۔ "تو مجھے جانتا ہے۔ میں
تیری چھوڑی سے بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔"

ہتھیار پٹروں کے اندر چلے گئے تھے اور تینوں وہیں کھڑے ہاتھوں پر رہے تھے۔ وہ دھیمی
آواز میں بول رہے تھے مگر اس دھیمے پن میں ارادے کی کھینچ اور قہر تھا۔ تینوں قاتل تھے تینوں نے
جسموں پر کئی لڑائیوں کے زخموں کے نشان تھے۔

"سودو تلو! جیاد نے کہا۔ "تم نے ٹھیک کہا تھا کہ میری استاد ہی ہوگی۔ مجھ سے منت
پوچھنا کہ وہ کیا ہے۔ میں تمہیں بتا ہوں کہ میں جا رہا ہوں۔"

"کہاں؟"

"اُس سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔" جیاد نے کہا۔ "سبھ لو میں ٹھیک کیا ہوں سبھ لو میں مار گیا
ہوں میں ناز اور پچھ کو ساتھ لے کے جا رہا ہوں۔ جیاد کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے آہ لی اور اُس
کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہاتھوں سے آنکھیں پونچھ کر بولا۔ "مجھے اب اپنے آپ پر بھروسہ نہیں رہا۔
میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ تم نے تین چار بار دیکھا ہے کہ تم نے مجھے واردات پر ساتھ
چلنے کو کہا اور میں نے ٹال دیا۔"

"میں پھر کہتا ہوں کہ اپنی زندگی برباد نہ کرنا سادہ۔" مٹے نے کہا۔ "تجھ اپنے آپ پر بھروسہ اس
لیے نہیں رہا کہ تو عورت پر بھروسہ کرنے لگا ہے۔"

"نیں مٹے! جیاد نے کہا۔ "میں اب تمہارے کام کا نہیں رہا۔"

"شس استاد! غیسو نے کہا۔ "جانا ہے تو جا۔۔۔ چلا جا لیکن تو یہ چھوڑی ساتھ نہیں لے جانے
کا۔ یہ تیری بیوی ہوتی تو بھی میں اسے نہ جانے دیتا۔۔۔ اندر جہاں پڑا ہے، یہ چاہے بھیسیم کر لے چاہے
سارا لے جا۔ چاہے سارا چھوڑ دیا۔ میں کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ چھوڑی یہاں سے نہیں جانے کی چلی
گئی تو کراچی سے نہیں نکلے گی۔"

"غیسو! جیاد نے کہا۔ "مجھے لکار رہے ہو؟ چلتے جاتے تیری لاش غائب کر جاؤں گا۔ اورو

اور تم سُنئے! ہوش میں آؤ۔ میرے ہاتھ سے نہ مرو۔ میں نے اپنے دوستوں کا ٹولہ بھیجی نہیں کیا تھا۔
 سُنئے! میں نے اُسے گہری نظروں سے دیکھا، پھر ناز کے کمرے کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اُس چھوٹی
 نے میں ہسپتال دکھایا ہے۔ یہ یہاں سے نہیں جاتے گی۔ تو چلا جا جیدے۔“ اُس نے میں ہسپتال
 دکھایا ہے۔ ہم اسے کچھ دکھا کر رخصت کریں گے۔... یہیں مرنے سے نہ ڈرا جیدے! اہم زندہ ہی
 محب میں۔ زندگی سے اشنا پارہوتا تو یہ دھندلا کر تے؟ کراچی بندر کی گودی میں لوٹ کر لیٹتے۔... تو چلا جا۔
 اگر یہ چھوٹی خود میں دے دے تو ہم تینوں کے لیے اچھا ہے، نہیں تو خون غرا بہو گا اور تو جانتا ہے
 تیرے لیے جیل کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ ہم سلاطین خواہ میں۔... سوچ کر بنا دینا تیری کیا مرضی ہے
 ... جیل بے ٹیپو!
 دونوں باہر نکل گئے۔

جیدا سر جھکائے آہستہ آہستہ کمرے میں چلا گیا۔ ناز اُس کے انتظار میں تھی۔ اُس کے چہرے پر
 پریشانی، غم اور غصہ زیادہ تھا۔ جیدا نے اُسے دیکھا اور کچھ کہنے بغیر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ گہری سوچ میں کھویا
 ہوا تھا۔

”کیا کہتے ہیں؟“ ناز نے پوچھا۔
 جیدا نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ ناز کے چہرے پر لڑکپن کا لڑپن۔
 ”میں نے پوچھا ہے وہ کیا کہتے ہیں۔“ ناز نے بی ادب مزاح میں ایسے انداز سے کہا جیسے وہ اپنے
 نوکر سے بات کر رہی ہو۔ ایسے انداز سے وہ کبھی نہیں بولی تھی۔
 ”وہ تمہیں مانگ رہے ہیں۔“ جیدا نے وہی مروتی سی آواز میں جواب دیا۔

”تم نے کیا جواب دیا؟“
 جیدا کے ہاتھ میں چھری تھی جو ناز نے باورچی خانے سے اٹھا کر اُسے دی تھی۔ جیدا نے ناز کو کوئی
 جواب دینے کی بجائے دو انگلیاں چھری کی دھار پر پھیریں۔

”جیدا!۔“ ناز نے جھنجھلا کر کہا۔ ”میں نے کیا پوچھا ہے؟“
 ”میں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا۔“ جیدا نے ایسے لمحے میں کہا جو کسی غڈ سے کالہ نہیں
 تھا۔ کہنے لگا۔ ”میں نے ایسے چیلنج کا جواب کبھی زبان سے نہیں دیا۔ یہ چھری جواب دے گی۔“
 ”کیا تم ہوش میں ہو؟“ ناز نے اُس کے سر پر ہاتھ دھکے کھجھوڑا اور کہا۔ ”ابھی کبھی تمہارے
 شاگرد تمہیں کاٹ دیتے تو آگے تھے۔ تم نے خود ہی بتایا تھا کہ تمہاری طاقت تمہارے شاگردوں پر
 ہے۔ ان کے بغیر تم کچھ بھی نہیں تم نے انہیں کچھ دیا ہے۔“ ناز نے جواب دیا۔ ”میں نے تم سے

مجھے مانگا ہے۔ یہ ان کی ایک شرط ہے جو وہ سمجھتے ہیں کہ پوری کوالیس گئے۔ انہیں یقین ہے کہ وہ مجھے
 تم سے چھین لیں گے۔ کیا تم ان کی یہ شرط پوری کر دو گے؟ اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا کرو گے؟
 جیدا نے اس کے چہرے پر لڑکپن جادیں۔ ناز نے اس کی آنکھوں میں عجیب سا اثر دیکھا یہ تیز
 اور کچھ بے بسی کا اثر تھا۔ ناز نے جیدا کے ساتھ اس طرح غصے سے اور گناہ انداز سے کبھی بات نہیں

کی تھی۔ کبھی جرات ہی نہیں کی تھی۔ وہ تو غنڈوں کے اس بادشاہ کی قیدی تھی۔ اُس کے رحم و کرم پر تھی۔ یہ تو
 جیدا کی نفسیاتی کمزوری تھی کہ اُس نے ناز سے کچھ دیکھا کہ وہ اُس کے جسم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں
 رکھے گا اور اسے اپنے دے دے کی طوائف بنائے گا۔ اُس نے جہاں پیشہ برتے ہوئے اور اخلاق
 کی تار پکڑتیاں ہیں رہتے ہوئے بھی یہ کر کے دکھا دیا کہ اُس نے ناز کے اتنے دلکش اور تیز
 جسم کے ساتھ ذرا سی بھی دیکھی کا اظہار نہ کیا۔

یہ دراصل مردانہ عظمت تھی جس نے ناز کو جیدا کا گرویدہ بنا دیا اور وہ جان گئی کہ اُس درندے کی
 کھال میں ایک انسان ابھی زندہ ہے۔ ناز اپنا نہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ اُسے اس درندے کے ساتے
 میں پناہ مل گئی اور اسی کی وجہ سے وہ گئی۔ اُس نے جیدا کے ساتھ محبت کا جو اظہار کیا اور محبت میں جو خلوص
 پیدا کیا تھا، اس میں بناوٹ یا فریب نہیں تھا۔ وہ دنیا کی دھتکاری ہوئی تھی۔ فریب خورہ تھی۔ اس دنیا کا
 بھی سامنا کرنے کے قابل نہیں تھی۔

جیدا ناز سے محبت نہیں کرتی۔ وہ پیارا اور محبت کا قائل ہی نہیں تھا۔ اُس کے پاس ایک سے
 ایک خوبصورت طوائف موجود تھیں مگر اُس کا نفسیاتی ڈھانچہ ویسا ہی کمزور تھا جیسا برعادی مجرم کا ہوتا ہے۔
 ناز نے اس کے ساتھ دلی محبت کا اظہار ایسے انداز سے کیا جس میں فکری مکالموں اور خافوں کا ٹھل نہ
 تھا، بلکہ اس کے انداز میں گھریلوں تھا۔ اس کی ہر حرکت گھر والی تھی۔ اس کی محبت میں عربانی اور بے حیائی
 نہیں تھی۔ یہ ستور محبت تھی جس میں جیدا کو ماں کی بھی بوائی، بہن کی بھی اور جس میں اُس نے باپ کی شفقت
 کا بھی ذائقہ محسوس کیا۔ یہ اس کی کھوئی ہوئی یا اس سے پھینچی ہوئی منزل تھی اور وہ جتنا کہ ناز کے
 وجود اور اُس کے پیار میں اُسے منزل کے نشان نظر آنے لگے تھے۔

پھر اُن کی بیٹی کا نوزائیدہ بچہ دنیا میں آگیا۔ ناز کا خیال صحیح تھا کہ درندے کی کھال میں انسان ابھی
 زندہ ہے۔ جیدا بچے کو اٹھا لیا اور اس کے جب بچے کو ناز کی گودی میں ڈالا تو اسے کچھ ایسا سکون
 محسوس ہوا جیسے وہ اپنا غم غمیدہ اور مجبور بچپن اٹھا لیا ہو اور اب وہ اسے ان خوشیوں سے بھر دے گا
 جن سے اس کے اپنے بچپن کو محروم کر دیا گیا تھا۔

یہ ایک نفسیاتی عمل تھا۔ جیدا کو کچھ کھڑا تھا وہ اس کے ذہن لا شعور کی باہر کی کڑی کے سخت
 ہو چکا تھا۔ اب وہ یہ جو کہ اٹھا کہ اُسے پیار نے اُس لیا ہے اور پیار نے اُس کا زہر ماریہ ہے
 یہ غلط نہیں تھا۔ پیار انسانی فطرت کے زہر کو ماریہ کرتا ہے۔ انسانی فطرت خالصتاً پیار ہے۔ زہر ہی نہیں
 اس میں زہر والا جاتا ہے۔

لوڑھے موسیقار نے اسے بتایا کہ تو جیدا کا گناہ بگارت اورندہ ہے مگر پڑا پھر جیدا بارادخلوص
 کی ایک شکست میں قید ہو گیا۔ ناز، بچہ اور موسیقار۔ جیدا وہ زندہ سکا جس سے کراچی کے استاد
 بھی ڈرتے تھے۔ وہ ایک بچے کی خاطر آگ میں کود گیا اور جب اُسے کچھ سمجھ نہ آئی کہ اس کے اندر یہ
 کیا انقلاب آ رہا ہے تو اُس نے اپنی جان لینے کی کوشش کی۔ یہ اُس کی بے بسی کی انتہا تھی۔ انسان
 فطری طور پر نیک ہے۔ اس میں گناہوں کی آمیزش کی جاتی ہے جیدا تو گناہوں میں ڈوب گیا تھا بلکہ
 گناہوں کی کھیل کی کھلی بن گیا تھا۔ اسے جب نیکیوں کی کشتی پر چھینکا گیا تو تڑپنے لگا۔ وہ دراصل میں کٹ

گیا۔ ایک حصہ واپس نیچے اور پیک کی دنیا میں جا رہا تھا اور دوسرا جرم جیل اور چرس کی دلدل سے نکل نہیں رہا تھا۔

لوڑھے ستاروں کے ہاں اس کی کچھ بھلی تو اس کے کانوں میں اذان کی مقدس آواز بڑی۔ اتفاق سے تو ذی خوش احوال تھا۔ اذان اُس کی روح میں اتر گئی۔ اسے یاد آگیا کہ اس کا مقام اس جگہ سے قریب ہے جہاں سے اذان کی آواز اُٹھ رہی ہے۔ اُس نے ستاروں کے آگے تھپتا رہا کر کہا کہ اُس کی استاد کی ختم ہو چکی ہے مگر اپنے گھر میں گئی تو اُس کے سامنے مٹا اور ٹیپو آگئے جو زمین دوز دنیا کے بھیڑیے تھے۔ انہوں نے اسے لٹکا کر اُٹھایا۔ جب کہڑا اور غنڈوں کا استاد بدلا ہو گیا۔

مگر ناز کے سامنے جا بٹھا تو ناز نے اُس کے ساتھ ایسے بات کی جیسے سخت طبیعت کی مال اپنے احمق بیٹے سے جواب طلبی کرتی اور اُسے بھلا برا سمجھاتی ہے۔ جیسا کہ ناز کے غصے اور پیار میں مال کی جھلک نظر آنے لگی۔ وہ دبا گیا۔ وہ اس لیے بھی دبا گیا کہ ناز نے مردوں کی طرح سننے آکر اسے سجا لیا تھا اور پچاس لے لیے تھا کہ اس کے دل میں محبت ہے۔ محبت ہی جیسا کہ ضروری تھی۔ ناز اُس سے پوچھ رہی تھی کہ مٹے اور ٹیپو نے تم سے مجھے مانگا ہے تو کیا ان کی یہ شرط پوری کرو گے؟ نہیں کرو گے تو اپنے آپ کو سچانے کے لیے کیا کرو گے؟

”معلوم ہوتا ہے ناز۔“ جیسا نے بے چین ساہو کے جواب دیا۔ ”مجھے ایک آخری معرکہ لڑنا ہی پڑے گا میں تمہیں ان کے حوالے نہیں کروں گا۔“

”کیا پتہ نہیں ہو سکتا کہ تم خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤ؟“ ناز نے پوچھا۔ ”نہیں نکل سکتے ہیں مگر تم پہلے یہ ارادہ لگا کر لو کہ اس زمین دوز دنیا کو مجھ سے کے لیے ترک کر دو گے۔“

”ناز! جیسا نے آہ لے کر کہا۔“ میں اب اس دھندے میں رہ رہی نہیں سکتا، اور میں تمہیں اس دھوکے میں نہیں رکھوں گا کہ میں شریف اور پاک صاف انسان بن جاؤں گا میں اس لیے سناں گا۔“

کہیں بزدل ہو گیا ہوں۔ مجھے نکلنا ہے۔ میں اور اس پتے کو لے کر نکلنا ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا۔ ”لیکن میں ان دونوں کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ تم دروازہ اندر سے بند کر لینا۔ کوئی بھی دروازہ کھٹکھٹاتے، نہ کھولنا۔ میری آواز پر کھولنا۔ اگر کوئی کسی طرف سے اندر آجائے تو ریلوے گاڑی کے ریلوے ریلوے نہ چلانا۔ ضرورت سمجھو تو ڈرے بغیر گولی مارو۔ میں بہت جلدی والپس آنے کی کوشش کروں گا۔“

وہ باہر نکل گیا۔ ناز نے دروازے کی چٹنی چڑھا دی۔

جیسا علاقے کے تھانے میں گیا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے اُسے برآمدے میں روک لیا اور اُسے بتایا کہ اُس کے دوست مٹا اور ٹیپو آتے تھے اور بہت دیر صدیقی صاحب کے پاس بیٹھے رہے تھے۔

سب ان پکڑے مظلوم صدیقی اس تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او تھا۔ ”اُن کے جانے کے بعد صدیقی صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ جیسے کا خیال رکھنا۔ مناسب ہے کوئی نوکر نہ رکھنا۔“ اے۔ ایس۔ آئی نے پوچھا۔ ”کیا نوکر ہے؟“ استاد؟ وہ دونوں یہاں کیوں آئے تھے؟

”اے۔ ایس۔ آئی نے پوچھا۔ ”کیا نوکر ہے؟“ استاد؟ وہ دونوں یہاں کیوں آئے تھے؟

جیسا نے اُسے ہنس کر لوٹا لال دیا۔ جیسے وہ اے۔ ایس۔ آئی نہیں کوئی چٹاسی یا کسی کے گھر کا ملازم ہو۔ اُس نے اے۔ ایس۔ آئی کے سپٹ پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ”تم مت ٹھہراؤ یا کوئی دوسرا نہیں۔“ اور وہ تھاندار کے کمرے میں چلا گیا۔

”گھوڑاؤ۔“ سب ان پکڑے صدیقی نے اے۔ ایس۔ آئی سے پوچھی کہ رہے ہو؟ ایسی کیا مصیبت آئی ہے؟ کیا تم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے یا کسی دوسرے شہر میں قسمت آزمائے کا ارادہ ہے؟ ”وہ کیا بتا گئے ہیں؟“ جیسا نے پوچھا۔

”اچھی خبر نہیں سنائی انہوں نے۔“ تھاندار صدیقی نے کہا۔ ”مجھے تھکے کل کا سا مال مضمون کر گئے ہو میں تو کل شام سے تمہارے انتظار میں تھا۔ بوڑھی بازار کا مال کہا گیا؟ میں تو لٹکا کا انتظار کر رہا تھا مگر مٹا اور ٹیپو بتاتے ہیں کہ تم نے صاف جواب دیا ہے کہ تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگا میں کیسے مال جاؤں؟“

جیسا نے اُسے اپنے زخم دکھا کر تفصیل سے بتایا کہ وہ ہاتھ صاف کرنے ہی گیا تھا لیکن ایک مال نے اُس کا دماغ پھیر دیا اور اُس کے بچے کو نکال لانے کے لیے جلیبی بونی بلڈنگ میں چلا گیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ بچے کی مال اُسے سونے کا ڈرامہ تھی ہار دے رہی تھی جو اُس نے نہیں لیا۔ ”مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں تمہارے اس جھوٹ کو سچ مان لوں گا؟“ سب ان پکڑے پوچھا۔

”میں نے آپ سے کبھی جھوٹ تو نہیں بولا تھا۔“ جیسا نے کہا۔ ”اگر آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں رہا تو میں آپ کی شہرت نہیں کروں گا کہ آپ میری بات کو سچ مان لیں۔ آپ کو میرے چھوڑ کر لوں کی ہر ادات کا حصہ لٹا رہا ہے۔ کبھی آپ کے ساتھ دھوکہ نہیں کیا۔ آپ نے جب بھی خوفناکی کے لیے ایک یا دو چھوڑے مانگے ہیں میں نے فوراً حاضر کیے ہیں۔ آپ کی عزت کی خاطر میں نے دو دو سال کے لیے چھوڑ کر جیل بھجوائے ہیں۔ پھر آپ کو یہ دم کیوں ہو گیا ہے کہ میں آپ کو دھوکہ دے رہا ہوں؟“ ”اب کیا جا رہے ہو؟“

”سوچا بھی نہیں۔“ جیسا نے جواب دیا۔ ”جاؤں گا تو بتا کے جاؤں گا۔“

”پھر کہاں جا رہے ہو؟“

”جہاں انسانوں کی طرح رہ سکوں۔“ جیسا نے ہارے ہوئے سے بچے میں کہا۔ ”معلوم نہیں کیا بات ہے صدیقی صاحب! دل بیزار ہو گیا ہے۔“

”اُسے ساتھ لے جا رہے ہو؟“

”کسے؟“

”جسے تم نے گھر رکھا ہوا ہے۔“ سب ان پکڑے نے کہا۔ ”آئی مدت گزر گئی ہے۔ تم نے ڈیڑھ تک نہیں کیا کہ اپنے لیے تم نے جن کے مال رکھا ہوا ہے۔ کیا اس میں جارا حصہ نہیں؟... آج مٹا اور ٹیپو بتاتے ہیں کہ اصل مال تو تم نے دبا کے رکھا ہوا ہے۔... تم تو استاد ہو جیسا سیٹھ! اپنے دوستوں سے بگاڑنے کا نتیجہ دیکھ لیا ہے؟“

”وہ آپ کو کیا بتا گئے ہیں؟“

”مجھے اتنا سچا سمجھتے ہو کہ جو پھیل گئے بتا دوں گا؟“ صدیقی نے کہا۔ ”تم بتاؤ کہ کیوں آتے ہو۔“

”آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

”اور ہماری ضرورت کون پوری کرے گا؟“ سب ایک صدیقی نے کہا۔ ”کل کے مال کا حساب دو اور کیا نام ہے اس لڑکی کا... ناز... اس کی زیارت خرا دو۔ بیجی یاد رکھو جیلا استاد ہمارے چھوکر دل کی بے شمار دانتیں داخل دفتر کر چکا ہوں کئی کہیں رجسٹری نہیں کیے۔ لوگوں کے تالے ٹوٹ رہے ہیں۔ دن دھاڑے چوری کی وارداتیں سو رہی ہیں۔ عیسائی کھٹ رہی ہیں میں نے ہر واردات میں تھکائے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنی فوخری کو خطرے میں ڈال کر پورٹ درج نہیں کی۔ اگر درج کی تو داخل دفتر ہو کر دے۔“

”آپ نے ہر بار پوری فیس لی ہے۔“ جیلا نے کہا۔ ”میں آپ کو حق سے زیادہ دیتا رہا ہوں۔“

”کسی دن کا کوئی سا اخبار پڑھ لو۔“ صدیقی نے کہا۔ ”اخباروں میں مطالبے ہو رہے ہیں کہ تنہا داروں کے خلاف مقدمے چلا تے جاتیں کہ وہ اپنے فرائض میں کوتاہی کر رہے ہیں۔ سیاسی لیڈر اور وزیر بھی اخباروں میں بیان چھو رہے ہیں کہ ملک میں جرائم اتنے بڑھ گئے ہیں کہ لوگ دن کے وقت بھی دروازے اندر سے بند رکھتے ہیں۔“

”سیاسی لیڈر... جیلا سنس پڑا۔“ اور وزیر... کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لیڈر اخباروں میں جو بیان چھو رہے ہیں وہ ان کے دلوں سے نکلنے ہیں یا وہ ایسے بیان دیانتداری اور خلوص سے دیتے ہیں؟ آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ لیڈروں کی سیاست مجھ جیسے غنڈوں اور بد معاشرلوں کے بغیر چلی ہی نہیں سکتی۔ وہ جرائم کو بڑا کر دیکھ گے ہر سیاسی پارٹی کا اپنا ایک گروہ ہے جو بھی سیاسی لیڈر اقتدار میں آتا ہے وہ اپنے گروہ کو وارداتیں کرنے کی کھلی جھٹی دے دیتا ہے۔ اقتدار کی کرسی کے لیے مجھ عیسائیوں کو خوش رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ آپ بھی اسی مشین کا ایک حصہ ہیں۔ میرے سر پر ایک وزیر کا ہاتھ ہے جو آپ جانتے ہیں کون ہے مگر میں نے آپ کو آپ کے حق سے کبھی محروم نہیں کیا۔ آپ کی قسمت میرے ہاتھ میں ہے۔“

”شاید اب نہ رہے۔“ سب ایک پکڑنے لگا۔ ”اب تم اپنی قسمت میرے ہاتھ میں دے دے رہے ہو... لمبی چوڑی باتوں کو چھوڑو بار ادھیو ہم پرانے ساتھی ہیں۔ ہماری دوستی بڑی پیڑی رہی ہے۔ سمجھ اپنی ناز دکھا دو اور بوٹری بازار کے مال کا حساب دے دو... یا راتم ایسے ٹونہ تھے۔“

”اگر میں ایسے کے سہائے ولسا بن گیا تو میرا کیا بگاڑ لوگے؟“ جیلا نے کہا۔ ”اگر میرے دو آدمی میرے خلاف ہو گئے ہیں تو کیا ہمارے ڈی۔ ایس۔ بی۔ ایس۔ بی۔ جی میرے خلاف ہو جائیں گے؟... صدیقی بھائی کی افکوشش کرو کہ میں آپ کو بھائی کہتا ہوں۔ سنئے اور ٹیپو نے مجھے دھوکہ دیا ہے تو وہ آپ کو بھی دھوکہ دے سکتے ہیں۔ آپ انہیں میرے خلاف سلطانی گواہ بنانے کی سوچ رہے ہیں تو وہ کورٹ میں منحرف ہو کر آپ کی تنہا داری کو باہر فرٹ پاتھ پر پھینک سکتے ہیں۔ مجھے میری جس واردات میں گرفتار کرو گے اس میں آپ بھی شامل ہوں گے۔ ملک کی سیاست کا پانسہ پلٹ دینے والا آدمی ایک سب انسپکٹر کا تو بڑا غرق کر سکتا ہے۔“

سب انسپکٹر کھپنا نہ سا ہو کے بولا۔ ”میں ہمارے مکان پر چھاپہ مار کر ناز کو بیکر کر دوں گا اور تمہارے خلاف تھوہ لڑکی سے دھنہ چلانے کا پرجہ کالوں گا۔“

”اور یہی لڑکی کورٹ میں بیان دے گی کہ سب انسپکٹر صدیقی نے مجھ پر مجاہدہ کیا ہے۔“ جیلا نے کہا۔ ”ایک درجن رہنماں شریف عورتوں کے روپ میں آپ کے خلاف گواہی دیں گی... صدیقی بھائی! میں کسی اور مقصد کے لیے آیا تھا مگر آپ نے انہی لڑکیوں کی سی باتیں شروع کر دی ہیں۔“

”پولیس مقابلہ جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟“ صدیقی نے پوچھا۔

”کر کے دکھا دوں گا۔“ جیلا نے کہا۔

”تمہاری لاش مقابلہ نہیں کر سکے گی۔“ سب انسپکٹر صدیقی نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ جس کے خلاف پولیس مقابلہ ہوتا ہے۔ اُسے پہلے قتل کیا جاتا ہے پھر پولیس مقابلہ ہوتا ہے۔“

”یہ مقابلہ اگلے دن اخباروں میں ہوتا ہے۔“ جیلا نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کہنے لگا۔“ آپ میری بات سمجھ نہیں سکتے۔ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی آپ نے؟۔ اور وہ باہر نکل گیا۔

سب انسپکٹر مظہر صدیقی نے اپنے تھانے کے اے۔ ایس۔ آئی اللہ راؤ کو بلایا اور اُسے اپنے قریب بٹھالیا۔

”جیلا کیوں آیا تھا؟“ اللہ راؤ نے پوچھا۔ ”بڑے غصے میں گیا ہے۔“

”اس کا غصہ ٹھنڈا کرنا ہے۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”منا اور ٹیپو اس کے متعلق کچھ گڑبڑ بات کرتے ہیں۔ سالانہ دھوکہ دے رہا ہے۔“

”غصہ کیسے ٹھنڈا کرنا ہے؟“ اے۔ ایس۔ آئی اللہ راؤ نے پوچھا۔ ”کیا اس کا غصہ آپ ٹھنڈا کر سکتے ہیں؟“

”میں جانتا ہوں اللہ راؤ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“ صدیقی نے کہا۔ ”لیکن ہم پولیس آفیسر ہیں۔ ہماری کچھ پوزیشن ہے۔ کوئی حیثیت ہے۔ ایک برٹری ٹیڈر ہیں تھانے میں آکر دھمکیاں دے جانے اور ہم جی ضروری کریں۔“

اللہ راؤ سنس پڑا اور طنز یہ لے میں بولا۔ ”پولیس آفیسر... پوزیشن... حیثیت... کیا بات کر رہے ہیں آپ صدیقی صاحب! کہاں ہے آپ کی پوزیشن؟... ہماری حیثیت کیا رہ گئی ہے؟ ہم نے اپنی پوزیشن اور حیثیت رہنے کب دی ہے؟ حکومت اس شخص کی ہے جو عادی جرم ہوتے ہوئے دھننا تھانے میں آیا اور آپ کو لگا کر تانگل کیا ہے۔ کیا آپ اسے گرفتار کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟ اور آپ اسے حالات میں بند کریں گے اور اسے ٹیلیفون آجائے گا کہ اسے چھوڑ دو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے تھانے سے لے جانے کے لیے کسی وزیر کی کار آجائے۔“

”میں سب کچھ جانتا ہوں اللہ راؤ!۔“ مظہر صدیقی نے پریشان سا ہونے لگا۔ ”لیکن میں اپنی یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا میں استعفا دے دوں گا۔ غنڈوں اور وارداتوں کی جھلن نہیں ہو سکتا۔“

”صدیقی صاحب!۔“ اے۔ ایس۔ آئی نے سب انسپکٹر کی طرف جھک کر رازداری سے کہا۔ ”ہم ان غنڈوں اور وارداتوں کا دیا کھاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گے۔ آپ کے گھر میں چوری کا سامان اور فرنیچر موجود ہے۔ میرے گھر میں بھی موجود ہے۔ ہم سیاسی لیڈروں کے غنڈوں اور سرکاری غنڈوں کے سامنے عدالت میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں آپ کیوں

پریشان ہوئے جا رہے ہیں؟ ہمارے لیے حکم ہے کہ وزیر، وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم اور گورنر کسی جلسے یا تقریب میں جاتیں تو سارا شہر اُٹ جاتا ہے تو لٹ جاتا ہے دو، حاکم کی سیکورٹی کا فوراً بندوبست کر دیا جیسی کسی کھچی پوچھا ہے کہ ہماری فائلوں میں جیب تراشی سے قتل ہمارے کیسوں کی جو بھر رہا ہے ان کی کٹیش کیوں نہیں ہو رہی؟ ہم بہت سی وارداتیں درج رجسٹری نہیں کرتے شہر لوں کو ڈرا دھکا کر بیٹھا دیتے ہیں۔ اخباروں میں ان کے مرسلے چھپتے ہیں اور کسی ایڈیٹر کو جس روز کوئی اور موضوع نہیں ملتا، وہ ہمارے خلاف ایڈیٹر لکھ مانتا ہے۔ آپ سے کبھی جواب طلبی ہوتی ہے کہ اخباروں کے الزامات کا جواب دو۔ ہمارے ہاتھوں ایڈیٹر لوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ایڈیٹر وی کو گرفتار ہوتا ہے جو سرسراقتدار سیاسی لیڈر کے کثرت بے نقاب کرتا ہے۔

”ہیں اس سیاسی نظام کو نہیں بدل سکتا۔ سب الپکھڑے لکھا۔“ میں مائل لارنڈ نہیں کر سکتا میں کسی سیاسی لیڈر کے خلاف آواز نہیں اٹھا رہا میں اپنی ذات کی بات کر رہا ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اس میں تمہارا کچھ فائدہ بھی ہے۔

”ہاں، بتائیں۔“ اللہ داد نے کہا۔ ”میں آپ کی مدد کیوں نہیں کر دوں گا۔ یہ تو میں نے آپ کو یاد دلایا ہے کہ سیاسی لیڈروں کی حکومت میں ہماری پولیٹیشن اور حیثیت کیا ہے۔ آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں مجھے بتائیں۔ آپ کا پورا پورا ساتھ دوں گا۔“

”جیسا کہ وہ آدمی مٹا اور ٹیپو، اس کے دشمن ہو گئے ہیں۔“ صدیقی نے کہا۔ ”پول سمجھو کہ وہ اس کے بازو تھے جو کٹ گئے ہیں جیسا اس شہر سے کھسک رہا ہے میں کبھی نہیں مان سکتا کہ وہ شریفانہ زندگی بسر کرنے کا ارادہ کر چکا ہے۔ وہ بیوقوف نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ وہ اس جال میں سے زندہ نہیں نکل سکتا۔ اس کے سینے میں جو راز ہیں وہ اس کی موت کا باعث نہیں گئے۔ اسے میں نے یا ہمارے کسی بڑے صاحب نے یا کسی سیاسی لیڈر نے نہ مرادیا تو اس کے ساتھی اسے مار ڈالیں گے۔ وہ زندہ رہا تو سب کو بلیک میل کرے گا۔ تم جانتے ہو وہ کتنا گھٹا آدمی ہے۔۔۔۔“

”وہ غزانہ اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ مجھے اب متہیلا ہے کہ اس نے ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی اپنے پاس رکھی ہوئی ہے۔ وہ اس لڑکی پر فریفتہ ہو چکا ہے اور وہی اسے کراچی سے نکل چلنے پر اکسارہی ہے۔ یہ لڑکی اس نے اڑائی تھی۔ کل بوٹری بازار کی آگ سے اس نے ڈال لیا تھا۔ اتنا زیادہ کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے بھی چھپا لیا ہے۔ مٹا اور ٹیپو مجھے بہت کچھ بتا کر گئے ہیں اس کی دوسری وارداتوں کو بھول بھی جاؤ تو بھی میں اسے پھانسی کی کوٹھڑی تک پہنچا سکتا ہوں۔ وہ جس مکان میں رہتا ہے اس کے ایک کمرے میں ڈاکے کی ایک واردات کا سلطانی نگاہ دفنی ہے۔ اس کا نام آئن تھا۔ مٹا اور ٹیپو ثابت کر دیں گے کہ اس سلطانی نگاہ کو جیسا نے قتل کیا تھا۔“

”مجھے یہ بتائیں کہ آپ جیسا کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں یا مرادنا چاہتے ہیں۔“ اللہ داد نے کہا۔

”میں اس کے مکان پر چھاپا کر اس کی داشتہ کو قبضے میں لینا چاہتا ہوں۔“ سب الپکھڑے

”اور تم جانتے ہو کہ وہاں جو مال ہے وہ اپنا ہی ہے تم ساتھ ہو گے۔ اپنا حصہ وصول کر لینا چاہیے

کہ وہاں اسے پارک دیں گے۔ ایک گولی اسے مار کر باقی گولیاں سوا میں جلاتیں گے اور پولیس مقابلہ ہو جائے گا۔“

”اس کارروائی سے آپ سے باز پرس ہوگی کہ جیسا کے گھر چھاپا مارنے کی اجازت کس نے دی تھی؟۔ اللہ داد نے کہا۔“ اسے اس کے اپنے آدمیوں کے ہاتھوں کیوں نہ مرادیا جاتے۔ کیا مٹا اور ٹیپو اس کام کے لیے تیار ہیں؟

”وہ تو اتنے بھڑکے ہوئے ہیں کہ سورج غروب ہونے سے پہلے اس کا کام تمام کرنے کو تیار ہیں۔“ صدیقی نے کہا۔

”پھر آپ سوچ کیا رہے ہیں؟۔“ اللہ داد نے کہا۔ ”ان دونوں کو تیار کر دو، اور جلدی کر دو۔ وہ کہیں نکل جاتے گا۔“

”نکل کہاں جاتے گا۔“ سب الپکھڑے کہا۔ ”میں نے مٹے اور ٹیپو سے کہہ دیا ہے کہ اس پر نظر رکھیں۔ وہ ادھر ادھر ہوتو مجھے اطلاع دیں۔۔۔۔ تم لوں کو اللہ داد! ان دونوں کو پھر بلاؤ۔ سبکریاں رات کو آتیں ہمیں بڑی ہوشیاری سے بندوبست کرنا پڑے گا۔ جیسا کراچی کے بہت سے غنڈوں کو اپنے ساتھ ملا سکتا ہے اور اس کی پیٹھ پر سیاسی لیڈروں کا ہاتھ ہے۔ ہمیں بھی کچھ آدمیوں کی مدد لینی ہوگی۔“

”ضروری نہیں۔“ اللہ داد نے کہا۔ ”خاموشی سے مرادیں گے۔ غائب کرادیں گے کسی لیس یا کار کے نیچے دلا دیں گے۔“

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس میں شاید میرا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔“ جیدانے کہا۔ ”وہیں نہیں تھا۔ وہ شاید وہ جیل تھا جس نے سزاؤں اور سزوں کے ماتحت مسلمانوں کے جلتے ہوئے مکان اور ان میں زندہ جلتے ہوئے پتے دیکھے تھے۔ بوٹری بازار کی آگ میں ایک مال کی جھول سے میرا وہ بدل دیا اور مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے اس ایک پتے کو زندہ جلاتے کے لیے ہندوؤں نے اپنی ہڈیوں کو آگ لگا دی ہے میرے اندر سے جیسے کسی نے مجھے لگا رہا ہو۔“ جید نے تیرے ملک میں کوئی بچہ زندہ نہ جلتے کو دیکھا اس آگ میں۔ اور میں آگ میں کود گیا۔“

”اوتے جید ہے!“ بشیر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تم اب ہماری منڈی میں بیٹھنے کے قابل نہیں رہے۔ تم تو تعلیم یافتہ آدمیوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ اگر تمہارے اندر تعلیم زوردار رہی ہے تو ادھر ادھر ہو جاؤ، لیکن جاؤ گے کہاں؟ نا جانتا ہی یاد ہے نہیں؟ پانچ چار سال کی بات ہے۔ اُس نے بھی تو پرکھی اور الگ ہو بیٹھا تھا۔ رست آکھڑ روز اخباروں میں چار کاسٹیلوں، ایک بیڈ کاسٹیل اور ایک اسے۔ ایس آئی کی فوٹو چھپی تھی۔ ان کے سامنے ناجے ملتا ہی کی لاش پڑی تھی۔“

”ہاں۔ مجھے یاد ہے۔“ جیدانے کہا۔ ”ساتھ بھر تھی کہ بدنام لدا کو نا جانتا ہی پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔“

”یہ میں جانتا ہوں کہ اُسے کہاں بلا کر بیٹھے سے ریلواری ایک گولی ماری گئی تھی۔“ بشیر نے کہا۔ ”اور لاش پر انٹروں کی پانچ گولیاں چلائی گئی تھیں۔ کھاراد کے جبار سے کی لاش برنس روڈ پر پڑی ملی تھی جھپٹی تھی کہ رات ایک کار سے بھجی ہوئی گزرتی سے۔ کار کا سرخ نہیں لگایا جا سکا۔ اُس نے ملک سے باہر جا کر حلال کی کمانی کا ارادہ کیا تھا۔ اس کے سینے میں پتھر روٹی کا گانے والی انوری بھٹی کے قتل کا راز تھا۔ اُسے آج کا وزیر تھا۔ آغا پٹی داشتہ بننا چاہتا تھا اور وہ نہیں مان رہی تھی۔“

”وہ تو انڈیا کے مہاراجوں کی چیز تھی یا ر۔“ جیدانے کہا۔ ”بہت خوبصورت تھی۔“

”اُسے جبار سے کے ماتحت قتل کر دیا گیا تھا۔“ بشیر نے کہا۔ ”جبار سے نے اُسے قتل تو کر دیا لیکن اُس نے دوسرے دن انوری کی پوسٹ ٹیم کی ہوئی لاش دیکھی تو اُس کا دماغ پھریا۔ اُس نے سب کا کما کما وہ ملک سے باہر جارہا ہے۔ آغا اور پولیس کے ایک افسر کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ جبار سے جیسا ظالم حکمت کیوں منہ پھریا گیا ہے۔ وہ نہانا تو اُسے آدھی رات کے بعد اسی کے دوسا تھی ایک شکار کالاج دے کر برنس روڈ پر لے آئے۔ ادھر سے ایک سب آتی جو جبار سے کو کچل کر غائب ہو گئی۔“

بشیر نے اُسے میں جارا اور تمام پیشہ آدمیوں کے قصے سنا دیے اور کہا۔ ”میرا کئی غلو گڑا میں بہت پسند ہے۔ جیدانے اپنی لڑکی عیش سے وزیر بدلتے رہتے ہیں۔ جیسی کوئی نہیں بدل سکتا جکاراں کے مخالفوں کے خلاف جو جھوٹے مقدمے بناتے جاتے ہیں ہم ان میں جھوٹی گواہیاں دینے کے لیے بروقت اور ہر کسی کے لیے تیار رہتے ہیں۔ وزیروں کے پیچھے سے کریاں کرتی رہتی ہیں ہماری بادشاہی قائم رہتی ہے۔ میرا جم ادھر ادھر نہیں ہو سکتے۔ حاکم ہم پر نظر رکھتے ہیں۔ جوار ہمیں معلوم ہوتے ہیں وہ نئے حکمران کو معلوم نہیں ہوتے۔“

”نہیں۔“ جیدانے کہا۔ ”دھندلا چھوڑ رہا ہوں۔“

بشیر نے اُس پر دیکھا اور بی آہ بھری، پھر وہ جیداکو یوں دیکھنے لگا جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”تمہارا دماغ چل گیا ہے۔“ بشیر نے کہا۔ ”یا شاید کب لڑائی کی آگ نے تمہارا سرٹ بھر دیا ہے۔ میرے چھوڑوں نے بھی خوب ماتھا مارا ہے۔ ایک چھوٹا تو جیتی جاگتی عورت کے گلے سے سونے کا ڈانڈا کر لے آیا ہے۔“

”اور میں ایک عورت کے گلے سے اُترا جواہر اُس کے گلے میں ڈال آیا ہوں۔“ جیدانے کہا۔ ”اور بوٹری بازار کی آگ نے مجھے یہ زخم دیتے ہیں۔ اُس نے بشیر سے کو اپنے زخم دکھائے جیدانے اُسے تفصیل سے بتایا کہ وہ اب اس دھندے میں چل ہی نہیں سکے گا اور کیوں نہیں چل سکے گا۔“

”اُس سے بہتر ہے کہ پھانسی چڑھ جاؤ۔“ بشیر نے کہا۔ ”تم مجھے ایک آدمی بنا دو جو اس جال سے نکل کے گیا ہو۔ کوئی چور اور اٹھائی گئے ادھر ادھر ہو جائے تو کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ بہت وزیروں لیڈروں، پولیس کے افسروں اور اپنے ساتھ کے استادوں کے راز اپنے سینوں میں لے کر کہاں جا سکتے ہیں؟ تم اس زمین پر نہیں چل پھر سکتے۔ سمندر پار چلے جاؤ۔ سرحد پار کر جاؤ۔“

”ہندوستان؟“

”ہاں۔“ بشیر نے کہا۔ ”تھیں صرف ہندوستان میں پناہ مل سکتی ہے۔ وہاں چاہے یہی دھندلا چلاؤ چاہے شرفیوں کی زندگی بسر کرو۔“

”بشیر نے استاد۔“ جیدانے کہا۔ ”میرا اتھار کوئی مذہب نہیں۔ ہم جیوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ کوئی ملک نہیں ہوتا۔ میرا کجرب مجھے ہندو یاد آئے ہیں تو یہ بھی یاد آتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور میں پاکستانی ہوں۔ یہ ایک قصہ ہے کہ ہم اپنے لیڈروں اور حاکموں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کا بیڑہ غرق کر رہے ہیں لیکن ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ہندو ہمارے ملک کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے میں آئے۔ ۱۹۴۷ء میں ادھر سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ میرا پیشہ یہی تھا۔ میں کوئی شریف آدمی نہیں تھا لیکن اتنا سا احساس تو ہو دیتا تھا کہ نہیں ہندو اور کھٹ کھٹ کر رہے ہیں اور جن عورتوں کو وہ کھٹ کھٹ کر لے جاتے ہیں وہ مسلمان ہیں۔ میں وہ قتل و غارت اور مسلمانوں کے جلتے ہوئے مکان اور ان میں جلتے ہوئے بچوں کو نہیں بھول سکتا۔“

”مجھے کیا بتاتے ہو جیداسیٹھ۔“ بشیر نے اُسے آہ بھر کے کہا۔ ”میں اُس وقت لاہور میں تھا۔ میرا بھی یہی پیشہ تھا یہی دھندلا تھا۔ میرا خاندانی دھندلا ہے۔ پناہ گزینوں کے خوف نے میں نے دیکھے تھے وہ آج بھی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ میرا باپ انڈیا کا مانا بڑا نفل شکن تھا۔ وہ بھی لاہور گیا تھا۔ اُس نے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے قتل عام کے قصے سنا تھے۔ مجھ جیسے پتھر کے بھی انسو نکل آتے تھے۔“

”اور جیوں نے تمہیں سنایا ہے کہ کل میں نے بوٹری بازار کی آگ سے ایک پتے کو زندہ نکالا ہے۔“

”اس کے باوجود مجھے یہاں سے جانا ہے۔“ جید نے کہا۔

”میرا باپ انڈیا سے آگیا تھا۔“ بشیر نے کہا۔ ”تھیں بتا چکا ہوں کہ تالے توڑنے۔“ وہ استادوں کا ساتھ دیتا لیکن اس کا ٹھکانا ٹھکانا سیاسی لوگوں میں تھا۔ اس کے لباس اور اس کی باتوں سے کوئی شک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ آدمی قتل شکن ہے۔ اس نے پاکستان مانگنے والے مسلمانوں کے خلاف بہت کام کیا تھا۔ وہ مسلمان جاگیرداروں کا آدمی تھا۔ وہ دونوں انگریزوں کے آدمی تھے میرے باپ نے ان کی پشت پناہی سے اپنے علاقے کے مسلمان لیڈروں اور کام کرنے والوں میں سے کئی ایک کو قتل اور ڈاکے کی دھمکیاں دے دے کر پاکستان کے راستے سے ہٹا دیا تھا۔ اس نے دو آدمیوں کو قتل کیا اور دو کے گھروں میں لقمہ لگائی تھی....

”اپنی علاقوں میں جب مسلمانوں کو ہندوؤں اور کھنوں نے قتل کرنا شروع کر دیا اور مسلمان عورتوں کی آبروزی ہونے لگی تو میرے باپ کا دل ایسا ٹٹرا کر اُس نے اپنے پیشے پر اور اپنے آپ پر سو غصت بھیجی اور وہ لاہور آگیا۔ ایک سال بعد جب پاکستان بنانے والا قائد اعظم دنیا سے اٹھ گیا تو انگریزوں کے وہی جاگیردار جو پاکستان کا نام لینے والوں کو قتل اور دہشت کی دھمکیاں دلاتے تھے اور جنہوں نے قتل خرابے بھی کئے پاکستان کے سیاسی میدان میں آ گئے۔ وہ یہاں بھی جاگیردار تھے۔ میرے باپ کی بد قسمتی کہ میرا باپ ان کے سامنے چلا گیا اور ایسے طریقے سے قتل ہو گیا کہ پولیس قاتل کا سراغ نہ لگا سکی۔“

”تم میری مدد کر سکتے ہو؟“ جید نے کہا۔ ”مٹا اور میو میرے دو بازو تھے۔ دونوں ٹوٹ گئے ہیں اور انہوں نے علاقے کے تھانیدار کو بھی میرا دشمن بنا دیا ہے۔“

”تم دراصل اُکھڑ گئے ہو جید بھائی!“ بشیر نے کہا۔ ”اور نہ مٹے اور میو کی کیا حیثیت ہے اور علاقے کے تھانیدار کی کیا مجال کہ سر بھی اٹھا سکے حکومت تمہارے ماتحت ہیں ہے.... سوچ لو۔ پھر سوچو۔ ایک عورت کے پیچھے اپنی حیثیت تباہ نہ کرو۔ اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو اور طبیعت پھر بھی نہ جیسے تو مجھے بتانا۔ گاڑی دول گا۔ اپنے آدمی دول گا۔ جہاں کھو گے وہاں چھوڑا کریں گے۔“

جید ابیدل چلا جا رہا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ فٹ پاتھوں پر لوگوں کے جھوم میں اور جھوم کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت بڑھ گئی تھی۔ لوگ جیسے سورج غروب ہونے ہی شہر جاگ اٹھا ہوا درلوگ جیسے گھروں سے نکل آتے ہوں فٹ پاتھوں پر چلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ سیلاب کی طرح جھوم فٹ پاتھوں سے سڑکوں پر بہ نکلا تھا۔ بس مسافروں سے اٹی ہوئی تھیں۔ کھڑکی شہقت کے مارے ہوئے لوگ گھروں کو جا رہے تھے اور جن بھر گھروں میں بیٹھے رہے تھے وہ کراچی کی رونق دیکھنے کے لیے سڑکوں پر نکل آتے تھے۔

یہ انسانوں کا سیلابی دریا تھا جس میں جید سبلا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے زور پر اور اپنے قدموں سے چلنے والے انسان تھا مگر آج شام وہ دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے سے دھکے کھاتا رہتا تھا۔ اس کے کندھوں سے لوگ ٹکراتے جا رہے تھے۔ کراچی کے جھوم میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ کسی کو دھکا یا کندھا لگ جائے تو معذرت کر لے۔ وہاں دھکے دینے اور دھکے کھانے کا رواج ہے کسی کی تنہا ہوتی یاں کی پیک کسی کے گھروں پر پڑ جائے تو بھی معذرت اور معافی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی البتہ

کالی گلوچ کر لی جاتی ہے۔

جید ایسے جھوم دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ اسے شکار اسی جھوم میں ملا کرتا تھا۔ یا اسے فوٹا سے اٹی ہوئی بسوں میں شکار ملا کرتا تھا۔ بسوں میں رش کے دو وقت ہی ہوتے تھے۔ ایک صبح کو جب لوگ روزمرہ کام کاج کے لیے گھروں سے نکلتے تھے اور دوسرا وقت شام کا تھا جب لوگ گھروں کو واپس جانے کے لیے بسوں پر بٹہ بول دیا کرتے تھے مگر آج شام جید سر جھکاتے چلا جا رہا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر رک گیا۔ دوسرا سا گھوٹا اور دوسرا ٹھکانا چڑھ کر ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ تب اسے خیال آیا کہ وہ اپنے پسندیدہ ہوٹل میں آگیا ہے۔ دو بیڑے دوڑے آتے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ جید استاد ہے۔ پانچ روپے کے بل پر دس روپے بھی دے جاتا ہے۔ جید نے انہیں دیکھا تو اسے بھوک کا احساس ہوا۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس نے بیڑوں سے کما کما کھانے اور جوجی میں لٹے لے آؤ۔

کھانا آئے تک وہ خیالوں اور یادوں کی وادلوں اور سنگلاخ گزر گاہوں میں جھٹک گیا۔ اسے اپنا بچپن یاد آیا۔ مال یاد آیا، باپ یاد آیا، ان کا پیار یاد آیا، مال کی کوئی تیش اور سرور یاد آیا۔ وہ بچہ اسے وہ تنہا یاد آئے تھے جس میں اسے مال اور باپ کی موت نے گھرا رکھا تھا۔ اس سے پہلے اسے وہ دو گھر بھی یاد آیا تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس عمر میں بھی اسی دو کی مستقوتوں اور طلال شہینہ اور تنجیل کے زیر اثر ہے اور وہ ذہن لاشعور کے حجم سے زندگی گزار رہا ہے۔ اب جب اسے گم گشت پیار مل گیا تھا، اس کے ذہن لاشعور کے بہت کھل گئے اور اس میں جڑ بھرا ہوا تھا، وہ نکل گیا۔ اس کے اندر نفسیاتی انقلاب آگیا تھا، اسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا اور اس کے آگے وہ بے بس تھا۔ اتفاقات نے اس کا وہ علاج کر دیا تھا جو نفسیات کا کوئی ڈاکٹر برسوں تک نہ کر سکتا۔ وہ اب اس کش مکش کے مرحلے میں تھا جو دلوانگی اور فزائیگی کے درمیان ہوتی ہے۔ وہ لیل بھی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ ریگزار میں براہی لمبا سفر کر کے خشک ستان میں پہنچا ہو۔ وہ سکون اور قرار محسوس کرنے لگا مگر برنگشتان اسے اسید زدہ نظر آ رہا تھا۔ اس پر اسے سب سے بڑا ہے تھے۔

”کھیں لڑائی ہو گئی تھی استاد؟“ بیرے کی آواز نے اسے چنکا دیا۔ بیرا لبر رہا تھا۔ ”سر پرٹیاں کیوں باندھ رکھی ہیں؟“

جید اس پر لا۔ وہ ہی آتے بغیر اس خیال سے ہنسا تھا کہ برائیوں نے ہونے پر کیا نا پڑا تھا جید نے بیرے کو دیکھا۔ ہی کوئی جواب دے کر ٹالنے کی کوشش کی مگر بیرے نے میز پر ہاتھ رکھ دیتے اور اُدھر اُدھر دیکھ کر اس پر جھٹک گیا۔

”استاد!۔“ بیرے نے کہا۔ ”ہاں کو ٹھننے اور میو نے ہیں کھانا کھا یا تھا تمہارے ساتھ ان کی کوئی گھڑی تو نہیں؟“

”کیا کہتے تھے؟“

”مجھے تو انہوں نے کچھ نہیں کہا۔“ بیرے نے جواب دیا۔ ”آپس میں باتیں کر رہے تھے میں ان کے آگے کھانا رکھ رہا تھا تو میو ٹھٹھے سے پڑ رہا تھا کہ بس سچ کی رات، کل کا دل اور کل کی رات

دیکھیں گے۔ اگر کل رات تک سیدھے راستے پر جاتا ہے تو دوسری پکی گھسیں گے۔ اگر نہیں تو پرسوں دوسرے اُس عمارت زدی ناز کو نہیں گھسیں گے پھر انہوں نے گھسیں گالی دے کر کھٹا کھٹا کہ اسے اس کے ساتھ لٹا دیں گے.... اور مٹتے نے کہا تھا کہ دوستی پتی رتبے تو اچھا ہے نہیں تو اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لیں گے۔ مٹتے نے یہ بھی کہا تھا کہ صدیقی مدد کرے گا۔ وہ دھوکہ نہیں دے گا.... اسٹاڈا صدیقی بھائی ناز کو نہیں؟

”شاہد وہی ہو“

”میں نے ان سے پتھاری پوچھی کہ اسٹاڈا کیا ہے تو دونوں نے ایسے جواب دیئے کہ صاف پتہ چلتا تھا کہ پتھارے ساتھ ان کی کوئی گھٹ وٹ ہو گئی ہے۔“

یہ بہرے جرات پریشاں ستا دونوں کے بھی خبر ہوتے تھے اور پولیس کے بھی۔ ہٹلوں میں لوگ آتے ہی مٹتے تھے۔ بہت دیر بیٹھے بھی تھے۔ قسم قسم کی باتیں کرتے تھے۔ ان میں کچھ باتیں راز کی بھی ہوتی تھیں۔ کچھ دو کسب خیریں اور کچھ باتیں کسی کے کام کی ہوتی تھیں۔ پیرے بظاہر ان جان بٹنے رہتے جیسے انہیں کسی کی باتوں کے ساتھ کوئی کجی نہ ہو مگر کام کی باتیں اُس آدمی تک پہنچ جاتی تھیں جس کے کاک کی ہوتی تھیں۔ یہ پیرا جو جیلا مٹتے اور ٹیپو کی باتیں سن رہا تھا، اُس کا فخر تھا۔ جب کبھی اسے جیلا کے کام کی کوئی بات معلوم ہوتی وہ اُس تک پہنچا دیا کرتا تھا۔

جیلا نے کھانا کھا کر اُسے مل کے علاوہ کچھ پیسے دیئے اور ہٹوں سے نکل گیا۔

”آج کی رات کل کا دن۔ کل کی رات“۔ جیلا سوچنا جا رہا تھا۔ ”کل رات اُسے ناز اور پتھارے کو کہیں عاتب کرنا ہے.... کہاں؟.... کہاں؟.... بوڑھے موسیقار کے گھر؟.... نہیں۔ مٹتے اور ٹیپو کو وہ ٹھکانا معلوم ہے.... مٹتے اور ٹیپو کے ساتھ اب دوستی نہیں ہو سکتی۔ دشمنی پکی ہو چکی ہے۔“

اس نے سوچا کہ اپنے ٹرڈ کے دوسرے آدمیوں کو مدد کے لیے اٹھا کر لے لیکن مٹتے اور ٹیپو کے ساتھ لڑائی کا خطرہ تھا۔ وہ لڑائی سے ڈرنے والا نہیں تھا مگر اب ڈر رہا تھا کہ وہ پھڑکا جاسے گا پھر ناز گیا تو مارا جائے گا، زخمی ہو جائے گا اور ناز کو مٹا اور ٹیپو لے جائیں گے۔

اُسے اُس دیر کا خیال آیا جسے کامیاب کرنے کے لیے اُس نے اُس کے مخالف لیڈروں کے جلے اکھاڑے تھے مگر وہ بھی ہی خطرہ تھا کہ وزیر اپنی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے اُسے پولیس مقابلے میں مرادے گا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا جا رہا تھا۔ جوم سے پہنچنے کی وہ ذرا سی بھی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اُسے جیسے گھر

جانے کی بھی کوئی حلدی نہیں تھی کبھی وہ اپنے آپ میں شکست خوردگی محسوس کرنے لگتا کبھی وہ مینہ پھلا لیتا کہ وہ جرم و گناہ کی زندگی کو لٹا رہا تھا۔ وہ انسانوں کے جوم میں اور حالات کی آمد میں تھکے کی طرح اڑا جا رہا تھا۔ سوچ سوچ کر اُس کا داغ ٹھک گیا تھا۔ اُسے یہ بھی احساس نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔

اچانک ایک اور ہی قسم کے شور نے اسے خیالوں اور سوچوں سے بیدار کر دیا۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔ آگے جوم ایک جگہ رکھا تھا۔ روشنیوں نے شہر کو بے شمار تھیں بہت سی لوگ پٹیو کیس لمپٹ اٹھائے ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔

یہ بوڑھی بازار کی جلی مٹی عمارتیں تھیں۔ وہ اس شاپنگ سٹرک کو پہچان نہ سکا۔ کل ہی یہاں لگ بھگ تھیں کہیں سے ابھی کچھ اٹھ رہا تھا۔ سیاہ کالی دیواریں کھڑی تھیں۔ جلے ہوئے ان کھنڈروں میں لوگ پٹیو کیس اٹھانے کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ بعض عمارتیں گری نہیں تھیں۔ ایک تو ان لوگوں کا جوم تھا جو یہاں رہتے تھے اور ان سے کئی گنا زیادہ جوم تھا شاپوں کا تھا۔

”بلے سے جلی ہوئی لاشیں نکل رہی ہیں۔“ جیلا کے کانوں میں کسی کی آواز پڑی۔

”یہاں کے رہنے والے اپنا سامان نکال رہے ہیں۔“ ایک اور آواز۔

”سب جل گیا ہے۔“ کسی اور نے کہا۔ ”اب یہاں کیا بلے گا“

جیلا کے ارد گرد شعلے ناچنے لگے۔ وہ ان کی سمیت ناک آواز سننے اور ان کی پیش محسوس کرنے لگا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ کل جلی ہوئی عمارتوں کو دیکھنے لگا پھر آہستہ آہستہ جوم کے قریب ہو گیا۔ اُس کے سر پر ایک لب جل رہا تھا۔ جیلا کو خیال آیا کہ کڑاچی کے اٹھانی گھر بھی بلے اور جلے ہوئے کھنڈروں میں لوگوں کا سامان ڈھونڈ رہے ہوں، کچے اور جیب کڑے بھی اپنا کام کر رہے ہوں گے۔ ایک عورت جلی ہوئی عمارتوں کی طرف دیکھتی جیلا کی طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ وہ اسی جھبے کے پاس آؤ کی جس کے ساتھ جیلا کھڑا تھا۔ جیلا نے بھی توجہ نہ دی کہ اُس کے پاس ایک عورت کھڑی ہے عورت نے دو سال کا بچہ اٹھا رکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی ہاتھ میں لمبے سا تڑکی مارچ اٹھائے جھبے کی طرف آیا۔ اُس نے ایک سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔

”کچھ اور سلامت ہے۔“ جیلا کے پاس کھڑی عورت نے آگے بڑھ کر اس آدمی سے پوچھا۔

”بڑا ٹرڈ سلامت ہے۔“ اُس آدمی نے جواب دیا۔ ”اس کی پیش سے اندر کھڑے نہ بل گئے ہوں مجھ سے اٹھنا نہیں۔“

”میں ساتھ چلوں؟“ عورت نے کہا۔

”نہیں۔“ آدمی نے کہا۔ ”تم بچے کو اٹھاؤ گی یا ٹرڈ اٹھاؤ گی.... میں کسی سے کتا ہوں لیکن

مانے گا کون۔“

”مجھے کنبھاتی؟“ جیلا بول پڑا۔ ”اس مصیبت کے وقت کون نہیں مانے گا۔“

”بڑا احسان ہو گا کنبھاتی صاحب اب۔“ اُس آدمی نے کہا۔ ”بڑی نیکی ہو گی۔“

جیلا اُس کے ساتھ جلے ہوئے کھنڈر میں چلا گیا۔ وہاں دیر تھی۔ ہر طرح کی چیزیں جلی تھیں۔ ان میں چمڑے کی چیزیں بھی تھیں۔ بکری کی سیڑھیاں مکمل طور پر جلی تھیں۔ ایک ٹینڈر لوہے کی ٹول سیڑھیاں تھیں۔ ان سے لوگ آؤا چڑھ رہے تھے۔ جیلا اُس آدمی کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ یہ دوسری منزل تھی۔ وہ آہستہ آہستہ میں جلے گئے بلے سے پہنچے بجائے وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ اُس آدمی نے ٹارچ روشن کر رکھی تھی۔

کمرے کی دیواریں سیاہ تھیں۔ ایک طرف سے چھت کا کچھ حصہ ٹراٹھا تھا۔ کمرے میں ایک ٹرڈ ٹراٹھا۔ باقی سب کچھ جلا ہوا تھا۔

”ساتھ والے کمرے میں کچھ بھی نہیں بچا۔“ اُس آدمی نے کہا۔ ”یڈرنک رہ گیا ہے۔ آئیے، یہ اٹھا لے چلتے ہیں۔“
جیدا کی ہنسی نکل گئی۔

”آپ نہیں رہے ہیں؟“ اُس آدمی نے کہا۔

”ہاں!۔“ جیدا نے کہا۔ ”مجھے اپنے آپ ہنسی آگئی ہے آپ کی تباہی پر تو رونا آتا ہے۔“
”ہنسی کس بات پر آئی ہے؟“

”آپ یقین نہیں کریں گے۔“ جیدا نے کہا۔ ”کل جب آگ لگی تو میں بھی دیکھنے آیا تھا۔ باہر بڑا پرلایک عورت کو روٹے چلاتے دیکھا۔ اُس کا بچہ جلتی ہوئی عمارت میں رہ گیا تھا۔ اُس عورت کا غاوند اُسے بکڑنا تھا کہ بچہ جل چکا ہوگا۔“

”پھر کیا ہوا تھا؟“ اُس آدمی نے اشتیاق سے پوچھا۔

”میں نے دو ڈر فائر بریگیڈ والوں کی سیڑھی اٹھائی اور اُس بڈنگ کی بالکونی سے لگا کر اوپر چڑھ گیا۔“
جیدا نے کہا۔ ”میں کمرے میں چلا گیا، پھر میں بچے کو اٹھا کر آگ سے نکال لے گیا۔“

”شاید آپ کسی اور کے بچے کی بات کر رہے ہوں گے۔“ ٹارنر والے آدمی نے کہا۔ ”میرا بھی بچہ اس کمرے میں رہ گیا تھا اور ایک اجنبی نے اُسے نکال لیا تھا مگر وہ اس بڈنگ کی سب سے اوپر والی منزل کی چھت پر چلا گیا اور اس کی منڈیر سے کود کر ایک درخت پر جا پڑا تھا۔“
”وہ بچہ آپ کا تھا؟“ جیدا نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ وہ بچہ میرا تھا۔“

”اگر بچے کو بچانے والا آدمی جلتی ہوئی عمارت کی منڈیر سے درخت پر کود گیا تھا تو وہ میں تھا۔“
جیدا نے کہا۔ ”میرا سر زخمی ہوا اور میری ٹانگ جل گئی ہے۔“
اُس آدمی نے جیدا کے چہرے پر ٹارنر کی روشنی ڈالی۔

”ہاں۔“ اُس نے غوٹنی آواز میں کہا۔ ”وہ آپ ہی تھے۔ آپ کی صورت تو میں ساری عمر میں بھول سکتا۔ کیا آپ کو میری بیوی نے بچانا نہیں تھا؟“
”وہ جو میرے پاس تھیں، اسے ساتھ کھڑی تھی؟“

”ہاں جی!۔“ اُس آدمی نے جواب دیا۔ ”وہی.... وہ میری بیوی ہے اور اُس نے اُس بچے کو اٹھا رکھا ہے جسے آپ نے آگ سے نکالا تھا۔“

”انہوں نے میری طرف نہیں دیکھا۔“ جیدا نے کہا۔ ”نہ میں نے انہیں بچانے کی کوشش کی تھی۔“

”بچے کا آپ جیدا سے ننگی بیوی کا ایسا غلبہ ہوا کہ اُس کی سسکیاں نکل گئیں۔ اگر جیدا سے یہ نہ کہتا کہ آؤ، بڈنگ اٹھا کر نکل چلیں، تو وہ جیدا کو اپنے بازوؤں کے گھیرے سے بھی الگ نہ کرتا۔ انہوں نے بڈنگ ادھر ادھر سے پکڑ کر اٹھایا اور باہر کو چل پڑے۔ قدم قدم پر ٹھوکر لگتی تھیں۔ کہیں اینٹیں پڑی تھیں کہیں جلی ہوئی لکڑی اور کئی اور چیزیں جس برآمدے میں سے وہ گزر رہے

تھے، وہ لرز رہا تھا۔ اس کا فرش جو سب سے نیچے والی منزل کی چھت تھی، اتنے زیادہ آدمیوں کا وزن اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ اسی بڈنگ کا ایک حصہ گر چکا تھا۔ یہ اُس وقت گرا تھا جب جیدا بچے کو اپنی پیٹھی سے باندھ کر آخری منزل کی منڈیر سے درخت پر کود گیا تھا۔

لوگ اپنے اپنے کمرے کی تلاشی لینے آتے تھے۔ عورتیں روری تھیں، اُن کے گھر جل چکے تھے۔ دو تین آدمی کہیں گھر سے چلا رہے تھے۔ ”چھتیں گھروں میں اتنے آدمی مبت اور جاؤ.... نیچے چلے جاؤ.... یہاں کچھ نہیں رہا۔“ پھر بڑا بونگ مچ گئی۔ پولیس اور پرائیگٹی اور لوگوں کو نیچے جانے کو کہہ رہی تھی چھتیں اور دیواریں گرنے کا خطرہ تھا۔

جیدا اور بچے کا باپ بڑی مشکل سے لوہے کی گول سیڑھیوں سے اترے بڈنگ میں رہا تھا۔

بچے کی ماں کو جب یہ چلا کہ اُس کے بچے کو آگ سے زندہ نکالنے والا شخص تھا تو اُس نے بے ساختہ جیدا کا ایک ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ جیدا نے بچے کو دیکھا تو بچہ شکر اے لگا۔ جیدا نے اُس بڈنگ کو دیکھا جس میں سے اُس نے بچے کو نکالا تھا۔ اُس کی چار منزلہ بلدی دیکھی پھر بڈنگ کے دوسرے کنارے اس درخت کو دیکھا جس پر وہ گرا تھا۔ اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا کہ مجھے کوئی اب اُس منڈیر سے درخت پر کودنے کے عوض ساری دنیا کی بادشاہی دینے کا وعدہ کرنے تو بھی میں نہ کر دوں۔

”بڈنگ کا وہ حصہ اس کے فوراً بعد گر پڑا تھا۔“ بچے کے باپ نے کہا۔ ”کیا آپ نے خودشی کی کوشش کی تھی یا آپ کو اعتماد تھا کہ آپ درخت تک پہنچ جائیں گے؟“

”خوشی۔“ جیدا نے کہا۔ ”میں جل کر مرنے سے ڈرتا تھا۔ مجھے گر کر مرنا بہتر لگتا تھا۔“
اُس نے دواسوچ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ انسان کچھ کرنے کا ارادہ کر لے تو اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتا ہے۔“

”اُس روز آپ رُکے نہیں تھے۔“ بچے کی ماں نے کہا۔ ”اب آپ کو ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔“

”کہیں ٹھکانہ مل گیا ہے؟“ جیدا نے پوچھا۔

”ایسے سینا لاٹرنز کے کارٹروں میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔“ بچے کے باپ نے کہا۔ ”اُس کے بیوی بچے یہاں نہیں۔ اُس نے کارٹر میں دے دیا ہے۔“

جیدا کو ناز کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی مگر بچے کی ماں اور اُس کے باپ نے ایسا بیتا بہ اصرار کیا کہ جیدا اُن کے ساتھ چل پڑا۔

وہ کارٹر میں داخل ہوئے۔ کمرے کی تیز روشنی میں انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو کوئی شک نہ رہا کہ بچے کو بچانے والا شخص تھا۔ جیدا نے بچے کو غور سے دیکھا تو اُس کی ذہنی حالت کچھ اور ہو گئی۔ اُسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ اُس کی آہ نکل گئی جیسے سوچ رہا ہو کہ جس آگ میں وہ برسوں سے جل رہا ہے، اس میں سے اُسے کون نکالے گا۔

”آپ نے ہار کیوں نہیں لیا تھا؟“ بچے کی ماں نے پوچھا۔ ”خدا نے ہمیں بچہ دیا یہ سال بعد دیا تھا۔“

”میں ہار لیا نہیں کرتا۔“ جیدانے بے خیالی سی میں کہا۔ ”میں ہارنا کرنا ہوں۔“ یہ کہتے ہی وہ چونک پڑا۔ اُس کی ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ یہ الفاظ اُس کے مُنہ سے نکل گئے۔

بچے کے ماں باپ نہیں پڑے جیسے جیدانے مذاق کیا ہو۔
”آپ کیا کام کرتے ہیں؟“ جیدانے بات کا رخ بدلنے کے لیے بچے کے باپ سے پوچھا۔

”میں پولیس کے محکمے میں ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرا نام امتیاز ہے۔ میں آئی جی کا سٹینڈ ہوں۔ پولیس سے کوئی کام ہو تو مجھے بتانا۔“

”ہاں جی، جنہو بتانا۔“ بچے کی ماں نے کہا۔ ”ہم آپ کی اتنی زیادہ خدمت کرنا چاہتے ہیں... اتنی زیادہ کہ... آپ کچھ بتائیں...“

”آپ میری اتنی زیادہ خدمت نہیں کر سکیں گے۔“ جیدانے امتیاز سے کہا۔ ”میری خدمت کو آپ نہیں کر سکتا۔“

”آپ کیا کام کرتے ہیں؟“

”میں پولیس کا قریبی عزیز ہوں۔“ جیدانے کہا۔

”اچھا۔ اچھا۔ امتیاز نے ہنس کر کہا۔ ”آپ کا کوئی عزیز پولیس میں ہے؟“

”جی نہیں۔“ جیدانے کہا۔ ”پولیس کو میں عزیز ہوں۔“ جیدانے خاموش ہو گیا اور اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

وہ ایسا بے چین تھا کہ امتیاز اور اُس کی بیوی نے اُس کی یہ تبدیلی دیکھ لی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ تب انھیں خیال آیا کہ جیدانے سر پرٹی بندھی ہوئی ہے۔
”آپ زخمی بھی ہو گئے تھے؟“

”جی میں زخمی بھی ہو گیا تھا۔“ جیدانے پاجامہ زرا اوپر کیا اور کہا۔ ”ٹانگ ذرا زیادہ جل گئی ہے۔“
”اوہ۔“ بچے کی ماں کو جیسے بہت زیادہ صدمہ ہوا ہو۔ ”جلن کا زخم تو بہت درد کرتا ہے۔“

جیدانے اُس کی طرف سے جواب نہیں دیا۔ اب تو وہ ایسے حالات میں اور ایسی لفٹیا کی تبدیلی میں گھر گیا تھا کہ اُس کا ذہن موقوف ہو گیا تھا۔ اُس پر جذبات کا غلبہ ہو گیا۔

”جلن کے درد سے میں واقف ہوں۔“ جیدانے کہا۔ ”بلکہ عادی ہوں۔ میں جلا ہوا انسان ہوں میری بہن! میں جل رہا ہوں۔ اس آگ سے مجھے کوئی نہیں نکال سکتا۔“

”آپ کچھ دیکھی سے لگتے ہیں۔“ امتیاز نے کہا۔ ”کیا آپ مجھے اپنا بھائی سمجھ کر اپنے متعلق کچھ بتائیں گے نہیں؟“

”آپ سمجھ نہیں سکتے تھے۔“ جیدانے کہا۔ ”میرے مُنہ سے نکل گیا تھا کہ میں ہار لیا نہیں کرتا ہارنا کرنا کرتا ہوں... اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں پولیس کا قریبی عزیز ہوں۔ میں آپ کو صاف بات بتا دیتا ہوں۔“ اُس نے امتیاز کی بیوی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اگر آپ کا بچہ آگ میں نہ رہ

جاتا تو آپ کا ہار میرے پاس ہوتا۔ سارے پاکستان کی پولیس آپ کو ہار واپس نہ دلا سکتی۔“ اُس نے امتیاز سے پوچھا۔ ”آپ اتنی جی کے سٹیٹو گراف نہیں۔ شاید آپ نے جیدانے کا نام سنا ہو گا جیدانے جیسا کہ نام کے نام سے مشہور ہے۔“

”میرا خیال ہے میں نے یہ نام سنا ہے۔“ امتیاز نے کہا۔

”میرا نام جیدانے ہے۔“ جیدانے کہا۔ ”میں سرکاری آدمی ہوں جسے لوگ سرکاری غنڈہ کہتے ہیں۔“

کراچی کے چور کچھ مجھے اپنا استاد بلکہ پیر مانتے ہیں۔“

گھر سے من خاموشی طاری ہو گئی۔ امتیاز اور اُس کی بیوی کو جیسے سمجھ نہ ہو گیا ہو۔

”میں قابل نفرت انسان ہوں۔“ جیدانے کہا۔ ”آپ مجھے اتنی زیادہ خاطر تواضع کے قابل نہ سمجھیں میں نے اگر آپ کے بچے کو آگ سے نکالا تھا تو آپ پر احساس نہیں کیا تھا... مجھے معلوم

ہی نہیں کہ میں نے کیا کیا تھا۔ میرے کانوں میں جب ایک ماں کی یہ آواز پڑی تھی کہ میرا بچہ جلتے ہوئے گھر سے میں رہ گیا ہے تو میں بھول گیا تھا کہ میں یہاں کیوں آیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا اپنا بچہ آگ میں جل رہا ہے... اپنے بچپن کی کچھ یادیں سینے میں لیے پھرتا ہوں، پھر میرے بچپن کو آگ

میں پھینک دیا گیا تھا... میں جل رہا ہوں... میرے سینے میں ایک بچہ جل رہا ہے۔ میں نے اُسے آگ سے نکالا تھا مگر وہ آپ کا بچہ نکلا... میرے سینے کا بچہ جل رہا ہے۔“

جیدانے آئسو بننے لگے۔

”میں مان نہیں سکتا کہ آپ وہ جیدانے ہیں جس کا نام آئی جی آفس میں بھی سنا جاتا ہے۔“ امتیاز نے کہا۔ ”میں نے اُس جیدانے کو کمانیاں سنیں ہیں وہ آپ کی نہیں ہو سکتیں۔ ان کمانیوں والا جیدانے

والا نہیں زلائے والا ہے۔“

”میں لٹا ہوا لٹیرا ہوں۔“ جیدانے کہا۔ ”میں مگر قابل بننا ہوں۔ میں تارے توڑا ہوں کہ نہ کہ میرا دل توڑا گیا تھا... آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں اُن کمانیوں والا جیدانے نہیں رہ جاؤں گے۔“

اب آپ جیدانے کی آخری کمانی سنیں گے، پھر جیدانے کا نام پولیس کی خفیہ فائلوں میں رہ جائے گا یا اُن سیاہی لینڈوں کے دلوں میں میرا نام کچھ دیر زندہ رہے گا جن کے مخالفین کو میرے گردہ نے دبا رکھا ہے۔

میری جگہ انہیں جو غنڈہ ملے گا اُسے وہ کمانیں گے کہ تم سے پہلے جیدانے جو کرنا تھا۔ بڑے سے بڑے جیسے کو اٹھا رکھنا تھا۔“

امتیاز اور اُس کی بیوی خاموشی سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی زبانیں جیسے لنگ ہو گئیں تھیں۔ ”آپ اتنے جیراں کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟“ جیدانے کہا۔ ”مقام پیشہ ور ڈاکو، قاتل،

رہزن، چور جب کھترے قاتل بن، اٹھائی گئے، بردہ فروش اور عصمت فروش میری طرح انسان ہوتے ہیں۔ انہوں نے دمنڈوں کی کھالیں اوڑھ لی ہیں۔“

”پھر بھی میں آپ کو قابل نفرت نہیں سمجھتا۔“ امتیاز نے کہا۔ ”آپ نے میرا گھر لوٹا نہیں میرے گھر کی خوشیاں آگ سے بچا کر مجھے دی ہیں۔“

امتیاز کے بولنے سے اُس کی بیوی بھی بول پڑی۔ ”کہنے لگی۔“ ہمارے لیے تو آپ فرشتہ ہیں۔“

کوئی مجھے نہ پہچان سکے۔

جیسا جھوٹ بول رہا تھا اس نے بچے کے متعلق یہ کچھ نہیں سوچا تھا جو اس نے بتایا تھا۔ باتیں اس لیے اُس کی زبان پر آتی تھیں کہ اُس نے ناز کو اپنی بیوی اور اُن کی بیٹی کے بچے کو اپنا بچہ سمجھا۔ ”...اور میرے ساتھی مجھ پر شک کرتے ہیں کہ میں نے بوڑھی بازار کی آگ سے ڈال مال لوٹا ہے اور جانے کتنی جیسیں کاٹی ہیں۔“ جیسا کہ مر رہا تھا۔ ”وہ مجھ سے حصہ مانگتے ہیں میں انھیں بتانا ہوں کہ میں نے ایک بچے کو آگ سے نکالا ہے تو انہیں یقین نہیں آتا۔ اس سے ہم میں دشمنی پیدا ہو گئی ہے۔“

”تو کیا آپ ان کے در سے کراچی سے بھاگ رہے ہیں؟“ — امتیاز نے پوچھا۔
 ”نہیں۔“ — جیسا نے کہا۔ ”میں ان سے ڈرا ہوا نہیں ہیں انھیں بول غائب کر سکتا ہوں کہ قیامت تک ان کا سرخ نہ ملے۔ میں مر گیا ہوں یا شاید مجھے نئی زندگی مل گئی ہے۔“
 جیسا نے اُسے سمجھانے کی پوری کوشش کی اور اُس کی یکوشش کامیاب تھی۔ امتیاز اُس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ جیسا کا احاطہ نہ دیتا تھا۔
 ”اگر آپ اپنی بیوی اور بچے کو یہاں لاسکتے ہیں تو لے آئیں۔“ — امتیاز نے کہا۔ ”کل لے آئیں پرسوں لے آئیں۔“
 ”آج رات۔“ — جیسا نے کہا۔ ”اگر آپ مجھے پناہ دے سکتے ہیں تو مجھے اپنی بیوی اور بچے کو ابھی لانا پڑے گا۔ جو سکتا ہے میں انہیں آسانی سے نہ لاسکوں۔ مجھے اپنی بیوی اور بچے کو اس طرح لانا پڑے گا جیسے انھیں اغوا کر رہا ہوں۔“

دروازہ ناز نے کھولا لیکن پہلے پوچھ کر کہ کون ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ریلوور تھا۔ وہ بدست پریشان تھی جیسا نے اُسے کہا کہ فوراً یہاں سے نکلنا ہے، پھر اُس نے ٹنٹے اور ٹمپو کے متعلق پوچھا۔ ناز نے اُسے بتایا کہ وہ دونوں اُس نہیں آتے۔ جیسا نے اُسے بتایا کہ رقم، زیورات اور کپڑوں کے سوا کچھ بھی ساتھ نہیں لے جا سکیں گے۔ اُس نے ناز کو یہ بھی بتایا کہ کہاں جانا ہے۔ اور یہ بھی کہ وہاں یہ غلام کرنا ہے کہ وہ یہاں بیوی ہیں اور یہ اُن کا اپنا بچہ ہے۔

ناز اچھی کیسیں میں کپڑے وغیرہ ڈالنے لگی اور جیسا اُس کمرے میں چلا گیا جس میں اُن دفن تھا۔ اُس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اُس نے لالٹین رکھ دی اور کمرے کے کونے میں لٹھی جھوٹی کھال سے ایک جگہ سے فرش کھودا۔ ٹین کا کس زیادہ کھرا دفن نہیں کیا گیا تھا۔ جیسا نے کس باہر نکالے بغیر کھول دیا اس میں سونے کے زیورات اور نوٹوں کی گٹھیاں پڑی تھیں۔ کچھ اوقعتی سامان بھی تھا۔ جیسا نے سونو دے کے نوٹوں کی تین گٹھیاں اور کچھ زیورات نکال لیے اور کس کا ڈھکنا بند کر دیا لیکن اس پر مٹی نہ ڈالی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کا حصہ کس میں چھوڑ دیا تھا۔

اُس نے لالٹین کی روشنی میں کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ اس ہیبت ناک کمرے میں اکو وہ خوں بچا کھڑا تھا۔ اس کے بالوں سے، اس کی بدبو سے، اس کی بد رنگ دیواروں اور کواڑوں سے اُسے پیار تھا۔ اُس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا کہ اس کمرے میں ایک لاش دفن ہے۔ اُس نے اُن کو

ہم آپ کو چور یا کاسٹائمنس کہیں گے۔

”میں آپ سے ایک بات پوچھوں گا۔“ — امتیاز نے کہا۔ ”آپ کے انسویکوں نکل آتے ہیں؟“

”آپ کو اپنا ہمدرد سمجھ کر۔“ — جیسا نے ہاتھوں سے انسویک پوچھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے کہا تھا کہ پولیس سے کام ہو تو بتاؤں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ مجھے العالم دینا چاہتے ہیں میں اب آپ سے اپنا العالم مانگوں گا۔“

دونوں سُن ہو کے رہ گئے۔ وہ ڈر گئے کہ کراچی کا یہ خطرناک غنڈہ جسے پولیس نے بھی کھلی چھٹی دے چکی ہے، نہ جانے کیا مانگ بیٹھے۔ انہوں نے یہ کہنے کی بھی جرأت نہ کی کہ ہاں، ہم العالم دیں گے۔ کہو کیا مانگتے ہو۔

”میں یہ پیشہ چھوڑ رہا ہوں۔“ — جیسا نے کہا۔ ”میں کراچی سے نکل جانا چاہتا ہوں مگر اس جال سے نکلنا ممکن نظر نہیں آتا جن کے راز میرے سینے میں ہیں وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“
 ”کیا آپ شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں؟“ — امتیاز کی بیوی نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا شریفانہ زندگی کیا ہوتی ہے۔“ — جیسا نے کہا۔ ”میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں اب مجرموں کی دنیا میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے آپ نادولوں، افسانوں اور فلموں والا ڈاکو نہ سمجھیں جو ڈاکہ زنی سے تو بڑے کے وار بھی کھاتا ہے اور تکیہ ہاتھ میں لے کر مسجد کی طرف جانا نظر آتا ہے۔ اُس نے مجھ پر کھڑا کیا۔“ — میں نہیں بتا سکتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا تعلق پولیس کے ساتھ نہ ہوتا تو میں آپ کے ساتھ ایسی باتیں نہ کرتا۔“

”آپ اپنی مشکلیں بتائیں۔“ — امتیاز نے کہا۔ ”میں آتی۔ جی سے کہہ کر آپ کا کام کرادوں گا۔“
 ”مجھے اپنی بیوی اور بچے کو ساتھ لے کر کراچی سے نکلنا ہے۔“ — جیسا نے کہا۔ ”اگر آپ جانتے ہیں کہ مجھے جیسے جرائم پیشہ آدمیوں کا پولیس اور ملک کی سیاست سے کیا تعلق ہے تو آپ میری مشکل سمجھ جائیں گے۔ مجھے میرے ہی بالوں کے ہاتھوں مروا دیا جائے گا۔ مجھے پولیس کے ہاتھوں مروا کر مشہور کیا جائے گا کہ میں پولیس مقابلے میں مارا گیا ہوں۔“

”کیا آپ کے خلاف کسی عدالت میں کوئی کیس چل رہا ہے؟“
 ”نہیں۔“ — جیسا نے جواب دیا۔ ”کسی بھی عدالت میں میرا ایک بھی کیس نہیں۔ اس کا لحاظ سے میری سچی صاف ہے۔ لیکن طے طوں کے اعمال کی تختیاں میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ مجھ سے

کوئی سی گارنٹی لے لیں۔ کسی کے خلاف کوئی بات نہیں کروں گا۔“

جیسا نے امتیاز کو گھسیٹ سے بتایا کہ وہ کیوں پیشہ چھوڑ رہا ہے۔ ناز کا جب ذکر آیا تو وہ ذرا جھجکا گیا اور بولا۔ ”میری بیوی ہے اور آپ کی طرح ہمارا بھی ایک ہی بچہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا بچہ بھی عادی مجرم بنے۔ اُس کی عمر آپ کے بچے جتنی ہے۔ وہ اب اچھا اور بڑا سمجھنے لگا ہے۔ اس سے پہلے کہ اُسے پتہ چلے کہ اس کا باپ جیب کھڑا اور غنڈوں کا استاد ہے۔ میں اُس کے لیے ایک پانچواں اور گھڑی ماحول پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُسے ایسی جگہ لے جانا چاہتا ہوں جہاں

مال بھوکا پیاسا کھ کر مارتا تھا۔ اُسے کبھی افسوس نہیں ہوا تھا مگر آج رات اُسے یوں لگا جیسے اس گھر سے میں فوجی عورت بسک رہی ہو۔ اُسے ان کی ہمارے بیوی اور اُس کی جوان بیٹی یاد آتیں۔ اُس نے سون کی آہ کی کہ ان کی بیٹی کے بچے کو گود لے کر اُس نے گناہ کا کفارہ ادا کر دیا ہے لیکن یہ سون زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ اُس پر خوف طاری ہو گیا اور وہ گھر سے نکل آیا۔ اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اُسے یہاں سے جلدی نکلنا تھا کسی بھی وقت مٹا اور میٹا سکتے تھے۔ اُسے سب سے پہلے منظر علی صدیقی سے بھی خطرہ تھا۔ وہ اپنے گھر سے میں گیا۔ وہ ناز سے کہنے لگا تھا کہ بچے کو اٹھاؤ اور چلو گھر اُس کی نظرس مال اور بچے کی تصویر پر جم کے رہ گئیں۔ یہ وہ تصویر تھی جو ناز نے بازار سے منگو کر اس گھر سے میں لٹکا رکھی تھی۔ جیدا کے روالور کی دو گولیوں نے شیشہ چھینا چڑھ کر دیا تھا۔ ایک گولی بچے کو لگی تھی ایک مال کو۔ ناز نے تصویر میں لگی رہنے دی تھی۔

جیدا اس تصویر کو دیکھتا رہا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اُسے اچانک روالور یاد آیا۔ اُس نے ناز سے پوچھا روالور اور بہت سی گولیاں بھی اچھی ہیں میں رکھ لیں۔

مٹا اور میٹا سب سے پہلے صدیقی کے پاس تھا نے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اے۔ ایس۔ آئی اللہ اور کبھی وہیں تھا۔

”یہ علاقہ تمہارا ہے۔“ سب سے پہلے صدیقی انہیں بڑبڑاتا تھا۔ ”جب تک میں یہاں ہوں یہاں بادشاہی کرو۔ جیدا کی اس لاش دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ اس لڑکی کو ساتھ لے کر نکل جاتا ہے جو اُس نے اپنے پاس رکھی ہوئی ہے۔“

”جیدا کا مانع تو انشا خراب ہو گیا ہے کہ دن کو تم یہاں سے گئے تو وہ کو صدیقی صاحب کی بے عتقی کر گیا۔“ اللہ داد نے کہا۔ ”اگر تم اُسے پار کر سکتے ہو تو ہم جو دست کر سکتے ہیں کریں گے تم مجھ پر نہ کر سکو تو جلدی بنا دینا ہم اُس کا بندوبست کر لیں گے۔“

”ہم تو جلے بیٹھے ہیں صدیقی صاحب۔“ فیو نے کہا۔ ”ایک تو وہ سارا مال منجم کر گیا ہے دوسرے اُس کی چھوڑی نے ہمیں پستول دکھایا ہے۔ گھر سے مار کے ساتھ بھاگ جوتی اور جارہی تھی جوتی عورت ہم کو پستول دکھاتے؟ آپ ذرا اپنی آنکھیں اور کان بند رکھیں۔ ہم نے اُسے کل رات تک مہلت دی ہے۔ وہ چلا جائے اور چھوڑی ہیں بے جا۔“

”وہ زندہ نہ جائے۔“ سب سے پہلے صدیقی نے کہا۔ ”چھوڑی بھاگ کے کہاں جانے گی تم جادو اُسی مکان میں چلے جا رہا ہے۔ سوتے ہو۔ دیکھو وہاں سے یا نہیں۔ اگر ہے تو آج رات ہی اُس کا قتلہ پال کر دو اور اُس گھر سے میں دفن کر دو جہاں تم کہتے ہو کہ اُس نے پولیس کے وعدہ معاف کواد کو مار ڈالا۔“

”ہم یہ لاش لے کر آکر کسے اُسے گھر فدا کر سکتا ہوں لیکن اس کی رسائی بہت آدھرتک ہے۔ صاف بری ہو کر نکل آئے گا۔“

”ہم ابھی جاتے ہیں۔“ مٹے نے کہا۔ ”آپ کو بڑی اچھی خبر سنائیں گے۔“

دونوں ہٹانے سے نکل گئے۔

وہ جب اپنے گھر کے دروازے پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ دروازہ

صحیح یوں کھلا نہیں رہا تھا۔ دونوں اندر گئے اور دروازے کی زنجیریں چڑھادیں۔ تمام کمروں میں اندھیل تھا۔ وہ جیدا کے گھر سے میں گئے۔ وہاں سیاہ کالا سکوت تھا۔ دونوں نے بیک وقت دیا سلاخیال جلا نہیں اندر کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے لائٹیں ڈھونڈ کر جلا دی اور تمام کمروں میں گھوم گئے۔ وہاں جیدا تھا۔ نہ ناز۔ نہ بیچر۔ وہ دوڑتے اُس گھر سے میں گئے جہاں ان کی لاش اور کبھی دفن تھا۔ دیکھی بکس کھوٹا پڑا تھا۔ ڈھکنا اٹھا کر دیکھا۔ زبورات اور نولوں کی کچھ گچھیاں پڑی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”اُس نے مال کھو دیا ہے۔ نکال کچھ نہیں۔“ فیو نے کہا۔

”ہم نے رقم گنی کب تھی۔“ مٹے نے کہا۔ ”وہ کچھ نہ کچھ لے ضرور گیا ہے۔“

”وہ کچھ گیا ہے۔“ فیو نے کہا۔ ”معلوم نہیں کب آیا تھا اور کب گیا ہے۔ سالا چھوڑی کو لے گیا ہے۔“

”ہم اُسے ڈھونڈیں گے۔“ مٹے نے کہا۔ ”جلو صدیقی کو بتا دیتے ہیں۔ وہ اُسے ڈھونڈنے کا انتظام کر دے گا۔“

جس وقت مٹا اور میٹا مکان میں داخل ہوئے تھے جس وقت جیدا ناز اور بچے کے ساتھ امتیاز کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ امتیاز اور اُس کی بیوی نے بڑے پیار اور خلوص سے ان کا استقبال کیا۔ وہ سب بیٹھے تھے۔ ناز نے امتیاز کی بیوی کو غور سے دیکھا۔ وہ پہلے ہی ناز کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

”اُسی تم ناز تو نہیں ہو؟“ امتیاز کی بیوی نے کہا۔ ”یابھی غلطی لگ رہی ہے۔“

”میں ناز ہی ہوں آپا۔“ ناز نے جھینپتے ہوئے مری مری آواز میں کہا۔

”آپ نے شاید اسے نہیں پہچانا۔“ امتیاز کی بیوی نے ناز کے باب کا نام لے کر امتیاز سے کہا۔ ”ان کی بیٹی ہے جو...“ اس سے آگے اُس نے کچھ نہ کہا۔ اُسے یہ کہنا اچھا نہ لگا کہ یہ لڑکی گھر سے بھاگ گئی تھی۔

امتیاز اور اُس کی بیوی حیدر آباد کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہاں آئے تھے۔ امتیاز کی بیوی کا گھر ناز کے گھر سے دور نہیں تھا۔ امتیاز کا گھر دور تھا۔

”تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا بھائی اسلم یاد آ گیا ہے۔“ امتیاز کی بیوی نے کہا۔ ”اگر تم بڑا نہ مانو تو کہہ دوں۔ لوگ کہتے تھے کہ تم اسلم کے ساتھ چلی جی ہو مگر یہ بات غلط لگی۔ میرا بھائی تھا تو آوارہ لیکن ایسا نہیں تھا۔ تمہارا ہے جانے کے بعد وہ گھر آ گیا تھا۔“

اسلم جو ناز کو جیدا کے کمالے کر آیا تھا، امتیاز کی بیوی کا بھائی تھا۔ جیدا کی ایک میلنگ سے تنگ آکر وہ کراچی کے ایک ہوش کی تیسری منزل سے خود کو خود کشی کر چکا تھا اور اُس کی لاش لاوارث قرار دے کر پولیس نے کہیں دفن کر دی تھی۔

”اسلم آج کل کہاں سے آپا؟“ ناز نے لیل پوچھا جیسے وہ اسلم کی موت سے بے خبر ہو۔

”کچھ پتہ نہیں۔“ امتیاز کی بیوی نے کہا۔ ”وہ بہت ہی آوارہ ہو گیا تھا۔ کراچی کے ایک آدمی نے بتایا تھا کہ وہ انگلینڈ چلا گیا ہے۔ وہ شاید واپس نہیں آئے گا۔“

ناز پریشان ہو گئی اور سوچنے لگی کہ امتیاز کی بیوی کو بتا دے کہ اُس کے بھائی نے اُس سے دھوکہ دیا اور اپنے بچے کی سزا لیا گیا ہے؟

میں آگیا ہے۔ میں دوسرے دن سے جو کتنا پھر تاجپول کہ مجھے کراچی سے نکالو، وہ اس لیے کہ رہا ہوں کہ مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں رہا۔ اگر کسی نے میرا دستہ روکا تو وہ میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔ اور جو کتنا ہے کہ میں خود ہی اپنے ہاتھوں قتل ہو جاؤں۔

”معلوم ہو کہ آپ کے سر کو زیادہ چوٹ آئی ہے۔“ امتیاز نے منہس کر کہا۔ ”آپ کا دماغ بل گیا ہے یا آپ پرگاہ کی ذہنیت طاری ہو گئی ہے؟“
جیدا اپنے آپ میں گم ہو گیا۔ اس نے امتیاز کی بات جیسے نبی ہی نہ ہو۔ وہ اس کی منہسی سے لائق رہا۔ اس دوران امتیاز کی بیوی ناز کو دوسرے کمرے میں لے گئی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ تمہارا خاوند حبیب کھڑا اور غمگین بد معاش ہے۔“ امتیاز کی بیوی نے ناز سے کہا۔ ”میرے لیے تو یہ فرشتہ ہے۔ شادی کو گیارہ سال ہو چکے تھے، خدا نے اولاد سے محرم رکھا۔ مجھے تو طلاق مل رہی تھی۔ امتیاز صاحب کو مجھ سے اتنی محبت ہے کہ یہ نہ مانے۔ ان کے والدین نے تو فیصلہ سنا دیا تھا کہ اولاد کی خاطر بیٹے کی دوسری شادی کرائیں گے۔ اللہ نے میری فریادیں سن لیں اور گیارہویں سال پیچہ دیا۔ یہ دو سال کا جوان تو بوڑھی بازار کی آگ کے شعلوں نے اسے گود میں لے لیا جس اللہ نے پیچہ دیا تھا، وہی اسے بچا سکتا تھا۔ اس نے تمہارے خاوند کے دل میں رحم ڈالا اور اسے بہت دینی میں تو اپنے بچے کے ساتھ اس آدمی کو بھی روک چکی تھی۔ اس آگ سے اور وہ بھی دوسری منزل سے نہ فوٹکل آنا ممکن ہی نہیں تھا لیکن جس طرح شیخ آگ سے نکلا.... میں نہیں مانتی۔ اس نے دونوں ہاتھ کالوں پر رکھ کر کہا۔ ”ہمیں ناز اب میں نہیں مانتی۔ میرا پیچہ اور تمہارا خاوند خدا کے بھیجے ہوئے کسی فرشتے کے پرول پر چلتی ہوئی بلڈنگ کی سب سے اوپر والی منزل سے اترے تھے.... ناز! یہ مجھ تھا.... مجھ تھا۔“
”اور یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ میں اس شخص کی بیوی ہوں۔“ ناز نے کہا۔ ”آپ نہیں جانتیں آپا جیدا انسان نہیں درندہ ہے.... درندہ تھا.... آج دیکھ لو۔“

”یہ غالباً تمہارا کمال ہے۔“

”ہمیں۔“ ناز نے کہا۔ ”یہ اس کا اپنا کمال ہے۔ اس نے اپنے دل میں میری محبت پیدا کی۔ یہ صرف حبیب کھڑا نہیں تھا، بردہ فروش اور عصمت فروش بھی تھا۔“

”تم اس تک نہیں کیے تھیں؟“

ناز کے چہرے کا رنگ بدل گیا آنکھیں بے چین ہو گئیں اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے امتیاز کی بیوی کے اس سوال کو ٹال رہی ہو۔

”جولو، دفع کرو۔“ امتیاز کی بیوی نے ناز کے چہرے کے تاثرات کی تبدیلی بھلا پتے ہوئے کہا۔ ”یہ کوئی پوچھنے والی بات نہیں تھی۔ انسان کی جہاں لکھی ہوئی ہے وہیں پہنچ جاتا ہے۔“

”میں انہیں کوسا کرتی ہوں جنہوں نے مجھے گناہوں کی اس دنیا میں پھینکا تھا۔“ ناز نے کہا۔ ”اور میں ہر سلسل میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں جس نے مجھے اس غلاظت سے پاک صاف نکالا۔“

”تمہیں یہاں تک پہنچانے والے کون تھے؟“

امتیاز نے جیدا، ناز اور بچے کو پناہ میں لے لیا اور انہیں کہا کہ وہ انہیں کراچی سے نکالنے کا انتظام کروے گا۔

”اس کے یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ جہاں جاتیں وہاں اپنا علم ایسا لکھیں کہ کوئی آپ کو بچاں نہ سکے۔“ امتیاز نے جیدا سے کہا۔ ”آپ کو مرے سے ہوتے انسانوں کی طرح رہنا ہوگا.... ڈوڑھ دو سال خیریت سے گزر گئے تو آپ تمام خدو ل سے آزاد ہو جائیں گے۔ یہاں حکومتیں بدلتے دیر نہیں لگتی۔“

”ناز!۔“ امتیاز کی بیوی نے کہا۔ ”تم بھی رہنا۔ مروا کیلا پاں سے گزر جائے تو کوئی اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، لیکن تم جیسے خوب صورت اور اتنے اچھے قد کاٹھ والی لڑکی جو ہمیں جاری ہو تو کوکل کر کر اسے دیکھتے ہیں تم فوراً پہچانی جاؤ گی۔“

”جیدا بھائی!۔“ امتیاز نے کہا۔ ”آپ ضرورت سے زیادہ ڈرنے سے جوتے معلوم ہوتے ہیں۔“
”میں آپ کو کتنا چکا بول کہ میں کیوں ڈرا ہوا ہوں۔“ جیدا نے کہا۔ ”صرف ایک بات آپ کو نہیں بتانی تھی.... میں ایک اور انسان سے بھی ڈر رہا ہوں۔ میں اس سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ کل یہ میرے ہاتھ رہے گا، میرے تعاقب میں رہے گا۔“

”کون ہے وہ؟“

”وہ میں خود ہوں۔“ جیدا نے کہا۔ ”میری بدھنی یہ ہے کہ میں کچھ بڑھ چکا ہوں لیکن میں ایک ڈارسی لکھتا رہا ہوں.... جلاؤ والی ہے۔ یہ ڈارسی میری دکھائی سنہالی کی ساتھی تھی۔ میرے کدھن کرا اپنے سینے میں ڈال لیتی تھی۔ میرا سینہ ہلکا ہوتا تھا مگر میں کتا ہوں کی اس دنیا سے رخصت ہونے کا تو یہ ڈارسی میری دشمن ہو گئی۔ اس میں میری سزا وار دانت لکھی ہوئی تھی۔ یہ ڈارسی مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتی تھی۔ میں اسے جلا آیا ہوں.... میں اسے کہہ رہا تھا کہ میں اپنے آپ سے ڈر رہا ہوں۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اپنے آپ کو جسے آپ ضمیر کہا کرتے ہیں، مارا نہیں۔ میرا جسم جو کتنا بار ضمیر میرے جسم سے لاتعلقی رہا میں نے اسے لاتعلقی رکھا ضمیر شاید مرنا نہیں کرتا۔ اب وہ بھی میرا دشمن ہو گیا ہے مجھے کچھ پتہ تھے پر مجھ کو رہا ہے۔ مجھے سزا دینے پر تیار ہوا ہے۔“

”خجیا بھائی!۔“ امتیاز نے کہا۔ ”فلا سفر بننے کی کوشش نہ کریں۔ سیدھی سی بات ہے کہ آپ اس ذلیل پیشے سے تنگ سحر جا رہے ہیں۔ اب اسی حقیقت پر نظر رکھیں۔ آپ کا ذہن نارمل نہیں۔ آپ نے سزا وار ڈانگ کے زخم کی ٹی بدلائی نہیں کل میں آپ کو یہاں قریب ہی ایک ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔“
”زخم میرے دل میں ہیں۔“ جیدا نے کہا۔ ”میرا سینہ زخموں سے چھلنی ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا ہے کہ میرا ذہن نارمل نہیں۔ میں سمجھ نہیں سکتا کہ میرے اندر کیا طوفان اٹھ رہا ہے۔ میں.... میں.... میں ایسے محسوس کر رہا ہوں کچھ اور ہونے والا ہے۔ آپ نے یہ بھی ٹھیک کہا ہے کہ میں ضرورت سے زیادہ ڈر رہا ہوں۔ میں بزدل نہیں تھا میں جانتا ہی نہیں تھا کہ ڈر جتنا ہی ہے مگر میرا دل نہ جانے کیسی گرفت

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

”یکول چوہدری صاحب؟۔ امتیاز نے پوچھا۔ آج اتنی سیر سے کیسے؟“
”رات ڈی آئی جی صاحب سے بات ہوئی تھی۔ انپکٹر چوہدری نے کہا۔“ انہوں نے
کہا تھا کہ صبح سویرے سویرے دفتر آ جانا۔ وہ ابھی آتے نہیں۔“

”کیا بات ہوئی تھی؟“

”ایک بڑی شیڈ کے متعلق کچھ لینا ہے۔ انپکٹر چوہدری نے کہا۔“ مفروضہ ہے۔۔۔ امتیاز
یار کسی قاتل اور ڈاکو پر ماتھ ڈالنے کے لیے حکم لینا پڑتا ہے جہاں آئی جی محکمہ مجبور ہوں، وہاں ہم کسی چور
اُچکنے پر کیسے ماتھ ڈال سکتے ہیں۔ یہ لازم سرکار کا خاص آدمی ہے۔“

”بٹا چوہدری صاحب!۔ امتیاز نے کہا۔“ آپ کو جو حکم ملتا ہے اُس پر عمل کریں اگر کوئی بھاری
غندہ ہے تو آپ کو کیا ہر کل حکومت بدل جائے گی تو تمام سرکاری غندے ہی محرم پارٹی کی سرکار
کے خاص آدمی بن جائیں گے۔۔۔ میرا ایک مسئلہ مل کر دس۔“

”حکم کو یاد رہا۔ انپکٹر چوہدری نے کہا۔“ مختار سے تو ہم خام ہیں۔“

امتیاز اسے اپنی میز تک لے گیا اور اپنے قریب کرسی پر بٹھا کر اسے کہا۔ ”میں نیکی کے جواب
میں ایک نیکی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کام مکمل نہیں۔ ایک پرانا پانی انسان بن گیا ہے
وہ پولیس کے ریکارڈ پر ہے، بلکہ پول کپولیس اُس کے ریکارڈ پر ہے۔ اُس کے خلاف کسی
کورٹ میں کوئی کیس نہیں۔ اسے کراچی سے نکالنا ہے اور ایسا انتظام کرنا ہے کہ اُس کے تعاقب میں
کوئی نہ جائے اور ہم سب اُسے بھول جائیں۔“

”امتیاز دوست!۔ انپکٹر چوہدری نے کہا۔“ میں تمہاری خاطر یہ قربانی دے سکتا ہوں کہ
کام کر دوں گا۔ لوں گا کچھ بھی نہیں۔ نہ اُس سے نرم سے۔ صرف یہ بتا دو کہ اُس نے تمہارا پیٹ بھر دیا
ہے؟ اگر اُس نے نہیں خوش کر دیا ہے تو میں خوشی سے یہ کام کر دوں گا۔“

”اُس نے مجھے اس قدر خوش کیا ہے کہ آپ تصور میں نہیں لا سکتے۔“ امتیاز نے کہا۔
”اُس نے میرا نہیں، میری روح کا پیٹ بھر دیا ہے۔ میں نے اُس سے لیا کچھ بھی نہیں۔ اگر آپ کچھ لینا
چاہیں تو میں جو اسے دینا چاہتا تھا وہ آپ کو دے دوں گا۔“

”وہ کیا چیز ہے جو تم اسے دینا چاہتے تھے لیکن مجھے دے دو گے؟“

”سوئے کا ہار۔“ امتیاز نے کہا۔

انپکٹر چوہدری نے امتیاز کو بڑی غور سے دیکھا اور بولا۔ ”کیا تم رات سوئے نہیں؟ کہیں گانے

کا کنش تو نہیں لگایا؟۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو؟ کس کی بات کر رہے ہو؟

امتیاز نے گھر سانس لے کر کہا۔ ”بات اُٹھی سی ہے۔ ڈی آئی جی صاحب کے آنے تک

میری بات سن لیں۔ ذرا لمبی بات ہے۔۔۔ آپ شاید اسے جانتے بھی ہوں گے۔ اُس کا نام جیلا ہے۔“

”جیلا؟۔ انپکٹر چوہدری نے پرک کر کہا۔“ جیلا؟۔۔۔ وہ کہاں ہے؟“

”میرے پاس۔“ امتیاز نے کہا۔ ”میں جس کو آڑ میں رہتا ہوں، وہاں ہے۔۔۔ آپ اسے

جانتے ہیں نا؟“

انپکٹر چوہدری خوشی اور بھان سے بے قابو ہو چلا تھا۔ سنبھل کر بولا۔ ”ہاں، ہاں، میں اسے جانتا
ہوں کہ کھانا جیب کھڑا ہے لیکن پولیس اور سیاسی لیڈروں میں اُس کا شمار ہے۔“

”آپ اسے جیب کھڑے یا سیاسی غندے کی حیثیت سے جانتے ہوں گے۔“ امتیاز نے
کہا۔ ”لیکن میں نے اسے کسی اور رنگ روپ میں دیکھا ہے۔ میرے لیے وہ فرشتہ ہے۔ آپ تو
جانتے ہیں کہ میں بوہڑی بازار میں دوسری منزل میں رہتا تھا۔“

”ارے ہاں بھائی!۔ انپکٹر چوہدری نے کہا۔“ میں نے کل سنا ہے کہ تمہارا سب کچھ تباہ
ہو گیا ہے بہت افسوس ہے بھائی، کوئی خدمت میں کر سکو تو بتاؤ۔“

”اللہ آپ کو خوش رکھے۔“ امتیاز نے کہا۔ ”ایک دوست نے اپنا کارڈ دے دیا ہے
یہ جو کچھ ملے پھرتے ہوئے ہیں، یہی سچے ہیں۔ اب تو نیا کھڑے ہونے سے بنا پاؤ گے گا۔“

”میں نے تو امتیاز!۔ انپکٹر چوہدری نے کہا۔“ جس شخص کو تم کراچی سے نکالنا چاہتے ہو، وہ
میں اس قسم کے چار گھر بنا کے دے سکتا ہے۔ تم اُس کے لیے جو کام کر رہے ہو وہی کام نہیں۔
اس کے عوض تم اُس سے اپنے جے ہوئے سامان کی کوئی قیمت وصول کر سکتے ہو اور وہ اتنی قیمت
آسانی سے دے سکتا ہے۔“

”وہ مجھے اتنی زیادہ قیمت دے چکا ہے جو کسی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی۔“ امتیاز نے کہا۔
”اُس نے میرے سچے چلتی ہوئی بلڈنگ سے نکالا ہے۔۔۔ آپ میری ساری بات سن لیں۔“

امتیاز کو جیلانے اپنی جگہ کی سناٹی تھی، وہ اُس نے انپکٹر چوہدری کو سنا دی جیسا کہ جس طرح
امتیاز کے بچے کو اس سے نکالا تھا، وہ بھی سنا دیا اور جس جذباتی انداز سے جیلا نے امتیاز کو اپنا مسئلہ
بتایا تھا، امتیاز نے اسی انداز سے چوہدری کو سنا دیا۔

امتیاز بات تقریباً مکمل کر چکا تھا کہ ڈی آئی جی ابھی انپکٹر چوہدری اٹھ دوڑا اور اُس کے کچھپے
میں چلا گیا۔

”سب بچہ صدیقی کو اگر یہ مل گیا تھا کہ جیلا اپنے میدان سے نکل رہا ہے تو اُس نے اُس کا بچپا
کہوں نہیں کیا؟۔ ڈی آئی جی انپکٹر چوہدری سے کہہ رہا تھا۔ ”میرا خیال ہے صدیقی نے اُسے نکل
جانے میں مدد دی ہے۔“

”وہ کہیں بھی نہیں گیا سر!۔ انپکٹر چوہدری نے کہا۔“ وہ آپ کی بغل میں ہے۔ آپ کے
شینو کے گھر میں۔“

”امتیاز نے گھر میں؟“

”جی سر!۔“

”وہاں کیسے پہنچا؟۔ ڈی آئی جی نے پوچھا۔“ کیا امتیاز نے اُسے پناہ دی ہے؟
انپکٹر چوہدری نے اُسے وہ ساری داستان سنا دی جو اسے امتیاز نے سناٹی تھی۔

”امتیاز نے چارے کو کیا پتہ کہ جیلا کھسا کھا گئے؟۔ ڈی آئی جی نے کہا۔“ چوہدری اکیلا
مان سکتے ہو کہ جیلا شریفانہ زندگی بسر کرنے جا رہا ہے؟۔۔۔ وہ کجواس کرتا ہے۔ بہت بڑا فریب کار

ہے۔ وہ یہاں سے بے شمار مال لے جا رہا ہے جس سے وہ مملکت کا کاروبار شروع کرے گا وہ
وزیر کو یاد رہے۔ تم جانتے ہو چوہدری! ہمارے دو وزیر مملکت کو دار سے ہیں۔ ہمارے مملکت پرستان
جاتے ہیں اور ہندوستانی مملکت ادھر آتے ہیں ہم مملکت کو نہیں روک سکتے مگر ہم اتنے مردہ بھی نہیں
ہو سکتے کہ مملکتوں کے بھیس میں ہندوستانی جاسوس ہماری سرحد کے اندر آئیں اور یہاں سے قیمتی راز
لے جائیں۔ تم جانتے ہو کہ مملکتوں کا درپردہ رابطہ اوپر کے حضرات سے بھی ہوتا ہے۔ اس لیے دین کو
تم جانتے ہو۔ جیسا تو سب سے زیادہ خطرناک آدمی ہے۔ اسے ہم گرفتار کر لیں تو صاف بری ہو جائے گا۔
اُس کے خلاف کوئی ایک بھی مقدمہ کامیاب نہیں ہو گا۔ اس کا وہی علاج کرنا ہے۔

”لیکن سر!۔۔۔ اسپیکر چوہدری نے کہا۔“ امتیاز کو پتہ نہیں چلنا چاہیے۔“

”کیا تم راج پولیس میں بھرتی ہوئے ہو؟“ ڈی۔ آئی جی نے کہا۔ ”وہ عقل اور تجربے سے کام لوتے۔“

”اب کا مطلب پولیس مقابلے سے ہے؟“

”کسی حد تک۔“ ڈی۔ آئی جی نے کہا۔ ”لیکن تمہیں اس کے لیے بڑا مضبوط جواز پرا کرنا ہو گا۔“

”وہ میں کر لوں گا۔“ اسپیکر چوہدری نے کہا۔ ”میں امتیاز سے کتنا محول کہ میں آج رات تین چار
آدمی ساتھ لے کر جیاد کو کراچی سے نکال دوں گا۔ اُس کے دشمنوں کو اُس کے قریب آنے کی
جرات نہیں ہوگی۔“

”پہلے تمہیں سچاے رکھنے کی کوشش کروں گا۔“

”ادھر انہوں نے اس مہم کی تفصیلات طے کر لیں۔“

”مٹو امتیاز بھائی۔“ اسپیکر چوہدری نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں کسی کی ایسی مدد کرنے کا قائل

نہیں ہوں جو قانون کے دائرے سے باہر ہو لیکن جیاد نے تم پر جو احسان کیا ہے اور تم نے مجھ پر جو
احسان کر رکھے ہیں، ان کے عوض میں تمہارا کام کر دوں گا۔۔۔ یوں کرنا جیاد کو اُس کی بیوی اور چھ سہیلیاں
رات ایک سبکے تیار رکھنا۔ ایک احتیاط لازمی ہے۔ اُسے یہ بتانا کہ میں اُسے لینے آؤں گا، ورنہ وہ
نہیں آئے گا شاید مجھ پر اعتبار نہ کرے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی بھی وقت یہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ اُسے
میں نے کراچی سے نکالا تھا۔ وہ آدمی آئیں گے جیاد انہیں پہچاننے کی کوشش نہ کرے۔ اُسے بتا
دینا کہ میں کچھ ڈونک بیل جانا پڑے گا۔“

امتیاز نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اسپیکر چوہدری کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ سب کچھ سمجھ گیا ہے۔ وہ
بہت ہی خوش تھا کہ وہ احسان کا بدلہ چکا رہا ہے۔ اُس نے دن بڑی شکل سے گزرا۔ وہ بہت جلد گھر
جا کر جیاد کو بتانا چاہتا تھا کہ اُسے کراچی سے نکالنے کا انتظام ہو گیا ہے۔ مگر وہ ٹیڈو گراف تھا۔ اُس کے
افسر بھی جانتے تھے کہ اس کے گھر کا سارا سامان جل گیا ہے۔ اسے پھر بھی چھٹی جلدی نہ مل سکی۔

وہ پھلے پھر گیا اور جیاد کو بتایا کہ رات کو وہ تیار رہے۔ جیاد نے اُس پر سوالوں کی ٹوچھا لگادی
۔۔۔ وہ کون لوگ ہیں؟ کیا امتیاز انہیں قابل اعتماد سمجھتا ہے؟ وہ اُسے کہاں تک لے جائیں گے؟
انہیں کچھ دینا دلانا ہے؟۔۔۔ اور ایسے کئی سوالات تھے جن میں بعض کے جواب امتیاز کے پاس
نہیں تھے اور بعض کے جواب یہ کہ نہ دیتے کہ اُسے کہا گیا ہے کہ جیاد کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ
وہ کون ہیں جیاد کو امتیاز پر بھروسہ تھا۔

”کہاں جانے کا ارادہ ہے؟۔۔۔ ناز نے جیاد سے الگ کمرے میں بیٹھ کر پوچھا۔
”یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔“ جیاد نے جواب دیا۔ ”کبھی کبھی راولپنڈی میں آتا ہے۔۔۔
میں داڑھی بڑھاؤں گا۔۔۔ ۱۰۰۰ پچھاس رقم بہت ہے۔ زیورات بھی ہیں۔ وہاں کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے
سوچ لیں گے ناز! اس ختم سے نکل جانے دو سوچ لیں گے۔“
”ناز کچھ مشکل پیش آگئی تو بھی وہ زندگی حسین ہوگی۔“ ناز نے کہا۔ ”میں محنت مزدوری کر کے زندگی
بسر کر لوں گی، تو بھی وہ زندگی حسین ہوگی۔“

”کہا میں جیب تراشی اور چوری چکاری کے سوا اور کوئی کام نہیں کر سوں گا؟۔۔۔ جیاد نے کہا۔
”تم نے مجھے شاید ذہنی طور پر پابند سمجھ لیا ہے۔“ وہ چپ ہو کر سوچ میں گھبرا گیا، پھر سر جھکا لیا۔
”کیا سوچ رہے ہو؟۔۔۔ ناز نے بڑے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر سر اڑا دیا اور
مسکراتے ہوئے۔۔۔ ”پہلے میں تمہاری قیدی تھی، اب تم میرے قیدی ہو۔ اب تمہاری سوچیں بھی قیدی ہیں
۔۔۔ کیا سوچ رہے ہو؟“

”سوچ نہیں رہا ناز!۔۔۔ جیاد نے کہا اور چارپائی سے اُٹھ کر کمرے میں ٹپکنے لگا۔ ”میں شاید سمجھتا
رہا ہوں میں کبھی سمجھتا یا نہیں تھا۔ وہ لوٹھا موسیقار ہے نا! اُس نے کہا تھا، گناہ ہو گیا سو ہو گیا۔ کوشش کرو
پھر گناہ نہ ہو سکر سمجھتا یا نہیں سمجھتا! اس کے نہیں پڑھنے دیتا نیک اولوں کو دیکھ کی طرح کھا جاتا ہے
تو بکرو اور پچھلے گناہوں کو بھول جاؤ۔“

”بھول جاؤ نا؟۔۔۔ ناز نے کہا۔ ”بھول جاؤ۔“

”میرے گناہ میرے سامنے ناز رہے ہیں ناز!“

”تم نے ایک بچے کو گال سے نکال کر گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔“ ناز نے کہا۔
”تم نے مجھے گناہوں کی دنیا میں لا کر گناہوں سے پاک رکھا ہے۔۔۔“

”میں نے بچے زندہ جلائے بھی ہیں ناز!۔۔۔ جیاد نے بے چین سے لہجے میں کہا۔ ”میرے
ہاتھ انسانی خون سے لال ہیں میرا ضمیر مجھے طعنہ دے رہا ہے، لاکار رہا ہے جیسے کہ رہا ہو کہ
بچ کے جاؤ گے کہاں؟“

ناز پریشان ہو گئی۔ یہ تو ذرا سی اور بھی لڑائی ہو کر تھی مگر اب اُس میں دلیری اور خود اعتمادی آگئی
تھی۔ اُس کی پریشانی بھی کہ جیاد اُسے اُٹھایا اُٹھایا تھا اور اُسے سنبھالنا وہ اپنی ذمہ داری سمجھتی تھی۔

جیاد اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اُس کا یہ ارادہ بکتہ تھا کہ وہ جرائم کی دنیا پر
واپس نہیں جائے گا مگر شرفیازہ زندگی کی دلیز پر قدم رکھنے سے گھبرا رہا تھا جیسے اُسے کوئی پیچھے
گھسیٹ رہا ہو، جیسے اُسے کوئی اس دلیز سے آگے قدم رکھنے سے روک رہا ہو یہ سمجھتا تھا۔
وہ سمجھ رہا تھا اور جس کا اُس نے اظہار بھی کر دیا تھا۔ اسے اُس نے ضمیر بھی کہا تھا یہی وہ ڈر تھا اور یہی وہ
جھجک تھی جو اُسے کراچی سے نکلنے سے روکے ہوئے تھی، ورنہ جیاد جیسا خود بخوار انسان اور گناہ

اُستاد کراچی سے اُٹھ کر نکل جانا پولیس اور دیگر دشمنوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل جانا۔ یہ اُس کی
اپنی نفسیاتی کیفیت تھی جو اُسے پولیس، سٹے، ٹیڈو اور سیاسی لیڈروں کی صورت میں نظر آ رہی تھی۔ اُس
نے لاکھوں کے آغاز میں بھرا مزہ زندگی کا آغاز کیا تھا، اب وہ جوانی کے آخری مرحلے پر اور جرائم کے عروج

دو آدمی کافی تھے۔ میں جیاد اور بچے کو بھی ختم کر دیتا اور لڑکی کو آسانی سے ساتھ لاسکتا تھا۔
 ”تم تو کہتے ہو کہ جیاد کو اچھی طرح جانتے ہو۔ چوہدری نے کہا۔ ”یہ کہتا ہے اُسے کچھ شک
 ہو جائے، پھر وہ ہم اپنا کھل کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ اُس صورت میں ہم جو کارروائی کریں گے وہ پولیس
 مقابلہ ہوگا۔ ہمیں ادھر ادھر سے ایک دو آدمی پکڑ کر انھیں گولی مارنی پڑے گی تاکہ کس پوری طرح مضبوط
 ہو جائے۔ میری ضرورت اس لیے بھی ہے کہ وہ بے شمار مال ساتھ لے جا رہا ہے اور اُس کے
 ساتھ بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ تم جانتے ہو کہ مال اور عورت دشمنی اور فساد کی جڑ ہے۔ ہم آپس میں
 لڑ رہے ہیں۔ اگر وہ فوراً مارا گیا تو ہم سب لڑکی اور مال کے ساتھ وہاں سے کھسک آئیں گے اور اخباروں
 میں خبر چھپے گی کہ کراچی کا مشہور غنڈہ جیاد قتل ہو گیا ہے اور پولیس نے نا معلوم قاتل کے خلاف
 مقدمہ درج کر لیا ہے۔۔۔۔۔ باقی سیکم تم جانتے ہو ہمیں جو انعام ملے گا، وہ بھی تم جانتے ہو۔ مقابلے کی
 صورت میں تمیں سرکاری طور پر الگ انعام دیا جائے گا اور اخباروں میں تمھاری تصویریں چھپیں گی۔“

رات کا ایک بج رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ جیاد، ناز، امتیاز اور اُس کی بیوی جاگ
 رہے تھے۔ دستک نے سب کو چونکا دیا۔ امتیاز نے دروازہ کھولا اور واپس آکر جیاد کو بتا دیا کہ آ
 گئے ہیں جیاد کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس نے امتیاز سے ہاتھ ملایا مگر کچھ بولا نہیں۔
 ”آپا! ناز نے امتیاز کی بیوی سے بغلیکے ہو کے کہا۔ ”بھول جانا کہ میں آپ سے کبھی ملی
 تھی۔ جیاد کا جاتیں تو میرے مال باپ کو نہ بتانا کہ میں آپ سے ملی تھی۔ اُن کے زخم پھر کھل
 جائیں گے۔“

جیاد نے اچھی کس اور ناز نے سوتے ہوئے بچے کو اٹھایا اور کچھ کمرے بغیر باہر نکل گئے چاندی
 شفاف تھی۔ سمندر کی نمی کی وجہ سے کراچی کی چاندنی بہت سی شفاف مٹا کرتی ہے۔ دروازے کے
 ساتھ ایک آدمی کھڑا تھا جس نے سر پر اس طرح کپڑا ڈال رکھا تھا کہ اُس کا چہرہ بھی دھکا ہوا تھا۔
 ”کون پوچھتی؟“ جیاد نے پوچھا۔

استے میں تین آدمی اسی طرح منہ اور ناک کپڑوں میں چھپاتے ان کی طرف آئے۔ جیاد کے
 کان میں سرگوشی پڑی۔ ”وہ آ رہے ہیں۔ اب نہ پوچھنا میں کون ہوں؟“
 جیاد کچھ چونکا۔ اُس نے پتلون نپا پاجامے کی ناف میں ریلووار اُس رکھا تھا۔ اس میں چھ گولیاں تھیں۔
 اُس نے کچھ گولیاں ایک کپڑے میں باندھ کر کمر کے گرد مقبض کے اندر لپیٹ رکھی تھیں۔ وہ خطرے
 کے مقابلے کے لیے تیار تھا۔ اُس کی کمزوری یہ تھی کہ ناز اور بچے اُس کے ساتھ تھے۔

وہ اب چار آدمیوں کے زخم میں ایسے سینیا لائنز کے عقب میں چٹائی راستے پر جا رہے
 تھے جیاد کو معلوم نہیں تھا کہ اُن کے ساتھ پانچواں آدمی بھی ہے۔ وہ دو بہت کوجار رہا تھا۔ جیاد نے ایک بار
 پھر ان سب سے پوچھا کہ وہ کون ہیں۔

”بے علم ہو کر چلے چلو آؤ۔ اُسے ایک کی آواز سنائی دی۔ ”بندر روڈ تک پیدل چلنا ہوگا۔“
 خاموشی طاری ہو گئی۔ کوآرڈ ایک طرف بہت گئے تھے۔ وہ اب چٹان کے ساتھ ساتھ جا رہے

پر پہنچ گیا تھا۔ جرم اُس کی فطرت کا حصہ بن گیا تھا۔ وہ گھبرا رہا تھا، ڈر رہا تھا۔ اس پر وہ بیجان اور منہ بند
 طاری تھا جو غیر متوقع انقلاب کے وقت باکسی ان بھی صورت حال میں باکسی خطرے کے سامنے جاتے
 وقت مر انسان پر طاری ہوا کرتا ہے۔ مگر ناز باہر نفسیات نہیں تھی۔

”مجھے اپنے بابا کے پاس جانا ہے۔“ اُس نے یوں کہا جیسے مال سے کچھ انجوا بچے کہے کہ
 اُٹی کے پاس جانا ہے کہنے لگا۔ ”وہ مجھے اس بھنور سے نکال لے گا۔۔۔۔۔ ناز اب مجھے اُس کے
 پاس جانے دو۔ آ جاؤں گا۔ اُسی رات سے پہلے آ جاؤں گا۔“

”نہ جاؤ جیاد!۔ ناز نے کہا۔“ نہ جاؤ نہ جانے کیا ہو جائے کل اُسے مل تو آئے ہو۔“
 ”اُسے کہوں گا، بابا! مجھے پیدل کا سبق دیا ہے تو میرے گناہوں کی آگ بھی بجھا دو میں جل رہا ہوں۔“
 اُس نے اچھی کس کو دیکھا جس میں زلیزات اور رقم تھی۔ یہ اُس نے کمرے میں بار کھی تھی۔ وہ آسمان
 اچھی کس تک گیا اور بولا۔ ”میں ناز ایا میری کس کس ہمارے ساتھ نہیں جانے گا۔ یہ ٹوٹ مار کا مال
 یہ سہاگنوں کے زلیزات ہیں۔“

ناز آگے بڑھی جیاد کو کندھوں سے پکڑا اور پیل آواز میں گرج کر بولی۔ ”جیاد! یہوت میں
 بھول جاؤ کون ہے اور کون تھا میں تیرے ساتھ ہوں۔“
 جیاد نے ناز کو دل حیرت سے دیکھا جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ناز نے
 اسے فیصلے کے لمحے میں کچھ دیکھا اب وہ کہیں نہیں جاتے گا۔ اور وہ اُن آدمیوں کا انتظار کرتے
 تھے جو انھیں کراچی سے نکالنے آ رہے تھے۔

وہ چار آدمی تھے چاروں اسپیکٹر چوہدری کے پاس پہنچ چکے تھے۔ چاروں کے پاس ریلووار
 تھے اور چوہدری کے پاس بھی ریلووار تھا۔ وہ وردی میں نہیں تھا۔

”تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوں۔“ اسپیکٹر چوہدری نے انہیں کہا اور ایک کی طرف دیکھ کر کہنے لگا
 ”خادے! تم اُسے اچھی طرح جانتے ہو۔ بانی ہیں اُسے پہچانتے بھی نہیں۔ جیاد کے ساتھ تم ہو
 گے۔ میں سامنے نہیں آؤں گا اور کام تم کرو گے۔ جگہ ایک بار پھر سن لو۔ ایسے سینیا لائنز کے ساتھ
 اچھوٹی چھوٹی چٹانیں ہیں۔ اُسے گورا قبرستان کی طرف نہیں لے جانا۔ ان چٹانوں کی طرف لے جانا
 ہے۔ میں نے اُسے پیغام بھیجا ہے کہ تھوڑی دُور تک پیدل جانا پڑے گا۔ اُسے کہنا کہ جیکب لائنز
 میں سے گزر کر بندر روڈ تک جانا ہے۔ وہاں جیب کھڑی ہوگی۔ جب تم ایسے سینیا لائنز کے پیچھے
 والی چٹانوں میں سے گزرو گے تو ذرا پیچھے ہٹ کر ریلووار نکالنا اور اُسے گولی مار دینا۔ باقی تین آدمی اپنے
 اپنے ریلووار سے ایک ایک گولی ہوا میں چلائیں گے۔ اُس کے ساتھ ایک جوان لڑائی ہوگی، اسے
 اُٹھا کر لے جانا ہوگا۔ وہ کوئی شریف لڑکی نہیں۔ وہ گھر سے بھاگی ہوئی اور جیاد کی خریدی ہوئی ہے تین
 ساڑھے تین سال سے اُس کے پاس ہے۔ وہ شریف ہوئی نہیں سکتی۔ وہ خود بخارے ساتھ چل
 پڑے گی۔۔۔۔۔ اور ان کے ساتھ دو تین سال کا ایک بچہ ہوگا۔ اسے آرام سے گولی مار دینا۔“

”چوہدری صاحب!۔ خادے نے جس کا نام خادیمین تھا کہا۔ ”میں نے آپ سے پہلے
 بھی کہا تھا۔ اب پھر کہتا ہوں آپ کا ساتھ ہونا ضروری نہیں۔ نہ ہی چار آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ہم

تھے۔ پھر وہ چٹان کے اوپر چلے گئے۔ جیلاور ناز کے ساتھ ساتھ جیلاور آدمی چلا جا رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر اُن دو آدمیوں کے ساتھ ہو گیا جو چار پانچ قدم آگے آگے جا رہے تھے۔ انہیں اُس نے سرگوشی میں کہا کہ وہ اور آگے چلے جائیں۔ وہ پھر پیچھے آنے والے آدمی کے ساتھ ہو گیا اور اُسے کہا کہ وہ چٹان کے اوپر چلے، پھر جیلاور کے ساتھ ہو گیا۔ اسپیکر چوہدری چٹان کی دوسری طرف جا رہا تھا۔ اُسے اپنے آپ کو چھپا کر رکھنا تھا۔

اس آدمی نے دیکھا کہ اُس کے ساتھی دور مٹ گئے ہیں تو وہ جیلاور کے ساتھ ہو گیا۔ ”جیلاور! اُس نے سرگوشی کی۔“ میں خاموش ہوں۔۔۔ ہیڈ کانسٹیبل خادم حسین میں نے متنبی خردار کے سامنے پیدا کیا ہے مجھ سے زیادہ باتیں نہ پوچھنا۔ صرف میری سننا تم جان کے خطرے میں لے جاتے جا رہے ہو۔ میں جہاں اشارہ کروں، وہاں سے نکل بھاگنا۔ ہمارے ساتھ اسپیکر خالد چوہدری ہے تم اُسے نہیں دیکھ سکتے مجھے آج شام بتا لیا ہوتا تو میں تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیتا۔ اب تم کمال کر دکھاؤ کہ نکل بھاگو میرے اشارے کا انتظار کرنا۔۔۔ میرے ریلوور سے گولی نکلے گی مگر تمہیں نہیں لگے گی۔“

”یقین آدمی کون ہیں؟ جیلاور نے سرگوشی میں پوچھا۔
”کانسٹیبل ہیں۔“ خادم حسین نے جواب دیا۔ ”میں زیادہ باتیں نہیں کر سکتا۔ انہیں شک ہوگا۔“

جیلاور اسپیکر چوہدری اور ہیڈ کانسٹیبل خادم حسین کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ چوہدری اُس کا دشمن ہے اور خادم حسین اُس کا دوست ہے۔ جیلاور کو یہ بھی معلوم تھا کہ خادم حسین کیوں اُسے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سال ڈیڑھ پہلے کا واقعہ ہے کہ خادم حسین کسی ایسے جرم میں موقع پر پکڑا گیا تھا جو اُس کی سرحد بھی ختم کر سکتا تھا اور اُسے ڈیڑھ دو سال کی سزا بھی دلا سکتا تھا۔ جیلاور کو پتہ چلا کہ اُس نے اپنا ایک آدمی پیش کر کے کہا تھا کہ جرم تو اس آدمی نے کیا تھا اور ہیڈ کانسٹیبل خادم حسین وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس کے علاوہ جیلاور نے ایک وزیر سے کہہ کر خادم حسین کو صاف بچالیا اور اُس کی جگہ اپنے آدمی کو چھ ماہ سزائے قید و لادی تھی۔

خادم حسین جیلاور کا غریب غلام بن گیا۔ اب اُسے موقع ملا تھا کہ جیلاور کو اُس کی اس بچی کا صلہ دے۔

وہ جگہ گئی تھی جہاں خادم حسین کو پیچھے ہٹ کر جیلاور گولی چلائی تھی۔ آگے والے تین آدمی اور آگے چلے گئے اور پیچھے والا آدمی اور زیادہ پیچھے رہ گیا۔ اسپیکر چوہدری دُور دُور جا رہا تھا۔ اُس کے کان گولی کی آواز کے منظر تھے مگر خادم حسین کا ریلوور فائر نہ ہوا۔ چوہدری خادم حسین کو بچا کر نہیں سکتا تھا۔ وہ ادھر جا کر دیکھ سکتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور گولی کیوں نہیں مل رہی۔

آگے چٹانوں کی جھوٹی سی بلندی تھی وہ ختم ہو رہی تھی اور وہ گوارا نہ کرتے تھے جو ایسے سینا لائنز کی طرح فوجی بارکول میں بنائے گئے تھے۔ بارکول میں لمبے لمبے برآمدے تھے۔ وہاں کے رہنے والوں نے اپنے خواروں کے آگے جنت منتر کی باڑیں اُگا رکھی تھیں بعض پودے اتنے اونچے ہو گئے تھے کہ ان کی اوٹ میں دراز قد آدمی چھپ سکتا تھا۔ بارکول کے ساتھ ساتھ چند گرو اچھو چٹانی زمین تھی۔

اسپیکر چوہدری پریشان ہو گیا۔ وہ خادم حسین کو کوئی اشارہ دینے کی سوچنے لگا۔ آخر کچھ کی رات ریلوور کے دھماکے سے لرز اٹھی۔ ہیڈ کانسٹیبل خادم حسین کے ریلوور نے گولی اُگل دی تھی مگر گولی ہوا کو چیرتی جانے لگی۔ اُس کے ساتھ ہی اسپیکر چوہدری کو اُس طرف شور اور بھاگ دُور سی سنائی دینے لگی۔ تین ریلوور بھیگے بعد دیگرے فائر ہوئے۔ زمین کانٹیلبلوں کو سکیم کے مطابق جوا میں فائر لے لے گئے۔

اسپیکر چوہدری ادھر کودا گیا۔ اب اُسے آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ”ادھر دیکھو۔ میں نے اُسے ادھر ہی جاتے دیکھا ہے۔۔۔ جا کہاں سکتا ہے۔ وہ گولی کھا کر کہاں چلا جائے گا۔“ خادم حسین اور اُس کے تین ساتھی ادھر ادھر بھاگ دُور رہے تھے۔ چوہدری نے انہیں بچانا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اُسے خادم حسین کی آواز سنائی دی۔ ”چوہدری صاحب! وہ نکل گیا ہے۔“ چوہدری ادھر کودا۔

”اُسے شک ہو گیا تھا۔“ خادم حسین نے چوہدری کو بتایا۔ ”میں اُسے گولی مارنے کے لیے پیچھے بٹا تو پیچھے ٹھاسا پیچھے تھا۔ اس سے ٹھوکر کھا کر میں پیچھے کے بل گر پڑا۔ انگلی ٹریگر میں تھی۔ ریلوور فائر ہو گیا۔ میں جتنی دیر میں اُٹھا تھا، وہ عورت اور بچے کے ساتھ چٹان کے اندر ہو کر نکل گیا۔“ پیچھے آنے والے کانٹیلبل نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کے بیان کی تصدیق کر دی کہ وہ واقعی پیچھے کو گر پڑا تھا اور اُس کا ریلوور فائر نہ ہوا تھا۔ ان میں سے کسی کو شک تک نہ ہوا کہ ہیڈ کانسٹیبل خادم حسین اُسے گرا تھا۔ گرنے سے پہلے اُس نے جیلاور کو بتا دیا تھا کہ وہ گرسے گا اور جیلاور بھاگ جائے جیلاور سے اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر ریلوور پاس ہے تو نکال لو، پولیس مقابلہ ہوگا۔

اُس وقت جیلاور بارک کے برآمدے میں پہنچ گیا تھا۔ اُس کے لیے ناز اور بچے نے منہ پر ہلا کر کھی تھی۔ ان کے پاس انچی کپس بھی تھا۔ جیلاور نے ریلوور ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اُس نے ناز سے کہنا ہی کہا تھا کہ بھاگو۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ برآمدے میں پہنچ کر ناز نے جیلاور سے پوچھا۔ ”تم بھاگے کیوں تھے اور گولی کس نے چلائی تھی؟“

”دھوکہ ٹھوس ہے ناز۔“ جیلاور نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم نہیں یہ دھوکہ امتیاز نے دیا ہے یا کسی طرح میرے ایک دشمن اسپیکر پولیس کو تیر چل گیا ہے۔ امتیاز نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ اسپیکر خالد مجھے لینے آ رہا ہے۔ وہ بتا دیتا تو میں دھوکے میں نہ آتا۔ اگر میں واپس امتیاز کے کارڈ میں زندہ پہنچ سکا تو اُس کے جس بچے کو اُس سے نکالا تھا، اُسے گولی مار دوں گا۔ مجھے دھوکہ دینے والا کبھی زندہ نہیں رہا۔“ ”کیا تم کبھی اور طرف نہیں نکل سکتے؟“ ناز نے گھبراہٹ میں پوچھا۔ ”واپس جانے کی کوشش نہ کرو۔ تم ایکسٹریٹ ہو تے تو اور بات تھی۔“

”ال، ایک ٹھکانہ ہے۔“ جیلاور نے کہا۔ ”بوڑھے ستار نواز کا گھر یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہیں وہاں تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ عا کر وہ لوگ ہمارے تعاقب سے ہٹ جائیں۔“ وہ لوگ تعاقب سے ہٹنے والے نہیں تھے۔ اسپیکر چوہدری کے کہنے پر وہ کانٹیلبل چلائے گئے۔ ”چور۔۔۔ چور۔۔۔ چور۔۔۔ اور وہ جیلاور کو دھونڈنے لگے۔ چوہدری نے سوچا تھا کہ چور جوتے شو۔

نہم.... جیدے ہمدرد ملالینا۔ کھٹے کی موت نہرو۔
جیداس لگا کر نکلتا آگے بڑھتا گیا۔ اُس نے ناز کو بتایا کہ بابا مسیقار کا گھر دو نہیں۔ پناہ وہیں ملے گی۔ وہ ادھر ادھر دھونڈتا آگے بڑھ رہا تھا کہ قریب کسی نے چپتے کی طرح جبرست لگا کر اُسے پیچھے سے دلو توج لیا۔ جیداکے دونوں بازو جکڑے گئے۔ اُس نے بچے کو بھی اٹھا رکھا تھا۔

"ناز! جیدانے کہا۔" اُس کے سر پر ریلواری مارو۔
ناز اُس کی طرف دڑی۔ وہ آدمی جھنجھول میں رہنے والا تھا۔ وہ ریلواری کا نام نہ سنتے ہی جیداکو چھوڑ کر ایک گلی میں غائب ہو گیا۔ ناز نے اُس کے پیچھے ریلواری فائر کر دیا۔ وہ آدمی تو بچ نکلا مگر گولی کے دھماکے نے ان کی نشاندہی کر دی۔ جیداکے کہنے پر ناز نے اُس کے ساتھ دوڑ پڑی۔ اُس کے ساتھ ہی یہ مشکل پیدا ہو گئی کہ پھر جاگ اٹھا اور رونے لگا۔ جیداس بچے کو بچکا رہنے لگا۔ ناز نے بھی اُس سے پیار کیا لیکن بچہ بستر پر نہیں تھا اور اُس کے اوپر کسی کھجور کی چھت نہیں تھی۔ وہ نہیں اپنے مال باپ بھٹکتا تھا۔ وہ دُٹے جا رہے تھے۔ اُس لیے بچہ ڈر کر اور اونچا رونے لگا۔

ریلواری کی ایک گولی فائر ہوئی جو ناز نے جیداکے قریب سے گزرتی۔ یہ انیسپر چوہدری کے ریلواری کی گولی تھی۔ اُس نے جیدادناڑ کو بچھ لیا تھا۔ وہ دونوں قریب ہی ایک مکان کی اوٹ میں ہو گئے۔ انہیں انیسپر چوہدری کی لگا کر ایک بار پھر سنا دی۔ "جیدے! بازوؤں کی موت نہر سے آج!"

آگے وہ کواڑ آ گئے جن میں سے ایک میں لوڑھتا رٹنا تھا۔ وہ مری نیند سو رہا تھا۔ اُس کے دروازے پر بڑی زور کی دستک ہوئی۔ اُس کی آنکھ کھلی تو دستک اور زیادہ زور سے ہوئی۔ وہ کچھ گھبراہٹ اور کچھ غصے میں اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔

"جیداس! باباجان! جیدانے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ناز اور بچہ ساتھ ہیں۔"
وہ دروازے سے ابھی باہر تھے۔ ایک ریلواری فائر ہوا۔ جیدانے ناز سے کہا کہ اندر ہو جاؤ۔ ناز بھی کی بھرتی سے جیداکے ساتھ اندر ہو گئی۔

"باباجان! جیدانے کہا۔ "دروازہ بند کر دو۔ ہمارے پیچھے پولیس ہے۔... ہم اندر چلے جاؤ۔ باباجان! ہم اندر چلے جاؤ۔"

وہ جب دروازے پر کھڑے تھے، ایک کٹیل نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ دوسری طرف سے انیسپر چوہدری آ گیا تھا۔ جیدابوڑھ کو کچھ بھی نہ بتا سکا کہ دروازہ کچن شروع ہو گیا تھا اور ساتھ یہ لگا کر۔ "دروازہ کھول جیدے! ٹوکل کے نہیں جاسکتا۔"

"انیسپر چوہدری! جیدانے لگا کر جواب دیا۔ "تو مجھے جانتا ہے.... دروازہ نہیں کھلے گا۔ بڑول انسان! بڑوہو کر دے کو آیا ہے۔"

"پاگل مت بن جیدے!
"مجھے بڑوہو کوئی۔ ایس۔ پی نہیں بن سکے گا چوہدری!"

جیدانے روتا ہوا سچا ناز کو دے دیا اور بیڑھیوں پر چڑھتا ہوا ایسی جگہ لیٹ گیا جہاں سے ہمارے فائر کرکٹا تھا۔ اُس نے ریلواری کی نالی نیچے کر کے گولی چلا دی جو کسی کو بھی نہ لگی۔

پرکھاروں میں سے کچھ لوگ باہر آجائیں گے اور وہ کسی ایک کو گولی مار کر کھنکھار گولی جیدانے چلائی ہے تاکہ پولیس مقابلے کا جواز پیدا کیا جاسکے۔ بھڑوہ بھول گیا تھا کہ کواچی میں چورل اور ڈاکو زلوں کی اتنی بھرمار تھی کہ پولیس میں سے چورچور کا شہر اٹھتا تو لوگ گھروں میں دبکے رہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ رات کو چورل کی حکومت ہوتی ہے اور لٹا ہوا کوئی آدمی تھا۔ اُس نے میں رپورٹ درج کرائے جاتا ہے لو اس کے ساتھ وہاں ایسا سلوک ہوتا ہے جیسے اُس کے گھر چوری ہوئی سی نہیں اور اگر ہوئی ہے تو چور وہ خود ہے۔ چوہدری نے بھی سوچا تھا کہ لوگ جاگ اٹھیں گے تو جیداکسی کواڑ میں نہیں چھپ سکے گا مگر اس شور کا فائدہ جیداکو ہوا۔ اُسے تیز چل گیا کہ اُس کا تعاقب کرنے والے کمال میں اور تیزی دور ہیں۔ وہ ناز کو بچنے کے ساتھ برآمدے سے نکلا اور ایک اونچی باڑی اوٹ میں ہو گیا چاندنی اتنی شفاف تھی کہ چاند بھی جیداکاشن ہو گیا۔

باڑی دوسری طرف سے کوئی گزر رہا تھا۔ جیداباڑ کے سامنے میں تھا۔ آدمی کی چال بتا رہی تھی کہ وہ اُسے ڈھونڈ رہا ہے۔ جیدادناڑ دیکھے رہے۔ وہ آدمی ڈاکو آگے جا کر گھوما اور باڑ کے اندر گیا۔ وہ چاندنی میں تھا۔ جیداکو صاف نظر آ گیا کہ اُس آدمی کے ہاتھ میں ریلواری ہے۔ وہ دبے پاؤں بڑی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا جیداک کی طرف گیا۔ جیدابھاگ نہیں سکتا تھا۔ اُس نے ریلواری سیدھا کیا۔ کوئی عیلا وہ نہ کاٹیل تھا۔ وہ ڈاکو اور آہستہ آہستہ اُس کے کھٹنے دھرنے ہوئے لگے۔ اُس کے ہاتھ سے ریلواری گر پڑا۔

جیداس کی طرف دوڑا اور اُس کا ریلواری اٹھا کر ناز کے پاس گیا۔ ریلواری ناز کو دے کر بولا۔ "تم نے ریلواری چلا رکھی نہیں۔ یہ تو جانتی ہو کہ کیسے فائر ہوتا ہے۔ اب ڈرنا اور سوچنا نہیں۔ کوئی بھی سامنے آئے، ریلواری اُس کی طرف کر کے گولی چلا دینا۔"

"میں کسی غفل نہیں کر سکتی گی۔" ناز نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔
"مٹھارے ہاتھوں کوئی بھی قتل نہیں ہوگا۔" جیدانے کہا۔ "جو کوئی سامنے آئے تم کو گولی چلا دینا۔ کوئی ادھر ادھر سے نکل جائے گی اور وہ آدمی بھاگ جائے گا۔"

وہ کٹیل گر چکا تھا۔ جیدانے ناز کو ساتھ لیا اور دونوں دوڑ پڑے۔ بچے کو جیدانے اٹھا لیا تھا۔ اُنہی کیس ناز کے ہاتھ میں تھا۔ انہیں انیسپر چوہدری اور اُس کے آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جن سے جیدان سے فاصلے اور سمت کا اندازہ کر رہا تھا مگر اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے دو دروازے کمال میں اُس کے لیے اوٹ کافی تھی۔ اُس کے کچھ کیل آگئیں جو ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے والوں نے بنائی تھیں۔ جیدانے جھکیوں کے اندر جانا مناسب سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کی گلیاں بہت تنگ ہیں اور درمیان جھکیوں کے بعد مڑ جانی ہیں اور بعض گلیاں جھکیوں میں ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ ان میں پھسل بھی تھی کیونکہ بانی کے نکاس کا کوئی انتظام نہ تھا۔

وہ ان کی اوٹ میں ہو گیا۔ اُسے دور پیچھے سے آواز سنائی دی۔ "چوہدری صاحب! احتیاط۔" گویا ہے۔ یہ مرچا ہے۔ ایک اور آواز آئی۔ "ممت! رکو۔ وہیں نہیں جاسکتا۔"

"جیدے! یہ انیسپر چوہدری کی بڑی ہی بلند لگا رہی تھی۔" جہاں کہیں ہو دیں رک جاؤ۔ میری کوئی۔"

”جیدا! ناز نے اُسے پکار کر کہا۔ ”مجھے کوئی جگر تباہ میں کھڑی کیا کر رہی ہوں۔“
”اندر جو باؤ ناز! جیدا نے کہا۔ ”میں عورت کو نہیں لداؤں گا۔ مگر کیا تو جوسا منے آئے۔“
اُس پر گولی چلا دینا۔

اتنے میں گشت کی پولیس کے چار کاٹیل جن کے ہاں رائفلیں تھیں، ادھر آگئے۔ وہ گولیوں کے دھماکے میں کھڑے تھے۔ اُس پکڑ چوہدری نے دو کو کوارٹر کے کچھ پڑاڑے بھیج دیا اور دو کو ساتھ والے کوارٹر کی دیوار پر چڑھانے لگا۔ خود سامنے والے کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔
تھوڑی دیر بعد عورت محاصرے کی ہو گئی۔ سامنے والے کوارٹر کی منڈیر پر چوہدری اور احمدمیں نے مورچہ باندھ لیا۔ ساتھ والے کوارٹر کی چھت پر دو کاٹیل چڑھ گئے تھے۔ کچھ پڑاڑے بھی کاٹیل تھے جیدا نے آخری بیڑھی پر مورچہ باندھ لیا۔ اُس کے آگے ابھی آڑ تھی۔ اُس نے ریلو اور فائر کیا جس سے اُس کی لٹاندری ہو گئی۔ اُس پر چار پانچ گولیاں آئیں۔
لوڑھا موسیقار تیران و پریشان کمرے میں کھڑا تھا اور ناز اُسے بتا رہی تھی کہ وہ کس طرح اس پھنسے میں آئے ہیں۔ ناز نے سچے کواٹھا رکھا تھا اور اسے سبلا رہی تھی۔ بچہ اپنے اڑک پکار رہا تھا۔

کراچی کی رات گولیوں کے دھماکوں سے لرز رہی تھی۔ جیدا کے مُنہ سے کربناک اداہنگ لگتی۔ ایک گولی اُس کے بائیں کندھے میں لگ گئی تھی کہیں سے وہ نظر آ رہا تھا۔
”چوہدری! جیدا نے بُری ہی بند آواز میں کہا۔ ”آج نہیں بتاؤں گا کہ پولیس مقابلہ کیا ہو تا ہے۔ کل اخباروں میں سچے پولیس مقابلے کی خبر چھپے گی۔ تم ملزم کو دھوکے میں قتل کر کے اسے پولیس مقابلہ کہا کر تے ہو۔“

اُس نے ساتھ والے کوارٹر کی منڈیر پر گولی چلائی۔ ”ماں گیا“ کی آواز سنائی دی اور ایک کاٹیل ٹھٹھا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی جیدا نے اپنی پولیشن بدلی مگر سامنے والے کوارٹر کی منڈیر سے وہ صاف نظر آ گیا۔ ایک گولی آئی جو اُس کی نسیلی سے ذرا نیچے سے اُس کے جسم سے پار ہو گئی جیدا لڑا ہوا گیا مگر منجھل کراٹھ کھڑا ہوا۔ ایک اور گولی آئی جو اُس کے دائیں بازو میں سے گزر گئی۔ بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اُس کے ہاتھ سے ریلو گر پڑا۔ اُسے کچھ آیا مگر اپنے آپ کو سنبھال کر سیڑھیوں اترنے لگا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اُس کے جسم سے تین گولیاں پار ہو چکی تھیں۔

وہ صحن میں پہنچا تو کراٹھ ناز نے کمرے میں سے اُسے دیکھ لیا۔ وہ دوڑی آئی۔ اُس نے روتے ہوئے بچے کو اٹھا رکھا تھا۔ وہ جیدا کے قریب بیٹھ گئی اور اُسے بلایا۔

”ناؤ! اُس نے ناز کے منہ پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ”معاف کر دینا تمہاری حفاظت نہ کر سکا۔“
ناز نے چاندنی میں جیدا کو خون میں نہایا ہوا دیکھا تو پھر کراٹھی اُس کے ایک بازو میں کچھ تھامے اُس نے سینے سے لگا لکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ریلو اور تھا۔ اُس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اُسے سامنے والے کوارٹر کی منڈیر پر لپکڑ چوہدری نظر آ گیا۔ چوہدری نے دیکھ لیا تھا کہ جیدا صحن میں کراٹھا ہے، اس لیے وہ کوئی خطرہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ناز نے ریلو اور سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ چوہدری منڈیر سے پیچھے اڑا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ والے کوارٹر کی منڈیر سے دو دھماکے ہوئے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا ایک گولی بچے کی پیشانی میں لگی۔ دوسری ناز کے سینے میں داخل ہو گئی۔ وہ غریب لکین اُس نے سچے کواپنے بازو میں جھلے رکھا۔

لوڑھے موسیقار نے دیکھا تو اُس نے رکھ سے اور صحن کے لب حلا دیتے اور صحن میں آکر مڈ آواز سے بولا۔
”بچو! بیڑیاں مچا کر چلیں۔ آج باؤ۔ اور وہ جیدا اور ناز کے پاس بیٹھ کر پچھیاں لینے لگا۔ دروازے پر تنک ٹوٹی تو اُس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سب سے پہلے ہیڈ کاٹیل خادم صحن اندر آیا اور دو کوا جیدا کے پاس آکر بیٹھا۔
”قسم لے لو دوست! اُس نے جیدا سے کہا۔ ”میں نے سب گولیاں ہوا میں چلائی تھیں۔ جیدا مسکرایا۔ کاٹیل جو بچ گئے تھے اندر آگئے جیدا نے ناز کا اپنے قریب ہٹے دیکھا تو اٹھ بیٹھا۔ اُس نے ناز کا ہاتھ پکڑ لیا اور سر کیا۔ اُس نے دیکھا کہ گولی ناز کے سینے میں اور بچے کی پیشانی میں لگی ہے۔
”باد بے تئیں ناز! اُس نے کہا۔ ”تم نے میرے کمرے میں ماں اور بچے کی تصویر لگا رکھی تھی اور میں نے ایک دن تصویر پر دو گولیاں چلائی تھیں۔ ایک گولی ماں کے سینے میں اور دوسری بچے کی پیشانی میں لگی تھی۔ تم نے وہ تصویر وہیں لگی رہنے دی تھی۔ میں یہ تصویر اس دنیا سے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اب ہم آزاد ہیں۔ ہمارے دھم ختم ہو گئے ہیں۔“

بچہ مچکا تھا۔ ناز کی آنکھیں بند ہوئے تھیں۔ اُس نے جیدا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اُس نے آخری بچگی لی۔ اُس کے مردہ ہاتھ کی حرکت جیدا کے ہاتھ پر اور زیادہ سخت ہو گئی۔ جیدا نے لوڑھے موسیقار کی طرف دیکھا، پھر اپنے گرد کھڑے پولیس کے آدمیوں کو دیکھا۔

”میں جا رہا ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”کل ایک اور جیدا میری جگہ لے لے گا۔ میں خوش ہوں کہ اپنے گناہوں کی سزا پائی ہے۔ مجھے سزائے موت ملنی چاہیے تھی۔ میں نے اسی طرح انسانوں کا خون بہایا تھا۔“
اُس کی آواز لکھنے لگی۔ اُس نے لوڑھے موسیقار کی طرف دیکھا مگر یہ لوڑھا چوہدری دھندلا گیا۔

خاموش فضا میں ایک متر متر صدا تیرنے لگی۔ ”اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔“ جیدا نے آہستہ آہستہ گردن گھمائی جیسے اس مقدس صدا کو ڈھونڈ رہا ہو۔ وہ ایک طرف لڑکھٹنے لگا۔ لوڑھے موسیقار نے اُسے اپنے بازو میں ختم کیا اور گرنے نہ دیا۔ تانپورے کی مٹی مٹی گونج کی طرح جب جیدا کے کانوں میں یہ آواز ڈی۔
”الصلوۃ والسلام“ اُس کا سر ڈھک گیا اور وہ نیند سے جگانے والی مقدس اور متر متر صدا پر ابدی نیند سو گیا۔ سینے میں دھول کا زہر اور پیار کا تریاق اور پولیس کی تین گولیاں لیے!

~~~~~